مضامین الندوہ۔ لکھنؤ

(۱۰-۱۹۰۵ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری

مضامین الندوہ۔ لکھنؤ

(۱۹۰۵ـ۱۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(ڈائریکٹر، ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان۔ کراچی)

پورب اکادمی، اسلام آباد

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول — نومبر 2007ء
ناشر — پورب اکادمی، اسلام آباد
فون نمبر — 051 - 538 29 67, 0301 - 559 55 610
ای میل — info@poorab.com.pk
ویب سائٹ — www.poorab.com.pk

Mazameen Al-Nadwa - Lucknow
by: Dr. Abu-Salman Shahjahanpuri
Published by: Poorab Academy, Islamabad Pakistan
ISBN 969-8997-44-6

۲۹۵.۰۳
ندوہ [illegible]
مضامین الندوہ لکھنؤ / مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری
اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء
ص ۲۹۷

[illegible] کے جملہ حقوق [illegible]
[illegible] بحق [illegible] ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

باسمہ

میں اپنی یہ تالیف

مولانا ابوالکلام آزاد

کے مخلصین ومحبین اور مصنفین

محمد عبدالشاہد خاں شروانی (علی گڑھ)

محمد یونس خالدی (لکھنؤ)

عبداللطیف اعظمی (دہلی)

کے نام معنون کرتا ہوں

جن کی تحریرات سے میں نے بیش از بیش استفادہ کیا،

جن کی تنقیدات سے مجھ میں لکھنے کا سلیقہ آیا اور

جن کی ہمت افزائی سے حوصلہ پیدا ہوا!

اگر مجھ سے کوئی مفید کام انجام پایا ہے تو اس میں ان بزرگ دوستوں کا بہت حصہ ہے

اللہ تعالیٰ ان کے مراتب کو بلند فرمائے

ابوسلمان

فہرست

پیش لفظ — مرتب — ۷

حرف اوّل — پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی — ۲۰

مقدمہ — ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری — ۲۶

۱۔ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد — ۳۱

تعارف و تعلقات کا ابتدائی دور!

۲۔ الندوہ اور ابوالکلام — ۴۴

۳۔ الندوہ اور مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی — افادات علامہ سید سلیمان ندوی — ۶۱

۴۔ ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالکلام آزاد — ۶۴

۵۔ ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالکلام — افادات مولانا سید ابوالحسن علی ندوی — ۸۸

۶۔ الہلال کا لب و لہجہ اور علامہ شبلی — ۱۰۲

۷۔ تحریک تالیف سیرت النبی اور مولانا آزاد — ۱۰۷

۸۔ علامہ شبلی کی رحلت اور مولانا ابوالکلام آزاد — ۱۱۶

۹۔ مرحوم علامہ شبلی۔ حیات علمی اور ادبی پر ایک سرسری نظر! — ۱۲۱

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تقریر — ۱۲۳

۱۰۔ ابوالکلام اور علامہ شبلی۔ آخری دور — ۱۲۹

مضامین الندوہ (۱۹۰۵ـ۱۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

۱۔ المرأۃ المسلمہ (۱) ۱۵۱
المرأۃ المسلمہ (۲) ۱۶۹
المرأۃ المسلمہ (۳) ۱۹۱
۲۔ علمی خبریں (۱) ۲۱۳
علمی خبریں (۲) ۲۱۸
علمی خبریں (۳) ۲۲۳
۳۔ ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت ۲۲۵
۴۔ التصوف فی الاسلام ۲۳۱
۵۔ یورپ میں گونگوں کی تعلیم ۲۴۱
۶۔ مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی ۲۵۳
۷۔ ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود ۲۶۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

کسی علمی شخصیت اور اس کے افکار کے بارے میں ہم کوئی حتمی بات کیوں کر کہہ سکتے ہیں جب تک اس کے آثار تک ہماری رسائی نہ ہو جائے! یہ بات مولانا غلام رسول مہر (ف ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) نے کہی تھی یا خواجہ عبد الوحید (ف ۲۸ دسمبر ۱۹۷۹ء) علیہما الرحمہ نے کہی تھی، یہ مجھے یاد نہیں۔ میرے ذوق کی تربیت میں دونوں بزرگوں کا بہت قریب کا حصہ ہے، میرے ساتھ دونوں کا نہایت شفقت کا برتاؤ تھا۔ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، اس لیے مولانا ابوالکلام آزاد پر آغاز کار ہی سے مولانا کے آثار علمیہ و ادبیہ کی جستجو اور ان کی تالیف و تدوین اور اشاعت کا مقصد میرے سامنے رہا۔ اگرچہ میں نے مولانا ابوالکلام پر مختلف نوعیت کے کام کیے اور پچاسوں مضامین لکھے، لیکن ببلیوگرافیکل کاموں کا پلہ بھاری رہا۔

اس کے باوجود کہ اس قسم کے کاموں کی اہمیت میرے دل پر آغاز کار ہی میں نقش ہو گئی تھی، لیکن کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت، سوانح، آثار علمیہ کے تعارف، افکار و خدمات کے تذکرے میں ایک ضخیم کتاب تالیف کروں اور اس سلسلے میں میں نے شروع ہی میں ایک منصوبہ بنایا تھا اور اس سلسلے کی ایک کتاب "امام الہند ..... تعمیر افکار" لکھی تھی اور شائع بھی ہوئی تھی۔ لیکن خود اندازہ ہوا کہ اس میدان میں وقت سے پہلے قدم رکھ رہا ہوں، اس خیال کو محترم مشفق خواجہ صاحب نے اور پختہ کر دیا۔ انھوں نے کہا، آپ مولانا پر کتاب ضرور لکھیے لیکن فی الحال معلومات جمع کیجیے، پڑھیے۔ پختہ فکری اور وسعت نظر پیدا کیجیے، جذبات سے بلند ہوئیے۔ عقیدت کے سحر سے نکلیے، تنگ نظری دور کیجیے۔ مولانا پر لکھنے کا وہی وقت مناسب ہوگا جب آپ ان کاموں سے فارغ ہو جائیں گے! میں نے کہا، آپ کی سب باتیں درست لیکن میں جذباتی، عقیدت میں محصور اور تنگ نظر تو نہیں! بولے، "آپ جذباتی ہیں، آپ بسم اللہ کے گنبد میں بند

ہیں۔ ابوالکلام کے علم و فکر کے قدر آشنا نہیں، صرف عقیدت کے سحر زدہ ہیں۔ آپ کی یہ خصوصیات علمی زندگی کے منافی ہیں! میں نے دریافت کیا، آخر ان جذباتیت اور سحر زدگی کا کوئی ثبوت بھی ہے؟ بولے، یہ "امام الہند" کیا ہے؟ کتاب کا یہ نام کیوں؟ پاکستان میں آپ انھیں "امام الہند" منوانا چاہتے ہیں۔ لوگ خدا اور رسول کو نہیں مانتے۔ آپ ابوالکلام کو "امام الہند" کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ یہ تنگ نظری ہی نہیں حماقت بھی ہے۔ یہ جناح و اقبال کا ملک ہے، یہاں کوئی شیخ الاسلام، امام الہند، امام انقلاب کی حیثیت سے سرسبز نہیں ہو سکے گا۔ اگر آپ کے عبیداللہ سندھی، حسین احمد مدنی، ابوالکلام علم و فکر اور سیرت و خدمات سے اپنے حریفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو آپ کے بخشے ہوئے خطابات ان کی شخصیت کی عظمت کو منوا نہیں سکیں گے۔ دنیا نے ہر دور میں صرف علم و سیرت کے سامنے سر جھکایا ہے، انسان کے بخشے ہوئے خطابوں کے سامنے نہیں! میں نے کہا، لیکن خواجہ صاحب کتاب کا یہ نام تو آپ کا پسندیدہ تھا، آپ کے مشورے سے رکھا گیا تھا اور اس کتاب کو آپ ہی نے چھاپا تھا، پھر اب کیا ہو گیا؟ ارے مولانا صاحب! میں اس سے کب انکار کرتا ہوں۔ اس وقت میں بھی آپ کی حماقت میں شریک تھا، لیکن اب نہیں! اور آپ کے لیے بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ بسم اللہ کے گنبد میں بند رہیں! اور پھر میں بھی اس گنبد سے نکل آیا۔ خواجہ صاحب نے مجھے یقین دلایا کہ ببلیوگرافیکل قسم کے کام اپنی اہمیت رکھتے ہیں، انھیں کم تر نہ سمجھیے۔

حالی نے چالیس سال کے مطالعے، مشاہدے، سر سیّد کی صحبت اور دور و نزدیک کے تجربات اور غور و فکر کے بعد "حیات جاوید" اسم بامسمّیٰ تالیف کی تھی اور سلیمان ندوی نے اگرچہ حالی کی نقل میں "حیاتِ شبلی" لکھی تھی، لیکن سیّد صاحب کو شبلی کا جو قرب حاصل تھا، درس و تدریس کی مجلسوں سے لے کر سفر و حضر تک معیتیں اور صحبتیں نصیب ہوئی تھیں، انھیں ان کی نگرانی میں علمی کاموں کی جو تربیت ملی تھی، شخصیت کو سمجھنے اور ان کی تصنیفات سے، مصنف کی زندگی میں استفادے کے جو مواقع انھیں میسر آئے تھے اور شبلی کے تلامذہ اور معاصر اہل علم و قلم میں انھیں جو امتیاز حاصل ہوا تھا وہ آپ کو ابوالکلام، مولانا مدنی، مولانا سندھی وغیرہ کے باب میں کیوں کر میسر آ سکتا ہے۔ آپ کو ان بزرگوں کے قرب و صحبت سے فیض یاب ہونے کی سعادت میسر نہیں آئی، ان کے آثار علمیہ تک رسائی کے لیے تو ایک عمر چاہیے اور ان کے مآخذ تک پہنچنے کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں! ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ آپ مولانا پر کتاب لکھیں گے، اس کی اہمیت ہوگی اور شائقین اس کی

پذیرائی کریں گے۔ خواجہ صاحب مرحوم سے اس گفتگو نے میرے خیال کو اور پختہ کر دیا اور اس سلسلے میں میں نے کئی کام انجام دیے، ان پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے:

۱۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد: سب سے پہلے میں نے مکاتیب کی فراہمی سے کام کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۶ء تک ۳۳ حضرات کے نام ۱۶۸ مکاتیب ایسے حاصل ہو گئے تھے جو غبار خاطر، کاروانِ خیال، نقش آزاد، تبرکاتِ آزاد، ملفوظات آزاد اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خطوط و جوابات آزاد میں شامل نہیں تھے۔ بعض بزرگوں کو ان مکاتیب کی فراہمی اور ان کی اس خصوصیت کا علم ہوا تو ان کے مشورے کے مطابق انھیں مجموعے کی صورت میں مرتب کر دیا۔ ۱۹۶۸ء میں اسے اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے شائع کیا۔

۲۔ افاداتِ آزاد: میں نے اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ مزید خطوط کی تلاش کی مہم جاری رکھی۔ اس زمانے میں مولانا آزاد کے پرائیویٹ سیکریٹری محمد اجمل خان نے دہلی سے ''ملفوظات آزاد'' اور ''مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خطوط و جوابات آزاد'' کے نام سے دو مجموعے شائع کرائے۔ ان دونوں مجموعوں میں مولانا کے وہ تحریری یا زبانی جوابات تھے جو مولانا نے مذہبی، تاریخی، یا ادبی سوالات کے سلسلے میں دیے تھے اور اجمل خان صاحب نے اپنی ڈائری میں محفوظ کر کے مستفسرین کو جواب بھیج دیے تھے۔ ان مجموعوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں مستفسرین کے خطوط کے ساتھ ان کے پتے بھی تھے۔ میں نے ان پتوں پر خطوط لکھے اور اچھی خاصی تعداد میں مزید خطوط حاصل کر لیے اور ان دونوں کتابوں کے خطوط و جوابات کا ''افاداتِ آزاد'' کے نام سے ایک نیا مجموعہ مرتب کر لیا۔ اجمل خان صاحب اس وقت حیات تھے، ان سے اس پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی، آں مرحوم نے کرم فرمایا۔ میں نے ان کے مقدمے کے ساتھ یہ مجموعہ شائع کر دیا۔ ابھی چند ہی دن پہلے اس کا تیسرا ایڈیشن ترتیب و تدوین کے نئے قالب میں ڈھل کر متعدد اضافوں، تصحیح اور دیگر اہتمام کے ساتھ پورب اکادمی، اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔

۳۔ ابوالکلام آزاد (آثار و افکار): ۱۹۸۸ء میں مجھے ہندوستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ دہلی میں محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار سے ملاقات ہوئی۔ آں موصوف نے ازراہِ کرم ایک مختصر لیکن نہایت اہم مکاتیب کا مجموعہ عنایت فرمایا۔ یہ ۱۹۱۲ء سے جنوری ۱۹۴۰ء تک محمد ابراہیم ذکریا بھاگلپوری کے نام مولانا کے تیس یادگار خطوط تھے۔ خاکسار نے یہ مجموعہ ۱۹۹۰ء میں ''مطبوعات

آزاد صدی" کے سلسلے میں آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان کے زیر اہتمام بائیسویں مطبوعہ کی صورت میں شائع کیا تھا۔ ہندوستان میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے جرنل میں یہ خطوط بعد میں شائع ہوئے۔

۳۔ آثار و نقوش: یہ مولانا آزاد کے خطوط، فائلوں پر نوٹس، ہدایات وغیرہ پر مشتمل حضرت مولانا آزاد کی یادگار تحریرات کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ دو حصوں اور چند ضمیموں پر مشتمل ہے۔ آثار کے عنوان سے نیشنل آرکائیوز (نئی دہلی) میں محفوظ مولانا کی ۲۱۴ تحریرات ہیں۔ یہ تحریرات "آثار آزاد" کے عنوان سے آرکائیوز کے محترم ڈائرکٹر ڈاکٹر راجیش کمار پرتی نے شائع کر دی تھیں۔ لیکن یہ مجموعہ جلد ہی نایاب ہو گیا اور بیرونِ ہند کے شائقین تو درکنار بہت سے ہندوستان کے اہلِ ذوق بھی اس کے مطالعے سے فیض یاب نہ ہو سکے۔ اس کا پہلا حصہ وہی ہے جو دہلی سے "آثارِ آزاد" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، کراچی نے خاکسار کی ترتیب جدید و تدوین میں اسے شائع کیا تھا۔ اس کے دوسرے حصے "نقوش" میں مولانا آزاد کی سترہ ہدایات و احکام ہیں جو انھوں نے انڈین کونسل برائے ثقافتی تعلقات (آئی سی سی آر) کے مختلف فائلوں میں تحریر فرمائے تھے۔ اس کے علاوہ اس قسم کی متعدد تحریرات، "آج کل" یا "ایوانِ اردو" دہلی کے آزاد نمبروں میں یا کسی اور جگہ شائع ہوئی تھیں، خاکسار نے مرتب کر دی ہیں۔ حصہ سوم میں مسلم ویلفیئر بل اور اس پر مولانا کی رائے، کانگریس کے اجلاس مدراس (۱۹۵۵ء) میں مولانا کی ایک اہم تقریر اور ڈاکٹر کاٹجو، بھیم سین سچر اور پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مولانا آزاد کے نادر اور نہایت بیش قیمت خطوط ہیں اور شروع میں خاکسار کے قلم سے اس مجموعے کی اہمیت اور مولانا آزاد کی شخصیت اور سیرت کے مطالعے میں ان تحریرات کی افادیت کے بیان میں ایک مفصل تحریر بطور مقدمہ ہے۔

یہ چند وہ چیزیں تھیں جو دستیاب ہوئیں اور ان کی اہمیت اور افادیت کے نقطۂ نظر سے مرتب کر کے شائع بھی کر دیں۔ لیکن مولانا کے آثار و نقوش کی جستجو کا سب سے بڑا ذخیرہ مولانا کے وہ خطوط ہیں جو کئی سو حضرات کے نام ہزاروں خطوط کی شکل میں موجود ہے۔ یہ تمام غیر مرتب اور منتشر خطوط ہیں جو اخباروں، رسالوں، کتابوں سے اخذ کیے، جہاں وہ چھپے ہوئے تھے یا بعض اشخاص سے حاصل ہوئے ہیں۔ یہ ایک اندازے کے مطابق کم از کم دو ہزار صفحات کے کئی مجموعوں

میں شائع ہوں گے۔ ان مجموعوں میں غبار خاطر، نقش آزاد وغیرہ کے خطوط شامل نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے کا پہلا حصہ جس میں ۳۴ حضرات کے نام ۱۹۲۱ء تک کے تقریباً ۳ سو خطوط ہیں، خدا نے چاہا تو آئندہ چند ماہ میں شائع ہو جائے گا۔

خطوط کی جدید ترتیب میں میرے مرتبہ پہلے مجموعہ "مکاتیب ابوالکلام آزاد" کے مکاتیب بھی تاریخی ترتیب سے شامل ہو جائیں گے۔

۵۔ ارمغان آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد کے ابتدائی دور کے متفرق مضامین اور ان کے کلام پر مشتمل ایک مجموعہ ۱۹۷۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت بعض مضامین اور مزید دستیاب کلام کے اضافے کے ساتھ ۱۹۹۰ء میں عمل میں آئی۔

۶۔ دیوان ابوالکلام آزاد: اسی زمانے میں "ارمغان آزاد" کا حصہ نظم اس سے الگ کر کے "دیوان ابوالکلام آزاد" کے عنوان سے ادارۂ تحقیقاتِ اردو، پٹنہ (بہار) سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد نے اپنے نام سے چھپوا لیا۔ افسوس کہ انھوں نے اس کی نئی کتابت کروانے، اس میں کتابت کی غلطیاں درست کروانے اور کچھ نیا کلام جو اس وقت تک دستیاب ہو چکا تھا، شامل کر لینے کی زحمت اٹھانی بھی گوارا نہیں فرمائی۔ ارمغان میں مطبوعہ کلام کا عکس چھاپ دینا اور ایک صفحے پر "ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے شکریے کے ساتھ" لکھ دینا کافی سمجھا۔ میرے لیے اس شکایت میں بھی یہ خوشی کا پہلو تھا کہ جہاں تک "ارمغانِ آزاد" کے ذریعے حضرت ممدوح مولانا آزاد کا نام نہیں پہنچ سکا تھا، وہاں بھی مرحوم کے نام کا ڈنکا بج گیا۔

۷۔ کلیات آزاد: پہلے مولانا کا کلام "ارمغان آزاد" کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۹۷ء میں ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کی جانب سے تمام کلام، ارمغان سے الگ کر کے "کلیاتِ آزاد" کے نام سے چھاپ دیا گیا۔ لیکن اس دوران مولانا آزاد کا جو مزید کلام دستیاب ہو گیا تھا، کلیات میں اسے بھی شامل کر لیا، نیز کلیات میں حوالے کی، کتابت کی یا دیگر جو غلطیاں واقع ہو گئی تھیں، انھیں بھی درست کر دیا گیا۔

۸۔ لسان الصدق، کلکتہ (۱۹۰۳ـ۵ء): ببلیوگرافیکل نوعیت کا ایک مزید اور نہایت اہم کام مولانا آزاد کے مشہور رسالے لسان الصدق کی عکسی اشاعت ہے۔ اس کی اس سے زیادہ کیا تعریف کی جائے کہ جو صاحب ذوق لسان الصدق کی ترتیب و تدوین، کتابت و طباعت

کے انداز کو اس کی اولین شکل میں مطالعہ کرنا چاہیں اور کسی محقق و نقاد کی تحریر اور تنقید و تبصرہ سے استفادے کے بغیر اپنے مشاہدہ و مطالعہ ہی پر اپنی رائے قائم کرنا چاہیں، ان کے لیے لسان الصدق کا زیر نظر عکسی ایڈیشن کفایت کرتا ہے۔

۹۔ پیغام۔ کلکتہ (۱۹۲۱ء): خاکسار نے پیغام کا عکسی ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں ”مطبوعات آزاد صدی“ کے سلسلے میں ”آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان“ کے زیر اہتمام شائع کیا تھا اور پاکستان میں اشاعت کے بعد اس کی پریس کاپیاں خدا بخش لائبریری، پٹنہ کو بھیج دی تھیں۔ جسے اس وقت کے ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ایک نہایت قیمتی تحریر کے اضافے کے ساتھ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

۱۰۔ صحافت مولانا کی زندگی کا بہت اہم شعبہ تھا۔ اس میدان میں مصنفین اور محققین کی رہنمائی کے لیے ضروری تھا کہ مولانا کی صحافتی زندگی کا ایک ایسا خاکہ مرتب کر دیا جاتا جس میں مولانا کا جن اخبارات و رسائل سے تعلق تھا، ان کی تاریخی ترتیب، ان کی فنی نوعیت، ان کے اجرا کے زمانے، اس کی انتظامی حالت اور اس سے مولانا کے تعلق اور خدمات کے بارے میں مستند ترین معلومات موجود ہوں تاکہ ریسرچ اسکالرز کے قدم ٹھوکر کھانے سے محفوظ ہو جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کی تالیف میں میرے پیش نظر یہی مقصد تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری سمجھا کہ وہ رسائل جو نایاب ہیں یا بآسانی دستیاب نہیں ہو سکتے اور ہر شائق کی دسترس سے باہر ہیں، ان کے مضامین تک اسکالرز کی رہنمائی کر دی جائے۔ ان تک رسائی حاصل کرنا بہر حال اسکالرز کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں لسان الصدق (۵۔۱۹۰۳ء)، البلاغ (۱۶۔۱۹۱۵ء)، پیغام (۱۹۲۱ء)، الجامعہ (۲۴۔۱۹۲۳ء) اور الہلال (۱۹۲۷ء) کے انڈکس مرتب کر دیے ہیں۔ یہ تمام رسائل و جراید کلکتہ سے جاری ہوئے تھے۔ اس میں الندوہ (لکھنؤ) کا تعارف اور اس میں مولانا کے مضامین کی فہرست بھی شامل ہے، اب الندوہ تو زیر نظر کتاب ہی کا موضوع ہے۔ الجامعہ عربی کا رسالہ تھا۔ اس کے ضابطے کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی تھے اور مولانا ابوالکلام اس کے نگراں اور سرپرست تھے۔ آجکل دہلی کے آزاد نمبر ۱۹۸۸ء میں الجامعہ پر خاکسار کا ایک مفصل مضمون ہے، اور ”ابوالکلام آزاد کی صحافت“ میں اس کا ضروری تعارف اور مکمل انڈکس ہے۔ مولانا ابوالکلام کی صحافت کی زبان، اسلوب اور فن کے بارے میں

کسی شخص کی کچھ بھی رائے ہو لیکن معلومات کے بارے میں کوئی اسکالر اس کتاب کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ الا یہ کہ ہر رسالہ اس کی دست رس میں ہو اور مولانا کی صحافت کے مطالعے اور اس پر غور وفکر میں اس نے کم از کم چند سال بسر کیے ہوں۔

ان ابتدائی مضامین وکلام کے مجموعوں، ارمغان آزاد، کلیات آزاد، لسان الصدق، پیغام، افادات آزاد، آثار ونقوش، آثار وافکار، مکاتیب اور ''ابوالکلام آزاد کی صحافت'' کی اشاعت کے بعد مجھے امید ہے کہ اب کوئی صاحب علم وقلم مفروضات اور قیاسات پر اپنی تحقیق ورائے کی بنیاد نہیں رکھ سکتا۔

۱۱۔ اس سلسلے میں ایک بہت بڑا کام مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبات، تقاریر، بیانات، پیغامات اور دیگر اہل علم کی تالیفات وتصنیفات پر مولانا کے قلم سے تعارف، پیش لفظ، دیباچے یا آرا ہیں جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ کئی کتابیں بن جائیں گی۔

ابوالکلامیات کے سلسلے میں میں نے چند ایسی کتابیں بھی ترتیب دیں اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا جن کے بارے میں میرا خیال ہے کہ ان کے مضمون نگاروں سے اچھے لکھنے والے موجودہ دور میں ڈھونڈے سے نہ ملیں گے۔ خالص ابوالکلام کے حوالے سے ان کے افادات کو مرتب کردینا یقیناً خدمت شمار ہوگی۔ اس سلسلے میں اردو اور انگریزی میں دو کتابیں وہ ہیں جو مولانا آزاد کے ایک عقیدت مند عبداللہ بٹ مرحوم نے مرتب کی تھیں اور ۱۹۴۳ء میں

۱۔ ''ابوالکلام آزاد'' اور

۲۔ ''آسپکٹس آف ابوالکلام آزاد''

کے ناموں سے شائع کی تھیں۔

اس سلسلے میں ایک کتاب خاکسار نے ''مولانا ابوالکلام آزاد...... ایک شخصیت ایک مطالعہ'' کے نام سے ۱۹۶۷ء میں مرتب کی اور پہلے سندھ ساگر اکادمی، لاہور نے، اس کے بعد پروگریسو بکس، لاہور نے شائع کی تھی۔ ایک اور کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد..... ایک مطالعہ'' مرتب کی اور مکتبہ اسلوب، کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ ان تمام مجموعوں میں لکھنے والے بھی مولانا آزاد کے معاصرین، ان کے دوست، قریبی تعلق رکھنے والے حضرات ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب ان حضرات سے اچھے لکھنے والے نہیں مل سکتے۔ جس طرح ابوالکلام کو سمجھنے اور ان پر لکھنے کے لیے

ریسرچ اسکالرز کو مولانا کی ابتدائی تحریرات کی ضرورت ہوگی اسی طرح مولانا آزاد کے بارے میں موجود دور کے اصحاب علم وقلم کو رائے قائم کرنے سے پہلے مولانا کے معاصرین اور بہت قریبی تعلق رکھنے والے اہل قلم کے افادات سے استفادہ لازم قرار دے لینا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں ان کی زندگی کے علمی، ادبی اور مذہبی آثار فراہم کرنے اور ان کی زندگی میں ان کے معاصرین کی تحریروں کو جمع کرنے کا جو عزم خاکسار نے کیا تھا اور جستجو کی جس راہ میں قدم اٹھایا تھا، اس راہ میں اب تک کسی مقام پر میرے قدم رک نہیں سکے۔ میں نے قریبی دور کے بعض اہل قلم اور علم واخلاص کا تعلق رکھنے والوں کی تحریروں کو ترتیب دینا بھی ابوالکلام پر تحقیق کی راہ کی ضرورت سمجھا۔ اس سلسلے میں دو کتابیں ''اردو کا ادیب اعظم'' اور ''ابوالکلام وعبدالماجد ...... ایک ادبی معرکہ'' مرتب کیں۔ ان کا تعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے افادات ورشحاتِ قلم سے ہے، ایک کتاب مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی ابوالکلام آزاد کے متعلق تحریروں، تبصروں، شذروں، یادداشتوں اور تقریروں کا مجموعہ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی کا نام میرے دل سے فراموش نہیں ہوسکتا۔ مولانا آزاد سے ان کی عقیدت میرے لیے ایک مثال تھی۔ ان کے مطالعے اور مشاہدے کا حاصل اور مولانا کے بارے میں ان کے تاثرات وافادات کے مجموعے، ''مولانا ابوالکلام آزاد ..... ایک شخصی مطالعہ'' کی اشاعت بھی میرے پیشِ نظر مقصد کی ایک ضرورت تھی۔

میرے ذوق کی تربیت میں جن بزرگوں کا خاص حصہ ہے، ان میں مولانا غلام رسول مہر، آغا شورش کاشمیری اور پروفیسر ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، مرحوم مشفق خواجہ کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں۔ مولانا مہر کی حیثیت میرے لیے پیر ومرشد اور خضرِ راہ کی تھی، انھوں نے پاکستان میں مولانا آزاد کے مطالعے کا جواز پیدا کیا۔ شورش کاشمیری نے مولانا آزاد کی عبقریت کا ڈنکا بجایا اور ان کے مطالعے کی تحریک پیدا کی۔ میں نے اس کے متفرق و منتشر مضامین کے مجموعہ ''ہندوستان میں ابن تیمیہ'' کی ترتیب واشاعت سے اپنی عقیدت کا اظہار ہی نہیں کیا، بلکہ تحقیق کی ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ محترم ڈاکٹر شروانی کی حیثیت میرے لیے استاد کی سی ہے، میں نے ان کی تحقیق، ان کی رائے، ان کے افادات وتحریرات سے ہمیشہ استفادہ کیا۔ کبھی کسی بات میں ان سے آگے نکلنے کا خیال دل میں نہیں آیا۔ حضرت موصوف نے میری رہنمائی کی، میرے اغلاط

پر مجھے ٹوکا، ہمت افزائی کی اور میرے کاموں کو سراہا۔ ان کے مقالات و مضامین کے مجموعے، ”میر کارواں مولانا ابوالکلام آزاد“ کی ترتیب و اشاعت سے اپنے لیے اور دوسرے محققین و مصنفین کے لیے رہنمائی کا سروسامان کیا ہے۔ وہ میرے محسن ہیں۔ ابوالکلامیات میں میرا درجہ اگر ان کے شاگرد اور خوشہ چین کا تسلیم کرلیا جائے تو یہ میرا بڑا اعزاز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سر پر قائم رکھے۔

ابوالکلامیات کے باب میں جن کاموں کو میں نے اوّلیات کے درجے میں رکھا تھا، اس کے اوّلین کاموں میں الندوہ، لکھنؤ میں مولانا آزاد کی تحریروں کی ترتیب و تدوین تھی۔ اگرچہ اس کام کی باری بہت دیر میں آرہی ہے۔ الندوہ سے تعلق کا زمانہ مولانا کے علمی سفر کی درمیانی منزل تھی اور ارتقائے علم و فکر کا درمیانی عہد! وہ ابھی حصول علم و تجربہ کی منزل میں تھے۔ ان کے علمی عروج کا زمانہ بعد میں آیا۔ اگرچہ وہ مقام اس وقت سے زیادہ دور نہیں تھا۔

آیندہ چند برسوں میں وکیل امرتسر کی ادارت کے تجربے کے بعد وہ زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گئے تھے جہاں سے ان کی علمی زندگی کا وہ دور شروع ہونے والا تھا جس میں انھیں اپنے علم و بصیرت کی روشنی میں اپنی اختیار کردہ راہ پر چل کر خود اپنے متعین کردہ نصب العین کے حصول اور مقصد کے لیے جینا مرنا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے جو رسایل جاری کیے تھے ان کی ادارت سے، اور بعض میں اپنے تعلقات کی بنا پر شریک ہو کر علم و صحافت میں شوق و تربیت کی جو زندگی گزاری تھی، اس سے بھی انھیں علمی و ادبی دنیا میں ایک خاص حد تک شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس دور کا سب سے اہم جریدہ لسان الصدق (۵۔۱۹۰۳ء) تھا۔ یہ ان کا ذاتی رسالہ تھا۔ اس کی ادارت کی پوری ذمہ داری انھی پر تھی۔ اس ذمے داری اور اس کے کاموں میں کوئی دوسرا شریک و دخیل نہیں تھا۔ اس کا سب سے بڑا فایدہ یہ ہوا کہ وہ اعتماد جو ان میں نیرنگ عالم اور المصباح کی ادارت نے پیدا کردیا تھا، اس میں پختگی آئی اور اس کے ذریعے ان کی شہرت ملک کے علمی حلقوں تک پھیل گئی۔ لیکن ان رسایل کا اور ان کے بعد لسان الصدق کا کوئی علمی و صحافتی ماحول نہیں تھا۔ ان کے چند دوست تھے، جن سے ان کا صبح و شام کا ملنا جلنا تھا۔ اس کے برعکس الندوہ ایک علمی درس گاہ کا ترجمان تھا۔ ندوۃ العلماء ایک علمی، تعلیمی، اصلاحی کل ہند ادارہ تھا، اس کا دارالعلوم تھا، جس میں درس و تدریس کا ہنگامہ برپا

تھی، پورے ملک کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ علامہ شبلی کے لکھنؤ آجانے کے بعد ایک مستقل علمی فضا پیدا ہو گئی تھی، طلبہ میں درس و تعلیم کے ساتھ تحقیق و تصنیف اور علمی مباحث و مذاکرات کی سرگرمیاں پیدا ہو گئی تھی، ان میں علمی ذوق کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ اب روز و شب علمی صحبتیں گرم ہوتی تھیں، علوم و فنون کے چرچے، بحث و نظر کے ہنگامے اور مذاکرے ہوتے تھے۔ کلکتہ اور بمبئی میں ابوالکلام کو یہ ماحول میسر نہ تھا، کسی صاحب علم و مطالعہ کا ذہن اس قسم کے گرد و پیش اور ماحول کے بغیر نہیں کھلتا۔ کلکتہ میں ۱۹۰۱ء میں ندوے کے سالانہ جلسے کے انعقاد نے بحث و مذاکرات کا جو ماحول اور سرگرمی پیدا کر دی تھی، جس کا ذکر خود مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا ہے، اس قسم کا ماحول روز کا معمول نہ تھا، لکھنؤ میں یہ ماحول اور علمی صحبتیں ہر وقت میسر تھیں۔ اس ماحول سے ابوالکلام نے یقیناً فائدہ اٹھایا، ان کا ذہن کھلا، انھیں اپنے اوپر کامل اعتماد پیدا ہوا۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نے جو لکھا ہے کہ ندوے کی صحبتوں نے انھیں مولوی سے مولانا ابوالکلام بنا دیا، تو یہ بالکل غلط نہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شبلی نے انھیں علم کا کوئی نسخہ گھوٹ کر پلا دیا تھا، یا فن دانش مندی کا کوئی سبق انھیں پڑھایا تھا۔ لیکن جو ماحول اور علمی فضا لکھنؤ میں تھی اس کے بھی حدود تھے، یہ زندگی قواعد و ضوابط کی پابند تھی۔ یہاں کی ایک تہذیب تھی۔ تہذیبی زندگی آداب و رسوم کی پابند ہوتی ہے۔ مولانا ابوالکلام کی زندگی کا یہ وہ دور تھا، جب وہ فکر و عقیدے کے ایک انقلاب سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے گھر کی ایک مرتب تہذیبی زندگی کے خلاف بغاوت کی تھی اور ابھی تک انھیں ردعمل کی زندگی کی بے چینیوں سے نجات نہ ملی تھی، ان کے فکر و عقیدے نے ابھی سکون و طمانیت کی کوئی کروٹ نہ لی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے، وہ لکھنؤ کی زندگی کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے اور چھ مہینے گزرنے سے پہلے ہی انھوں نے امرتسر کی آزاد فضا کو تلاش کر لیا، جہاں کسی فلسفہ و تہذیب کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اب انھوں نے جو زندگی تلاش کی تھی، اس میں وہ آزاد و خود مختار تھے۔ ان سے کسی بات کی کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا، یہ ایک دائرے کی محدود و مختصر زندگی تھی، اس میں کوئی سازشی اور بدطینت نہ تھا۔ ان کے گرد و پیش جتنے چہرے تھے سب معمول اور حکم بجالانے والے تھے، امرتسر میں مولانا ایک نئے تجربے سے گزرے تھے۔ یہ ان کے شوق و تربیت کے دور کی آخری منزل تھی۔ لیکن افسوس کہ اس زندگی کا کوئی نقش اور کوئی اثر بھی تو ہمارے سامنے نہیں۔ ۱۹۰۶ء میں اور چند ماہ کے وقفے کے بعد ۸-۱۹۰۷ء میں خاصہ عرصہ انھوں نے وکیل میں گزارا۔ لیکن اس دور

کے ایک شمارۂ وکیل کا بھی تو ہندوستان پاکستان کے کسی ذخیرۂ علمی میں ابھی تک پتا نہیں چلا۔ حالاں کہ مولانا کی بعض تحریروں سے بعض مضامین و مباحث اور شذرات کا پتا چلتا ہے، اگر وکیل دستیاب ہوتا تو بہت سے مضامین کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ وکیل کے وہ خود مختار ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے کتنی ہی احتیاط کے ساتھ اداریے لکھے ہوں لیکن سیاست، مذہب، تعلیم، رسوم وغیرہ میں ان کے افکار اور اسلوبِ تحریر کی بنا پر ان کی پچاسوں تحریروں کی نشان دہی کی جا سکتی تھی۔ لیکن افسوس کہ ۱۹۰۷ء کے نصف آخر سے ۱۹۰۸ء کی دو تہائی گزرنے تک کی زندگی پر ایسا دبیز پردہ پڑا ہے کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتا اور ہماری نظریں ایک حقیقت کے نظارے کی آرزو میں پردے سے ٹکراتی ہیں اور مایوس لوٹ آتی ہیں۔ آیندہ کوئی کرشمہ ظہور میں آ جائے تو یہ نہ صرف ابوالکلام کی حیاتِ ممسی کا بہت بڑا انکشاف ہوگا، بلکہ صحافت، سیاست اور برِاعظم ہند پاکستان کی تاریخِ عمومی کے ایک دور کے فتحِ باب کا عجوبہ قرار پائے گا۔

اس وقت ابوالکلام کے حوالے سے جو آثارِ علمیہ ہمارے سامنے ہیں، ہم پہلی ہی نظر میں دیکھ سکتے ہیں کہ یہ ایک سپاٹ اور ایک یا دو پہلوؤں کی جامع شخصیت کے آثار نہیں ہیں بلکہ یہ ایک جامع جہات اور متنوع ذوق کی حامل شخصیت کے افکار اور مطالعہ و تحقیق کا حاصل ہیں۔ اگرچہ وہ بعض پیش کردہ افکار اور تحقیقات سے بعد میں غیر مطمئن ہو گئے تھے، جیسے کہ محمد یونس خالدی مرحوم کے خط کے جواب میں المراۃ المسلمہ کے مصنف فرید وجدی مصری کے پیش کردہ بعض خیالات سے انھوں نے عدمِ اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ اور اپنی اس رائے میں اس درجہ شدید تھے کہ المراۃ المسلمہ پر اپنے تبصرے کی تکمیل اور ۱۹۰۶ء میں وکیل بک ایجنسی، امرتسر سے کتابی شکل میں "مسلمان عورت" کے نام سے چھپوانے کے بعد پھر کبھی نہ خود اسے شائع کیا، نہ کسی اور کو اس کی اشاعت کی اجازت دی! لیکن یہ بات صرف مسلمان عورت (المراۃ المسلمہ) ہی کے بعض افکار کے بارے میں کیوں کہی جائے؟ مولانا کی زندگی میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک عقاید و اعمال کی شکست و ریخت کا جو عمل ہوا تھا، اس میں کون سی ایسی بات ہے جو اپنی پہلی حالت میں رہ گئی تھی۔ مذہب اور اس کے اصول و فروع، سیاست اور اس کے انداز و مقاصد، تعلیم اور اس کی غرض اور نصاب و نظام اور سماجی زندگی کے سیکڑوں مسائل ہیں، جن میں مولانا نے زمانے کی روش پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر بعد میں مولانا کے خیالات میں کوئی انقلاب آیا تھا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہو سکتی!

ہمیں معلوم ہے کہ کتنے ہی مسائل میں ان کی رائے ابنائے زمانہ سے مختلف تھی۔ عورت مرد کی مساوات، عورت کی آزادی، حقوق، پردہ، تعلیم، اس کے سوسائٹی میں مقام، اس کی زندگی کے دائرۂ کار کے بارے میں وہ مغرب اور مشرق کے اہل علم ونظر سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ ہم اسی مقام پر المراۃ المسلمہ پر تبصرے میں ان کے کسی جملے پر کوئی فتویٰ نافذ کرنا نہیں چاہتے۔ جب ان پر تحقیق اور کسی فیصلے کا وقت آئے گا تو ہم حضرت مولانا کے افکار کے ضروری اور اہم ماخذ؛ الہلال، البلاغ، ترجمان القرآن، ان کے خطبات، خطوط، مقالات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سے استفادہ کریں گے اور نہایت تفحص اور غور وفکر کے بعد کسی نتیجے تک پہنچیں گے۔ یہ مقام مولانا ابوالکلام کے ایمان وعقیدہ کا فیصلہ کر دینے اور کسی رائے کے غلط اور صحیح کے تجزیہ وتحقیق کا نہیں، الندوہ میں ان کے مضامین کی ترتیب وتدوین اور اہل علم ونظر اور اصحاب ذوق کے سامنے پیش کر دینے کا ہے! ایک ایسا شخص جس نے اس تاریخ کے بعد بھی پچاس برس سے زیادہ طویل علمی، ادبی، سماجی، سیاسی، مذہبی زندگی گزاری ہو اور اپنے پیچھے بیسیوں مجلدات اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اپنے افکار وافادات کا ذخیرہ یادگار چھوڑ گیا ہو، اس کی کسی ایک تحریر وبیان پر کیوں کر فیصلہ کر دیا جا سکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مضامین ومقالات اور نقد وتبصرہ کی تالیف واشاعت کا مقصد صرف اتنا ہے کہ مولانا نے ساٹھ سال کی بھرپور ادبی، علمی، سیاسی، مذہبی زندگی گزاری تھی، وہ زمانے کے مختلف نشیب وفراز سے اور ذہن وفکر کے انقلابات سے گزرے تھے، جب وہ ندوہ پہنچے تھے تو ان کی رسمی تعلیم سے فراغت پر کامل تین سال گزر چکے تھے، اس وقت ان کی زبان وبیان، اسلوب تحریر ونگارش، ذوق وفکر، مذہبی سماجی رجحانات، ان کے علم، ان کے شوق، ان کے سیرت کے خصائص، ان کے ذہن کی نشوونما اور زندگی کے اٹھان کا کیا عالم تھا۔ ان کی زندگی، اس کے اطوار اور مشاغل کی روشنی میں ان کے مستقبل کے بارے میں کیا پیش گوئی کی جا سکتی تھی۔ علمی تحقیقات میں بچپن کی تعلیم وتربیت اور ابتدائی ماحول کی دریافت کی اہمیت پہلے بھی تھی، اب ذہنی ارتقاء کی رفتار وانداز کی جستجو کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت چھوٹی عمر میں اپنے خاندان کے رسوم وروایات سے بغاوت کی تھی، اس لیے ان پر تحقیق میں ان امور کی خاص اہمیت ہے۔ اگر الندوہ میں مولانا کی

تحریرات ترتیب واشاعت کے ذریعے جامعات کے اساتذہ تک نہ پہنچادی جائیں تو وہ اس باب میں اپنے تلامذہ کی کیا رہنمائی کر سکیں گے اور ریسرچ اسکالرز کی ان تحریروں تک رسائی ممکن نہ ہو تو وہ غور وفکر کے بعد کیوں کر صحیح نتیجے نکال سکیں گے؟ ابوالکلام کے کسی فکر وعقیدے کے بارے میں ہمیں آج ہی فیصلہ نہیں کر دینا ہے، اس میں محققین کو مطالعے اور تحقیق کے کئی مشکل مقامات اور غور وفکر کی کئی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔ تب کہیں وہ حقیقت کا سراغ لگانے میں کامیابی سے سرخ رو ہو سکیں گے۔

شاید میں اس تحریر میں اپنے مقصد کو پیش کرنے میں ناکام رہا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ فاضل قارئین میرے منشا کو پالینے سے قاصر نہ رہیں گے۔ وہ یقیناً اس کام کی افادیت کو محسوس کرلیں گے۔ اگرچہ الندوہ میں مولانا ابوالکلام کے مضامین کی ترتیب وتدوین کے ذریعے میں نے اپنے مقصد میں ایک بڑی کامیابی حاصل کی ہے، لیکن مولانا کے رشحات قلم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آں مرحوم کی علمی ادبی زندگی کے آغاز سے الہلال کے اجرا تک تقریباً بارہ برس کے اخبارات ورسائل میں مدفون ہے اور اپنے ظہور کے لیے کسی صاحب ہمت کی توجہ کا منتظر ہے۔ اگرچہ اخبارات ورسائل کی بازیابی میں روز بہ روز ذاتی مشکلات پیدا ہوتی جارہی ہیں کہ مقصد کا حصول ناممکن بنتا جارہا ہے۔ ایک افسوس ناک صورتِ حال یہ پیدا ہوگئی ہے کہ طلبہ محنت سے جی چراتے ہیں اور اساتذۂ کرام ان سے محنت کروانے سے عاجز آجاتے ہیں۔ اوّلاً موضوعات تحقیق کے انتخاب میں مواد کی فراہمی میں سہولت پیش نظر رہتی ہے، محنت طلب موضوعات کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی جو علمی کام انجام پاتے ہیں، وہ تحقیق کے اعلیٰ معیار سے بہت کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس سلسلے میں بعض عذرات بھی ہیں جنھیں ہم بالکل نظر انداز نہیں کر سکتے، لیکن ان پر بحث ونظر کا یہ موقع نہیں۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

حرفِ اوّل

(۱)

بیسویں صدی کے اُردو ادبی منظرنامے پر جن لوگوں کی طلائی حرفوں میں کندہ سحر کار لوحیں جگمگا رہی ہیں اور ہمیشہ ضیا بار رہیں گی، ان میں ایک ناقابلِ فراموش اور حافظہ گیر نام مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔ ۱۹۵۸ء) کا ہے۔ آزاد ایسی بے مثل شخصیت تھے جن پر بہ سہولت ''نابغۂ روزگار'' کی ترکیب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اُردو میں کم شخصیتیں ہوں گی جن پر جامعیت کا حرف صادق آتا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، جدید و قدیم فلسفہ، علوم عمرانی، موسیقی، شعر و ادب سب پر اسکی عالمانہ اور مجتہدانہ نظر تھی کہ اس باب میں برِّعظیم کے گنے چنے لوگ ہی ان کے حریف ہو سکتے ہیں۔ اُردو، فارسی اور عربی شعر و ادب کا ایسا عمدہ رچا ہوا ذوق اور حافظے کے خزانے میں ہزاروں بے نظیر و برمحل شعروں کا غدر مچاتا ہوا ایسا حیران کن اجتماع ہماری ادبی دنیا کا ایک نادر وقوعہ ہے۔ اپنے اعلیٰ شعری انتخاب کے سبب مظہر جانِ جاناں کی ''خریطۂ جواہر'' اور شبلی کی شعر العجم کے بعد غبارِ خاطر کے مکتوباتِ انشائی میں شعر اور خصوصاً فارسی شعر کے وجد آور نظم و اہتمام نے کئی نسلوں کے ذوقِ شعری کی تربیت اور آبیاری کی ہے۔ ابوالکلام کا تنہا یہی احسان ایسا ہے جو بھلایا نہ جا سکے گا۔ علاوہ ازیں انھوں نے خطابت اور صحافت کو بھی ایک نیا لہجہ اور نیا آہنگ دیا۔ آخر الہلال کے رجز یہ آہنگ اور صاعقہ بار اسلوب کو کیسے نظرانداز کیا جا سکتا ہے جس نے برطانوی استعمار کے قلعے میں دراڑیں ڈال دی تھیں اور جس نے برِّعظیم ہند و پاکستان میں مسلم نشاۃِ ثانیہ کا ولولہ بیدار کیا تھا۔ مولانا صرف نام کے آزاد نہ تھے، واقعی مردِ آزاد، مردِ حُر تھے، سرو و سوسن کی طرح کس شان سے زندگی گزاری:

آزادہ رواں را خطر از دورِ جہاں نیست
رہزن بہ کجا قافلۂ ریگِ رواں زد!

ہوا کے جھونکے کی طرح کچھ عرصہ شعر گوئی کے چمن سے بھی گزرے۔ جم کے شعر کہتے تو اس اقلیم میں بھی اپنا دائمی نقش ثبت کرتے۔ آخر ان کے اس طرح کے شعر کیوں کر بھلائے جا سکتے ہیں:

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

ہر موجِ معانی کہ زجیحونِ دلم خاست
تا ساحلِ لب آمدہ، برتافت عناں را

حق یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد ہمارے لیے ایک نام نہیں، ایک تاریخ، ایک علامت ہیں۔ ان کی شخصیت نے مختلف علمی رستوں میں حائل کئی سنگِ راہ ہٹائے اور متعدد اہم سنگِ میل نصب کیے۔ جد وجہاد کی یہ داستان دراصل کوہ کنی، سنگ زدائی اور راہ نمائی کی ایک ایسی ایمان افروز اور عشق انگیز کہانی ہے، جس کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ ان کے بعض اجتہادات خصوصاً سیاسی تفکرات ومزعومات سے اختلاف بھی کیا گیا اور اس کی آج بھی گنجائش ہے مگر اس کے بیان کا یہ محل نہیں۔

(۲)

ایک ایسی شخصیت جس میں جامعیت اور ہمہ گیری کی ایسی شان ہو جس کی جانب اوپر اشارہ کیا گیا، اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کی زبان سے نکلے ہر قول اور اس کے قلم کی ہر جنبش کو محفوظ کر لیا جائے تاکہ ایک ایسا وقت آئے کہ اس سرمائے کی کامل جمع آوری کے بعد اس کا اور اس کے کارناموں کا بے لاگ اور ہمہ گیر تجزیہ کیا جا سکے۔ پاکستان کے ممتاز دانش ور اور ابوالکلام آزاد سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے ادیب جناب ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنے آپ کو کم وبیش ابوالکلامیات کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ ایک سچے نقاد اور ادبی پرکھ کرنے والے ادیب کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ کسی اہم لکھنے والے کی ہر تحریر، وہ متقدم ہو یا متاخر، محفوظ کر لینے کے

لائق ہے تاکہ اس کے اسلوب اور فکری ارتقا کی سچی اور مکمل تصویر پیش کی جا سکے۔ آزاد کے احوال و آثار سے ان کی وابستگی کا یہ عالم ہے کہ وہ کم و بیش چالیس بیالیس برس سے ان کی فکر سے وابستہ اور ان کی غیر مدون تحریروں کی جمع و تدوین میں مشغول ہیں اور اب تک حواشی، تعلیقات اور ضروری توضیحات کے ساتھ مولانا کی درجنوں تحریریں کتابی شکل میں چھاپ چکے ہیں۔ ان کے عشق کا ایک مظہر "ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان" کا قیام ہے جو ان تحریروں کی طبع و اشاعت کا ایک اہم مرکز بن چکا ہے۔ یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ دونوں کے اولین ناموں کا سابقہ "ابو" ہے۔ ابوالکلام سے ابوسلمان تک یہ اتحاد لفظ و معنی بہر حال ایسی چیز نہیں جس سے صرف نظر کیا جا سکے۔

(۳)

پیش نظر کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مضامین و مقالات اور شذرات پر مشتمل ہے جو اپنے زمانے کے نہایت پر ارزش علمی مجلہ "الندوہ" میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں ایک مقالہ "مرحوم علامہ شبلی نعمانی ... حیات علمی و ادبی پر ایک سرسری نظر" ایسا بھی ہے جو البلاغ کے ۱۹۱۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، شاہ جہان پوری صاحب نے اسے بھی اپنے مقدماتی مباحث میں شامل کر لیا ہے۔

ماہنامہ "الندوہ" ندوۃ العلماء لکھنؤ کا علمی ترجمان تھا اور ندوے کی روح رواں علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ ابوالکلام اس کے معاون مدیر بننے کی ذمہ داری قبول کریں۔ سبب یہ تھا کہ طرفین میں کئی برس پہلے ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ نیز شبلی آزاد کے جاری کردہ نیرنگ عالم (کلکتہ)، المصباح اور لسان الصدق وغیرہ کے ذریعے ان کے غیر معمولی علمی ذوق اور دقیقہ رس مزاج سے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ "خدنگ نظر" میں ابوالکلام کے شائع ہونے والے مضامین بھی ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ وہ ایک موقع پر آزاد سے کہہ چکے تھے: "تمھارا ذہن و دماغ تو عجائب روزگار میں سے ہے!" مختصر یہ کہ آزاد نے شبلی سے اپنی غیر معمولی عقیدت اور موخر الذکر کے اصرار کے پیش نظر اکتوبر ۱۹۰۵ء میں الندوہ کے معاون مدیر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی اور قریباً چھ سات ماہ تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آخری پرچہ مارچ ۱۹۰۶ء میں مرتب کیا اور گمان غالب ہے کہ اپریل کا شمارہ بھی انھی کی کاوش سے مرتب ہوا ہو۔ الندوہ کی نائب ادارت

کے زمانے میں آزاد کے متعدد مقالے اور شذرات اس ماہنامے میں شائع ہوئے۔ ادارت سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کے بعض مقالے الندوہ کی زینت بنتے رہے۔ مثلاً ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی'' اور ''ندوۃ العلما کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود'' وغیرہ۔ مراد یہ ہے کہ شبلی اور ان کے علمی کارناموں سے نیز ان کے غیر معمولی شعری ذوق اور متعدد دیگر اوصاف و محاسن سے گرویدگی کے باعث آزاد کی ان کے علمی حلقے سے بھی گہری ذہنی مقاربت رہی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آزاد کے منفرد اسلوبِ تحریر کے خدوخال متعین ہونے لگ گئے تھے اور مستقبل میں الہلال کے عہد ساز پرچے کا آغاز ہونے والا تھا، لہٰذا الہلال سے قبل کی تحریروں میں الندوہ میں آزاد کے شائع شدہ مقالات و شذرات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تحریریں اگرچہ زیادہ تر ۲۲ سال تک کی عمر میں منصۂ ظہور میں آئیں مگر ان میں وہ اٹھان دکھائی دیتی ہے جو الہلال میں خاص پختگی کو پہنچ کر بعد ازاں البلاغ کی تحریروں اور غبارِ خاطر میں اپنے ترفع کی انتہائی منزلیں طے کر لیتی ہے۔ یہ مضامین دراصل آزاد کے اس رفیع الشان اسلوب کا، جو سادگی اور پرکاری کا بے مثل جامع ہے اور فی نفسہ ناقابلِ تقلید ہے، نقشِ اوّل ہیں۔

پیشِ نظر کتاب میں شامل آزاد کے ان مضامین سے بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں کیسی بالغ نظری سے نوازا تھا اور وقت کی علمی رفتار کا کیسا بالیدہ شعور بخشا تھا۔ یہ تحریریں آزاد کی وسعتِ مطالعہ، وسیع النظری، دردمندی اور اٹوٹ علم دوستی کی مظہر ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ اسلام ماضی میں اہلِ عالم کے لیے کس قدر فیض رساں رہا ہے اور آج ملتِ اسلامیہ کو کیسے علما مطلوب ہیں۔ مثلاً ان کے مقالے ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی'' ہی کو دیکھیے، یہ مقالہ زوال آمادہ مسلم ملت کے لیے ایک تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے، مسلم ملت کے عروج کے بعد زوال پذیر ہونے اور اہلِ یورپ کے ذریعے مسلمانوں کے علمی خزائن کی تحفیظ و احیا کی کوششیں اس بہت اہم مقالے کا موضوع ہیں۔ یورپ عربی زبان اور علومِ عربی سے کب متعارف اور ان کی جانب کب متوجہ ہوا، صرف و نحو اور لغت و ادب سے متعلق کون کون سی قابلِ ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں مرتب ہوئیں، ان کا ذکر مذکورہ مقالے میں ملے گا۔ صلیبی جنگوں کا مثبت اثر یہ ہوا کہ یورپ کو مسلمانوں کے علوم اور ثقافت و تمدن سے براہِ راست تعارف اور فیض اندوزی کا موقع ملا۔ اسی مقالے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مغرب سے مشرق کی طرف اوّلین قدم مذہبی پیشواؤں کا تھا جو یورپی عوام الناس کے برعکس

تعلیم یافتہ تھے۔ اس اولین پیش قدمی کا ایک باریک پہلو وہ بھی ہے جس کی نشان دہی حکیم الامت حضرت اقبال نے کی تھی اور جس میں گویا استشراق کی پوری روح کھنچ آئی ہے:

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر ان کی
تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسا کے سفیر

(ضربِ کلیم)

گیارھویں صدی سے مغرب کی توجہ مسلم علوم کی جانب ہوئی اور چودھویں صدی تک مسلم فلسفے کی تمام کتابیں لاطینی میں ترجمہ ہو چکی تھیں۔ بعض لغت کامل پچاس برس کی محنت سے تیار ہوئے۔ آزاد کے اس مضمون سے اہلِ یورپ کے ناقابلِ تسکین علمی مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔

کتاب کے دیگر قابلِ ذکر مقالات میں ”یورپ میں گونگوں کی تعلیم“، ”المراۃ المسلمۃ“ اور ”ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت“ ہیں، علاوہ ازیں ”علمی خبریں“ کے زیرِ عنوان فراہم کردہ معلومات بھی سو برس قبل کے برِعظیم کے اہلِ علم کے لیے بہرحال نہایت تازہ اور چشم کشا تھیں گو کہ آج یہ معلومات بہت پرانی ہو چکی ہیں۔ المراۃ المسلمۃ میں فراہم کردہ معلومات کا سرچشمہ فرید وجدی مصری کا اسی عنوان کا مضمون ہے جسے آزاد نے اردو ترجمے، تبصرے اور اضافے کے ساتھ تالیف کا درجہ بخشا ہے، اس مقالے میں دلائل کا اسلوب اور معلومات کی پیش کش آج بھی قاری کے لیے خاصی قابلِ توجہ ہے۔

”ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت“ کے زیرِ عنوان آزاد نے بڑی دردمندی سے ندوے کے لیے ایک بڑے کتب خانے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ اسی مقالے میں انھوں نے علاوہ اور باتوں کے امین رازی کے تذکرۂ شعرائے فارسی ”ہفت اقلیم“ کا بھی ذکر کیا ہے جو مخطوطے کی شکل میں ندوے کی لائبریری میں موجود تھا اور اس مقالے کی تحریر تک غیر مطبوعہ تھا۔ ۱۵۶۰ فارسی شعراء، فضلاء اور امراء و ملوک کے ذکر پر مبنی یہ تذکرہ آج سے چار سو چھبیس برس پہلے ۱۰۰۲ھ میں لکھا گیا تھا۔ ”تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان“ (سید علی رضا نقوی) میں فاضل مدوّن نے متعدد قلمی نسخوں کا ذکر کیا ہے، مگر اس میں ندوے کے مخطوطے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ تذکرہ اوّلاً کلکتے سے تین جلدوں میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ایران سے شائع ہوا۔ تذکرے کا مؤلف امین رازی رَے میں متولد ہوا۔ جہانگیر کی اہلیہ نور جہاں بیگم کا والد اعتماد الدولہ

غیاث بیگ امین رازی کا چچا تھا۔

اس مجموعۂ مقالات کا ایک خاصا مفصل مضمون ''ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود'' ہے۔ اپنے مباحث اور زبان و بیان کے اعتبار سے اسے بھی آزاد کی مؤثر تحریروں کا پیش رَو کہنا چاہیے۔ بہ ظاہر تو یہ ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی کی روداد ہے، مگر اس میں جگہ جگہ آزاد نے ادبی چاشنی کا جادو جگایا ہے۔ علامہ شبلی ندوے کے قیام سے کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور ان مقاصد کے پس منظر میں ان کی کیسی وسعتِ نظر، روشن فکری اور کیا مجتہدانہ سوچ کارفرما تھی، اس کا بخوبی اندازہ اس روداد سے ہوتا ہے۔

ندوے کا ایک خاص امتیاز طلبہ میں عربی زبان سے ایک گہرے لگاؤ کی تولید بھی تھا۔ پھر صرف عربی زبان ہی میں قدرتِ اظہار نہیں بعض طلبہ کو بھاکا میں بھی مؤثر اظہارِ خیال کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ اسلام کے لافانی افکار سے غیر مسلم بھی استفادہ کر سکیں۔ اس روداد میں آزاد نے ایک نوجوان طالب علم سید امداد حسین کا بھی ذکر کیا ہے جو عربی اور سنسکرت دونوں پر قادر تھا۔ اس نے نہ صرف بھاکا میں نہایت مؤثر تقریر کر کے سماں باندھ دیا، بلکہ سورۃ الرحمٰن کے ایک رکوع کی تلاوت کر کے بھی سامعین کے قلوب کو مسخر کر لیا۔ آزاد نے اپنے سحر کار قلم سے سید امداد حسین کا اَنمٹ نقش ہمارے دلوں پر ثبت کر دیا ہے:

> ''سید امداد حسین سورۃ الرحمٰن کا پہلا رکوع اپنی مؤثر آواز اور جگر دوز لہجے میں تلاوت کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ کیا یہ صاعقہ اثر آواز جو ہمارے دلوں کو دونیم اور آنکھوں کو جل ریز کر رہی ہے، وہی صدائے جاں نواز ہے جو کبھی ریگستان عرب کے ٹیلوں اور تودہ ہائے ریگ پر بجلی بن کر چمکی، کبھی غارِ حرا کی تاریکی میں تجلیِ حق بن کر نور افشاں ہوئی، کبھی فاران کے قلہ ہائے بلند پر ابرِ رحمت بن کر برسی، کبھی مشرق و مغرب کے ظلمت کدے پر آفتاب بن کر طلوع ہوئی اور اب ایک لٹے ہوئے کارواں اور برباد شدہ قافلے کے لیے رہنمائی کا سہارا اور امید کی روشنی ہے۔''

اس رپورتاژ نما تحریر میں آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ عہدِ جدید کی ضرورت نے کس قسم کے علمائے اسلام کی طلب پیدا کی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۰ء کی اس تحریر میں جو ضرورت محسوس کی گئی

تھیں وہ آج کے نسبتاً پر آشوب عہد میں شدید تر اور سنگین تر ہو گئی ہے۔ اس رو دو میں دلی مرحوم کا ذکر جس تاثیر آمیز اور حسرت آثار رنگ میں کیا گیا ہے اور حکمت کے موتی جس حسن اور سلیقے سے جا بجا ٹکے نظر آتے ہیں وہ خود آزاد کے مؤخر اسلوب کے نقش اول قرار دیے جا سکتے ہیں۔ دیکھیے کس سہولت سے کیسی پتے کی بات کہہ گئے ہیں:

> الف۔ ''انسانی غلطیوں میں سب سے زیادہ نقصان رساں اور عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ عموماً آلات و وسائط کو مقصود بالذات سمجھ لیتا ہے اور دور بین بنانے میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔''
>
> ب: ''وہ سیکڑوں نالے جو جمع ہو کر سمندر کا مقابلہ کرتے، الگ الگ رہنے کی وجہ سے قریب ہے کہ خشک ہو جائیں۔ زنجیر کے حلقے اگر بکھرے ہوئے پڑے ہوں تو بے فائدہ بوجھ ہے۔''

ڈاکٹر شاہ جہان پوری کی اس تدوین کردہ کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف آزاد کے مقالات کی جمع آوری نہیں، ان میں موجود مباحث اور توضیح طلب مقامات کا ایک عمدہ اور ناقدانہ اشاریہ بھی ہے۔ چنانچہ ان مقالات کے دوش بدوش آپ کو خود فاضل مرتب کے ایسے مقالات بھی ملیں گے جو علامہ شبلی، ندوۃ العلما، سیرۃ النبی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تالیف، الہلال کا نسب و لہجہ اور شبلی، شبلی اور آزاد کے تعلقات از ابتدا تا انتہا جیسے امور پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً ان مقالات سے علم ہوتا ہے کہ بقائے ندوہ کی جنگ میں آزاد کی کیا خدمات تھیں، شبلی کے خلاف قائم جارحانہ محاذ اور ہنگامہ خیز طوفان کی شدت کو کم کرنے میں آزاد کے آتش نوا قلم نے کیا کیا جولانیاں دکھائیں، الہلال نے مسلمانان برعظیم ہند و پاکستان میں قرآنی ذوق کی تولید و رشد میں کیا کردار ادا کیا۔ الہلال میں شائع شدہ علامہ شبلی کی نظمیں کس طرح الہلالی فکر اور تحریک کی مؤید بنیں۔ علاوہ ازیں ان مقالات میں آپ کو مرتب کے بعض ناقدانہ خیالات سے بھی مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔ مثلاً اپنے مضمون ''ابوالکلام اور علامہ شبلی ... آخری دور'' میں انھوں نے دلائل کے ساتھ سید سلیمان ندوی کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے کہ اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں آزاد کے خیالات علامہ شبلی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھے۔ ڈاکٹر شاہ جہان پوری کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ امور میں خود آزاد کی منفرد سوچ اور

گہرے تفکر نے ان کا رستہ متعین کر دیا تھا۔ ابوالکلام کی فضیلت خداداد تھی:

ز خیلِ زر و کشاں غیرِ ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ماہم تتمّہ بسے

ڈاکٹر شاہ جہان پوری آزاد کی تحریروں کے مافیہ اور ان کی مختلف اشاعتوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یوں تو اس امر پر ان کی ابوالکلام آزاد کے سلسلے کی متعدد تدوینات شاہد ہیں مگر زیرِ نظر مضامین میں صرف "الندوہ اور ابوالکلام" نامی مضمون ہی سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں بدلائل بعض نقادوں کے مزعومات کی نفی کی ہے اور حقائق کو اجاگر کیا ہے۔

یہاں ضمناً ڈاکٹر شاہ جہان پوری کے مقالے "ابوالکلام اور علامہ شبلی ... آخری دور" کا جس کے بعض قابلِ قدر مشمولات کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں، ایک اور حوالے سے ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مقالے میں آزاد کے اپنے "صدیقِ مکرم" مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے نام ایک مکتوب کا تفصیلی حوالہ دیا ہے جو "کاروانِ خیال" میں شامل ہے۔ اس مکتوب میں، جو ۱۹۴۰ء میں لکھا گیا، آزاد نے اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی کی فارسی شاعری کی بڑی تحسین کی ہے اور بجا طور پر کی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ "ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں شبلی پر ختم ہوئی۔ غالب جو کچھ ہے تغزل و مدح کے میدانوں تک محدود ہے لیکن مولانا (شبلی) نے فارسیت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کیے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں۔" اس میں کیا شک ہے کہ علامہ شبلی نے اپنی فارسی شاعری میں قومی نظم نگاری کی طرح ڈالی، لیکن آزاد کا یہ کہنا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں شبلی پر ختم ہوئی، حیران کن ہے۔ ۱۹۴۰ء میں جب یہ بات کہی گئی، اقبال کو فوت ہوئے دو برس ہو چکے تھے اور ان کی ملی اور قومی فارسی شاعری کا بے مثال رجز برِ عظیم کی سرحدوں سے نکل کر یورپ میں بھی گونج رہا تھا۔ ایسے میں علامہ شبلی کی فارسی شاعری کو ہندوستان میں فارسی شاعری کا نقطۂ اختتام بتانا حیرت انگیز ہی نہیں، تاسف خیز بھی ہے۔ اگر اس اختتام کا اعلان ضروری تھا تو نقطۂ اختتام شبلی نہیں اقبال ٹھہرتے ہیں:

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

آگے چل کر اسی مکتوب میں آزاد لکھتے ہیں، ''اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا (شبلی) تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوب شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔ اس معاملے کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں۔ خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔''

مجھے معلوم نہیں آزاد کا اشارہ کن ایرانی قومی شاعروں کی طرف ہے۔ خیال ہے کہ یہ اشارہ تحریک مشروطہ کے انقلابی شعرا کی طرف ہوگا۔ رہے ایران کے ملک الشعراء بہار (۱۸۸۶ء۔ ۱۹۵۱ء) تو گمان ہے کہ اپنی گوناگوں سیاسی اور دیگر مصروفیات کے باعث آزاد کو بہار کے دیوان کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع نہیں مل پایا ہوگا، ورنہ وہ بہار کی شاعری کو یوں رد نہ کرتے، بلکہ ان کی غیر معمولی قدرت کلام کی داد دیتے۔ آزاد شبلی کی قومی شاعری کی داد دیتے ہیں، لیکن مشروطیت کے باب میں تخلیق ہونے والی بہار کی شاعری ان کی نگاہ سے بوجوہ اوجھل رہی جس کا ایک ایک لفظ آتش و شہاب سے ترشا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جس نے ایران کے ملی شعور کی بیداری میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ تحریک مشروطہ کے ضمن میں بہار کی شاعری نے ایران کی ایک نئی تاریخ رقم کی ہے۔ بہار کی قدرت کلام کا یہ عالم ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں صنف قصیدہ میں ایسا کمال پیدا کیا کہ ان کے عمر رسیدہ معاصرین شبہ کرتے تھے کہ بہار اپنے والد ملک الشعراء صبوری کا کلام اپنے نام سے پڑھتا ہے۔ گو کہ ملک الشعراء بہار کے قصاید میں معنی آفرینی کی وہ سطح تو نظر نہیں آتی جو منوچہری، فرخی، انوری یا خاقانی کو نصیب تھی مگر یہ قصاید زبان و بیان پر ان کے عبور اور کہیں کہیں لطیف نکتہ آفرینی کے گواہ ضرور ہیں۔ ''تشبیب و بہاریہ''، ''در وصف انگور'' جیسے منظومات میں ان کی ندرت بیان اور نزاکت احساس دیکھی جا سکتی ہے۔ اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حوادث و وقائع پر بھی بہار نے بڑے لطیف، طنزیہ اور دردمندانہ انداز میں لکھا۔ علاوہ ازیں اتحاد عالم اسلامی کی آواز بلند کرنے والوں میں بہار کا شمار السابقون الاولون میں کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں ۱۹۰۸ء میں کہی گئی ''اتحاد اسلام'' نامی نظم قابل ملاحظہ ہے جس کا جوش بیان اور ولولۂ خطابت دیدنی ہے۔ اسی طرح ''از ماست کہ بر ماست'' نامی نظم میں جو ۱۹۱۲ء میں کہی گئی بہار نے مسلمانوں کے زوال کا سبب خود انھی کو قرار دیا ہے۔

اسلام گر امروز چنیں زار و ضعیف است
زیں قوم شریف است
نہ جرم ز عیسیٰ نہ تعدی ز کلیساست
از ماست کہ بر ماست

”از ماست کہ بر ماست“ کا ٹیپ کا مصرع آج بھی اہلِ ایران کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح بہار نے ”خویش را احیا کنید“ جیسی متعدد بے مثال نظمیں کہیں۔ چوں کہ مولانا آزاد قصیدے سے زیادہ غزل کے قتیل تھے اس لیے بہار کے یہاں انھیں لطف کا زیادہ سامان میسر نہ آیا ہوگا۔ واضح رہے کہ بہار کی غزل کا لہجہ بھی متقدمین سے جدا ہے اور بعض مقامات پر اپنے اندر عجب طنطنہ رکھتا ہے۔ بعض جگہ انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے عہد پر نہایت رواں، دل سوزانہ تبصرے کیے ہیں۔ چند شعر درج کرنے میں ہرج ہی کیا ہے:

کن حذر زاں دم کہ دستِ عاشقِ دلمردہ ای
ہچو قاتل درمیانِ رہگذر گیرد ترا

میان ابرو و چشم تو گیر و داری بود
من این میانہ شدم کشتہ، این چہ کاری بود

من نگویم کہ مرا از قفس آزاد کنید
قفسم بردہ بہ باغی و دلم شاد کنید
دعویٰ چہ کنی داعیہ داران ہمہ رفتند
شو بار سفر بند کہ یاران ہمہ رفتند
آن گرد شتابندہ کہ در دامنِ صحراست
گوید چہ نشینی کہ سواران ہمہ رفتند
یک مرغ گرفتار در این گلشن ویران
تنہا بہ قفس ماند و ہزاران ہمہ رفتند

شحنہ با شیخ بہ جنگ است بیا تا من و تو
اندریں فرصت کم عیش تماشا بکنیم

تو اول و تو ثانی در خوبی و رعنائی
ای ثانی بی اول وی اول بی ثانی

مجھے یقین ہے کہ اگر اس طرح کے شعر آزاد کی نظر سے گزرتے تو وہ بہار کی بہار آفرینی کی داد ضرور دیتے۔

مجھے احساس ہے کہ شبلی کی ملّی شاعری کے ذکر میں بات کہیں سے کہیں نکل گئی لیکن میرے نزدیک اس تفصیل کی ضرورت بہرحال تھی تاکہ بہار کی شاعری کے اصل خد و خال واضح کر دیے جائیں، اور پھر اس سب کا محرک بھی تو حضرت شاہ جہان پوری کا مضمون ہی ٹھہرا۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد و ابو سلمان کے مضامین کا یہ ملا جلا مجموعہ کئی حوالوں سے شبلیات و آزادیات کے باب میں بعض نئی معلومات کا نقیب کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری لائق تبریک ہیں کہ ان کی مساعی سے آزاد کے افادات کم و بیش سو برس بعد کتاب کی صورت میں ظہور کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی
استاد ادبیات اُردو و پاکستان شناسی
تہران یونیورسٹی، ایران
تہران: ۱۲؍۱۲؍ اسفند ۱۳۸۵ / بمطابق ۳؍ مارچ ۲۰۰۷ء

مقدمہ:

(۱)

علامہ شبلی نعمانی اور مولانا ابوالکلام آزاد

تعارف اور ملاقات کا ابتدائی دور

۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء

حضرت علامہ شبلی سے مولانا آزاد کی واقفیت، مراسلت، ملاقات اور تعلقات کے کئی دور ہیں۔ جہاں تک واقفیت اور آغاز مراسلت کا پتا چلتا ہے یہ ۱۹۰۱ء کے واقعات ہیں۔ اس وقت تک مولانا ابوالکلام آزاد گلدستہ ”نیرنگِ عالم“ (۱۸۹۹ء) اور المصباح (۱۹۰۱ء) کے اجرا و بندش کے تجربات سے گزر چکے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں ”لسان الصدق“ (۱۹۰۳ـ۵ء) کی بندش کا واقعہ بھی پیش آ چکا تھا۔ اس پس منظر میں مولانا نے لکھا ہے کہ حضرت شبلی سے گذشتہ پانچ برس سے خط و کتابت جاری تھی۔ حضرت مرحوم سے مولانا کی اوّلین ملاقات کا زمانہ بھی یہی ہے۔ مولانا بیان فرماتے ہیں:

> ”بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت مولانا مرحوم حیدرآباد میں ”ناظم علوم و فنون“ تھے اور تقریباً پانچ سال سے میری خط و کتابت ان سے جاری تھی۔“

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق سے کئی باتوں کا ذکر ضروری ہے! پہلی بات تو مولانا آزاد ہی کے الفاظ میں:

> ”میں چوں کہ ان کی تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا اس لیے ان کی اپنے دل میں بڑی عزت و وقعت رکھتا تھا اور طبیعت میں شوق تھا کہ ایسے لوگوں کی معیت و صحبت کا موقع حاصل ہو۔“

یہ علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے ابتدائی تعارف اور تاثر کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب مولانا سے مراسلت اور ملاقات ہوئی تو یہ تاثر اور گہرا اور روابط پختہ ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شبلی کی خدمت میں سب سے پہلا خط تقریباً ۱۹۰۱ء میں لکھا تھا۔ اس وقت مولانا کو جدید علوم کی کتابوں کے مطالعے کا شوق ہوا تھا۔ پہلے انھوں نے ان کتابوں کی تلاش کی جو انگریزی، عربی، فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوئی تھیں۔ پھر مصر، شام کی عربی کتب کی تلاش ہوئی۔ علامہ شبلی کو انھوں نے اسی سلسلے میں خط لکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

> "اب مصر و شام کی کتابوں کا شوق ہوا۔ مولانا شبلی کو ایک خط لکھا اور ان سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون کون سے ہیں اور کہاں کہاں سے ملیں گے؟ یہ پہلا خط ہے جو میں نے مولانا کو لکھا۔ انھوں نے دو سطروں میں یہ جواب دیا کہ مصر و بیروت سے خط و کتابت کیجیے۔"

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۵۸ء، ص ۳۵۷)

اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں اس وقت مراسلت کا موقع ملا جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبہ ترقی اردو کو اس کی مستقل حیثیت میں انجمن ترقی اردو کی شکل دی گئی تھی۔ اس کا ذکر آیندہ سطور میں آ رہا ہے۔ اس کے بعد جو وقت بھی آیا مولانا آزاد علامہ شبلی کے قریب ہوتے گئے۔ مراسلت کے زیادہ موقع پیش آتے گئے پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بھی قائم ہوا اور تعلقات پختہ ہوتے گئے۔

اواخر دسمبر ۱۹۰۱ء ندوۃ العلماء کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا۔ اس کے لیے حالات کو سازگار بنانے کے لیے ندوے کے بعض کارکنان پانچ چھ مہینے پہلے سے سرگرم کار تھے۔ اس کا دل چسپ تذکرہ مولانا آزاد نے اپنی کہانی بہ روایت مولانا ملیح آبادی میں کیا ہے (دیکھیے: آزاد کی کہانی ان کی اپنی زبانی، ص ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۱۷ تا ۲۲۲ و دیگر صفحات)۔ مولانا آزاد اس جلسے کے محض تماشائی نہ تھے بلکہ ندوے کی حمایت میں اس موقع پر بعض رسایل بھی لکھے تھے۔ مولانا خود فرماتے ہیں:

> "۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کا کلکتے میں جلسہ ہوا اور بہت سے علما جمع ہوئے۔ میں اس وقت آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور ندوے کے معاملات، اس کے جھگڑوں، مباحثوں میں پوری طرح دل چسپی لیتا تھا۔ میں اس زمانے میں مجامع عامہ میں

تقریر کرنا شروع کر چکا تھا۔ مقامی مشاعروں میں اور ملک کے مشہور گلدستوں میں میرا کلام مقبول ہو چکا تھا اور اردو مضمون نگاری بھی کرنے لگا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے تھے۔ ایک ضخیم کتاب بھی لکھنی شروع کر دی تھی۔ ندوہ اور اس کے مخالفین سے جھگڑوں اور ندوے کی حمایت میں متعدد تحریریں لکھی اور شائع کی تھیں۔"

(آزاد کی کہانی ۔۔ ص ۲۱۶)

اسی سلسلے میں مولانا مزید لکھتے ہیں:

"......ندوۃ العلماء کے جلسۂ کلکتہ کے مباحث شروع ہوئے اور ندوہ اور مخالفین ندوہ کے متوازی کیمپ قائم ہو گئے۔ ساتھ ہی رسائل و مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ ندوے کے سفرا میں ایک شخص مولوی نظام الدین جھجری تھے۔ وہ مخالفین کے تازہ رسائل و مضامین دکھلاتے تھے اور میں ان کے جوابات لکھ کر دے دیتا تھا اور پھر ندوے کی استقبالی کمیٹی انھیں چھاپ کر شائع کر دیتی تھی۔ اس قسم کے دو تین چھوٹے چھوٹے رسالے شائع ہوئے اور غالباً مذہبی رسائل منظومہ کے بعد نثری قسم کی چیزوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اشاعت تک نوبت آئی۔" (ایضاً، ص ۲۷۳)

ندوۃ العلماء کا یہ سالانہ جلسہ جس کا ذکر اوپر کے اقتباس میں آیا ہے، اس کے صدر مولانا عبدالحق حقانی دہلوی تھے۔ (ایضاً، ص ۲۱۹)

ملک کے دور دراز کے شہروں سے بہت سے علما اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے اور کئی کئی دن کلکتہ میں مقیم رہے تھے۔ مولانا آزاد کی ان سے ملاقاتیں اور گفتگوئیں رہیں۔ مولانا نے اپنی کہانی میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ ان کا بیان ہے:

"ندوے کے اجلاس میں جو علما باہر سے آئے تھے، جلسے کے اوقات کے بعد بھی ان کا اجتماع مسجد میں، یا حاجی بخش الٰہی کے مکان میں رہا کرتا تھا۔ میں وہاں برابر جایا کرتا اور جب ان لوگوں کا یہ خیال دور ہو گیا کہ میں ایک شخص ناقابلِ التفات کمسن لڑکا ہوں تو مجھے اپنی قوت بیانیہ اور بحث و جدال کے لیے خوب موقع

ہاتھ آگیا۔" (ایضاً ص ۲۱۹)

مولانا آزاد نے اس زمانے کی کئی بحثوں کا، ان کے فریق مجادلہ کے ناموں اور مواقع کی صراحت کے ساتھ اپنی کہانی میں ذکر کیا ہے۔

لیکن کوئی ایسا اتفاق پیش آیا تھا کہ حضرت علامہ شبلی کلکتہ کے اس اجلاس میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

ندوے کے حوالے سے مولانا آزاد نے ایک صاحب احمد حسن فتح پوری کا ذکر اپنی ابتدائی صحافتی زندگی اور تصنیف وتالیف کے شوق کے سلسلے میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں ایک قابل اور مستعد آدمی تھے۔ یہ تحفۂ احمدیہ کان پور، جسے مولانا محمد علی مونگیری بانی وناظم اول ندوۃ العلماء نکالا کرتے تھے، بند ہو جانے کے بعد نکلنے والے رسالے تحفۂ محمدیہ کے ایک عرصے تک ایڈیٹر رہے تھے اور کلکتہ منتقل ہو جانے کے بعد پھر اسے "تحفۂ احمدیہ" کے نام سے نکالا تھا۔ مولانا ابوالکلام سے ان کی شناسائی ہو گئی تھی، اس لیے مولانا کو اس میں مضمون نگاری کا بہت موقع ملا۔ انھوں نے کلکتہ ہی سے احسن الاخبار بھی نکالا تھا۔ اس کے بند ہو جانے کے بعد ایک ملازمت کے سلسلے میں دارجلنگ چلے گئے تھے۔ ۱۰؍ دسمبر ۱۹۰۳ء کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ چوں کہ مولانا ابوالکلام کو ان سے خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا، اس لیے ان کے انتقال کا دل پر بہت اثر ہوا اور ایک دل دوز نثری مرثیہ ان کی رحلت پر لکھا تھا۔ اس کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں:

> "مولانا سید احمد حسن کا نام پبلک کے لیے کوئی نیا نام نہیں ہے۔ یہ ایک عرصے تک تحفۂ محمدیہ کان پور کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، جس نے ایک عرصے تک کرسچین دنیا کا نہایت دلیری کے ساتھ مقابلہ جاری رکھا تھا اور ایک قانونی زور نے جسے تبدیل نام کے بعد مولوی صاحب کے ہاتھوں تک پہنچایا تھا (۱)۔
>
> ندوۃ العلماء کے یہ پر زور ممبر رہے اور ہمیشہ تحفۂ احمدیہ کے کالم ندوے کی تائید میں مضامین کے لیے کھلے رہے۔ ندوۃ العلما کلکتہ کی کشش نے انھیں کلکتہ پہنچایا اور انھوں نے کلکتہ کا مشہور اخبار احسن الاخبار جاری کیا۔"

(لسان الصدق: کلکتہ، ۵؍ دسمبر ۱۹۰۳ء، ص ۱۵)

۱۹۰۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو کو انجمن ترقی اردو کے نام سے ایک

مستقل انجمن کی شکل دے دی گئی تھی اور اس کے ناظم حضرت علامہ شبلی قرار پائے تھے اور اردو کے علمی ذخیرے کو وسیع کرنے کی ایک صورت یہ قرار پائی تھی کہ انگریزی، عربی، فارسی کے ذخیرۂ علمیہ سے نئی اور علمی کتابوں کے تراجم اور علمی موضوعات پر تصنیف و تالیف کے منصوبوں پر عمل کیا جائے۔

اسی سال کے آخر میں لسان الصدق (کلکتہ) کا اجرا ہوا۔ لسان الصدق کے خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گئے یعنی ترقی اردو اور اصلاح رسوم، اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ لسان الصدق علامہ شبلی سے تعارف کا ایک قوی ذریعہ ثابت ہوا۔ مولانا آزاد کے ذوق و مستعدی اور ان کی ادارت میں ایک ادبی و علمی رسالے کو دیکھ کر انھوں نے مولانا آزاد کو انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا اور لسان الصدق کو انجمن کا ترجمان بنا لیا تھا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

> ''اس زمانے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اردو قائم ہو چکی تھی اور مولانا شبلی مرحوم اس کے ناظم تھے۔ انجمن ہی کے سلسلے میں میں نے ان سے خط و کتابت کی تھی اور انھوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا شائق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا۔ ...لسان الصدق کے خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گئے یعنی ترقی اردو اور اصلاح رسوم، اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اس کی دلچسپی دیکھ کر اسے اپنا آرگن قرار دے دیا تھا اور مولانا (شبلی) مرحوم، انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دلچسپ باتیں ہوتی تھیں، انھیں سب سے پہلے اس میں اندراج کے لیے بھیج دیتے تھے اور تمام ممبران انجمن کے نام ایک اطلاع شائع کر دی تھی کہ اس پرچے کو ضرور منگوائیں۔ اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہو گئی تھی۔''

(آزاد کی کہانی .... ص ۳۰۴)

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ لسان الصدق میں انجمن سے متعلق خبریں، انجمن کی رپورٹ، انجمن کے منصوبے اور اس کے نتائج پر تبصرہ، انجمن کی کارگزاری اور حضرت علامہ شبلی مرحوم کی علمی سرگرمیوں کا شروع ہی سے ذکر آتا رہا اور جب تک علامہ حیدرآباد میں رہے اور انجمن کی سرگرمیاں

جاری رہیں اور حضرت علامہ کا ان سے تعلق رہا۔ تقریباً اسی زمانے تک لسان الصدق جاری رہا اور جب حضرت علامہ حیدرآباد کے صیغۂ علوم وفنون سے سبک دوش ہو کر لکھنؤ آگئے تو لسان الصدق اس سے پہلے بند ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ تقریباً دو برس تک اُردو ادب کی ترقی اور اُردو زبان میں بہترین علمی وادبی اضافے کی پرجوش تحریک میں حضرت علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی شرکت اور مقاصد کے سفر میں دونوں کی رفاقت رہی تھی، لیکن ابھی تک دونوں کی ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

لسان الصدق کی اشاعت ہی کے زمانے میں ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے علمی ترجمان الندوہ کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ الندوہ کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنی کہانی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

مولانا شبلی سے ملاقات:

یہ دور جس کا ذکر کیا ہے، مولانا آزاد کا شبلی سے تعارف اور مراسلت کا زمانہ تھا۔ ملاقات کا زمانہ مولانا آزاد نے ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء لکھا ہے۔ ایک موقع پر فرمایا:

> ”مولانا شبلی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا۔ جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا، تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں میں خود ہوں۔“

(آزاد کی کہانی.... ص ۳۱۳)

یہ زمانہ لسان الصدق کی اشاعت کا زمانہ ہے، اس لیے کہ لسان الصدق کے ایڈیٹر کا اتنا کم عمر ہونا حالی مرحوم کی حیرت کا باعث ہوا تھا اور یہی امر حضرت شبلی کے لیے بھی تعجب کا موجب تھا کہ لسان الصدق جیسے سنجیدہ علمی ادبی رسالے کا ایڈیٹر اتنا کم عمر بھی ہو سکتا ہے۔

وسعتِ مطالعہ کا اثر:

اس پہلی ملاقات کے بعد مولانا آزاد کے وسعتِ مطالعہ کے مظاہر سامنے آئے تو حضرت

شبلی کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ مولانا آزاد بیان فرماتے ہیں:

''اس کے بعد جب مولانا شبلی مرحوم سے بمبئی میں ملاقات ہوئی اور میں نے مخصل کا ذکر کیا تو ان کو بہت ہی استعجاب ہوا۔ اس وقت تک مولانا کی نظر سے وہ نہیں گزری تھی اور اس کے انطباع کی بھی انھیں خبر نہ تھی۔ لیکن اس حسن ظن کی وجہ سے جو ان کو صاحب سے تھا شیل عفت مشرقیہ شیخ (الرئیس) کے، اس کا بھی ان کو نہایت اشتیاق تھا۔ پہلے تو انھوں نے عرصے تک اسے تسلیم ہی نہیں کیا کہ جس چیز کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ اُنھی کی مطلوبہ مخصل ہے۔ لیکن جب میں نے اس کے مباحث پر بطور تقریر بہت سے مطالب بیان کیے اور پھر دوسرے دن انھیں مطبوعہ نسخہ بھی دے دیا تو میری نسبت انھیں بہت اچھا خیال پیدا ہوا اور استغراب کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اگرچہ ان کے توقعات مخصل سے پورے نہ ہوئے۔''

(آزاد کی کہانی ...ص ۲۲۸)

ایک اور صحبت میں مولانا نے فرمایا:

''جب چند دنوں میں گفتگو وصحبت سے انھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہوگیا، تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔ بار بار کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ تم اگر کسی طرح حیدر آباد آسکو تو الندوہ اپنے متعلق کرلو، اور وہاں مزید مطالعہ وترقی کا بھی موقع ملے گا۔

ایک دن میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال نکال کے دیکھ رہے تھے۔ اس میں خدنگ نظر کا ایک مجموعہ نکل آیا۔ اس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ اس میں ایک مضمون ایکس ریز کی ایجاد وحقیقت پر تھا۔ انھوں نے کہا، جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو کیوں اس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو؟ تم سے تم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو۔

سب سے زیادہ مولانا شبلی پر میرے شوق مطالعہ اور وسعت مطالعہ کا اثر پڑا۔ اس

> وقت تک میرا مطالعہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ عربی کی تمام نئی مطبوعات اور نئی تصنیفات تقریباً میری نظر سے گزر چکی تھیں اور بہتیری کتابیں ایسی بھی تھیں کہ مولانا ان کے شائق تھے اور انھیں معلوم نہ تھا کہ چھپ گئی ہیں، مثلاً محصل امام رازی جس کا ذکر آچکا ہے۔“

(آزاد کی کہانی......: ص ۱۲ـ۳۱)

اسی زمانے میں چند اور ایسے مواقع پیش آئے جن سے حضرت شبلی مرحوم بہت متاثر ہوئے اور ان کی رائے مولانا آزاد کے بارے میں بہت اچھی ہو گئی۔ ایک واقعے کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

> ”پٹنہ کے ایک شخص، علی محمود جن کا انتقال ہو چکا ہے، اس وقت بمبئی میں تھے اور وہ بھی برابر مولانا سے ملنے کے لیے جایا کرتے۔ ایک دن میں اس ہوٹل میں گیا جہاں مولانا ٹھہرے ہوئے تھے، تو دیکھا کہ ایک بحث بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہے۔ علی محمود سے شاید مولانا نے کہا تھا کہ فن مناظرہ کی ناواقفیت کی وجہ سے لوگوں کی گفتگو کس قدر بے اسلوب ہوتی ہے اور انھوں نے بتلایا تھا کہ رشیدیہ اس میں اچھا متن ہے، وہ لے کر آئے تھے۔ ایک اور مولوی نظام الدین پنجاب کے تھے، وہ بھی پہنچ گئے تھے اور اس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ رشیدیہ کے بعض مطالب، مولانا علی محمود کو سمجھانا چاہتے ہیں، لیکن مولوی مذکور بار بار الجھ پڑتا ہے۔ اور ہر چند وہ سمجھاتے ہیں، لیکن کج بحثی بڑھتی جاتی ہے۔ میں بھی ایک دو موقع پر بول اٹھا اور پھر مولوی نظام الدین کو مخاطب کر کے میں نے بعض باتیں جو مابہ النزاع ہو رہی تھیں، کہیں۔ اس پر مولانا شبلی میری طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ اپنی تقریر پوری کرو! میں نے اس حصۂ کتاب پر ایک اچھی خاصی بسیط تقریر کر ڈالی۔ اس وقت مجھے درسیات خوب مستحضر تھیں۔ نیا نیا پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہوا تھا۔ اعتراضات اور ان کی بحثیں بھی بار بار سمجھ چکی تھیں۔ میں نے بڑی زوردار تقریر کی اور اگرچہ کچھ بھی نہ تھی، لیکن مولانا شبلی مرحوم اس درجے متاثر ہوئے کہ بار بار

> تعریف کرتے اور کہتے کہ تمہارا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے۔ تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک عجوبے کے پیش کرنا چاہیے۔"

(آزاد کی کہانی ... ص ۱۲-۳۱۲)

الندوہ کی سب ایڈیٹری:

اس کے ساتھ ہی الندوہ کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے ان کا اصرار بہت بڑھ گیا۔ دو تین ہفتے کے قیام بمبئی کے بعد مولانا شبلی حیدرآباد روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۹۰۴ء کے اواخر یا ۱۹۰۵ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ اب مولانا نے حضرت مولانا شبلی کی پیش کش کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا اور اس وقت کے جو حالات تھے، ان میں یہی فیصلہ کیا کہ اسے قبول کر لینا چاہیے اور حضرت علامہ شبلی کی جو صحبت میسر آتی ہے اس سے ضرور فایدہ اٹھانا چاہیے۔ گذشتہ بیان کے تسلسل ہی میں فرماتے ہیں:

> "میرا خیال ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا مرحوم کی رائے میری نسبت اچھی قائم ہوئی اور پھر ان کی شفقت و بزرگی کی وجہ سے ہمیشہ بڑھتی ہی گئی۔ دو تین ہفتے کے بعد وہ حیدرآباد واپس چلے گئے اور وہاں سے برابر خط بھیجتے رہے کہ میں حیدرآباد آؤں۔ اس زمانے میں جیسا کہ کسی دوسرے موقعے پر کہوں گا، میرے خیالات اور خیالات کی وجہ سے حالات ایسے ہو رہے تھے کہ گھر کی زندگی سے جو کئی سال پہلے دل برداشتگی ہوئی تھی، وہ اب تک باقی تھی، اور اس لیے خیال ہوتا تھا کہ یہ اچھا موقع ہے ایک ایسے شخص کی صحبت ہاتھ آتی ہے، چلا جانا چاہیے لیکن بعض اور وابستگیاں، اس وقت کی زندگی کی ہوس پرستیوں سے ایسی پیدا ہوئی تھیں کہ قدم روک لیتی تھیں۔
>
> اس اثنا میں مولانا مرحوم نے استعفا دے دیا اور مجھے لکھا کہ اب میں بقیہ عمر ندوے کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں اور اعظم گڑھ ہو کر لکھنؤ جاؤں گا۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ میں اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہیں

مولانا کا خط مجھے ملا تھا۔ اعظم گڑھ سے انھوں نے پھر خط لکھا اور اصرار کیا کہ اب زیادہ اچھا موقع ہے لکھنؤ میں آکر رہو تو حیدر آباد سے بھی بڑھ کر یہ بہتر ہوگا۔

اس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کر لیا اور لکھنؤ پہنچ گیا، لیکن لکھنؤ میں مولوی حفیظ اللہ سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر کی علالت کی خبر سن کر پھر اعظم گڑھ چلے گئے ہیں اور ان کا تار آچکا ہے کہ اگر ہو سکے تو خود اعظم گڑھ جاؤ، چنانچہ اعظم گڑھ گیا (۲) عجیب اتفاق جس دن پہنچا اسی دن ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہاں سے ہم ایک ساتھ لکھنؤ واپس آئے اور میں ندوے ہی میں ٹھہر گیا اور الندوہ کی ایڈیٹری انھوں نے میرے متعلق کر دی۔ تقریباً سات آٹھ مہینے وہاں قیام رہا۔"

(آزاد کی کہانی ص ۳۱۲۔۳۱۳)

الندوہ سے تعلق کی وجہ:

مولانا ابوالکلام نے الندوہ کی ادارت کیوں قبول کی تھی؟ اس پر مولانا ہی کے بیان سے روشنی پڑتی ہے۔ علامہ شبلی سے ملاقاتوں میں ان کی رائے مولانا ابوالکلام کے بارے میں روز بہ روز پختہ ہوتی گئی اور ان کی شفقت بھی ان کی بزرگی کی وجہ سے بڑھتی گئی۔ ابوالکلام کی رائے حضرت علامہ کے بارے میں شروع سے بہت اچھی تھی اور لسان الصدق کے زمانے میں یہ رائے پختہ ہو گئی تھی۔ اب جب کہ انھوں نے ابوالکلام کو زبانی اصرار کے بعد خط لکھا کہ اب وہ خود بھی لکھنؤ میں قیام کا فیصلہ کر چکے ہیں، وہ (ابوالکلام) بھی لکھنؤ آجائیں اور الندوہ کی ادارت کریں، ابوالکلام اس پیش کش کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"بمبئی میں قیام و ملاقات کے دو تین ہفتے کے بعد وہ حیدر آباد واپس چلے گئے اور وہاں سے برابر خط بھیجتے رہے کہ میں حیدر آباد آؤں۔ اس زمانے میں ... میرے خیالات اور خیالات کی وجہ سے حالات ایسے ہو رہے تھے کہ گھر کی زندگی سے جو کئی سال پہلے دل برداشتگی ہوئی تھی، وہ اب تک باقی تھی اور اس لیے خیال ہوتا تھا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ ایک ایسے شخص کی صحبت ہاتھ آتی ہے، چلا جانا چاہیے۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ والد سے بعض خیالات میں اختلاف کی بنا پر گھریلو زندگی

سے جو دل برداشتگی ہو گئی تھی اور طبیعت کا جو اطمینان اور سکون ختم ہو گیا تھا، ضروری تھا کہ کوئی مامن اور بزرگ شفیق ہو جس کی صحبت اور سرپرستی میں دل کا کھویا ہوا سکون اور جمعیت خاطر میسر آ سکے۔ علامہ شبلی سے ملاقاتوں میں انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی بزرگانہ صحبت میں یہ مقصد پورا ہو سکتا ہے اور علمی ذوق کی تسکین بھی میسر آ سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم کا دور ختم ہو چکا تھا اور مطالعہ و نظر کے جس مقام پر تھے، تربیت حاصل کرنے کے خیال سے بے پروا ہو چکے تھے۔

محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے اس میں ایک نکتے کا اضافہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "علامہ شبلی پر گوناگوں علمی، تعلیمی اور قومی کاموں کے ساتھ الندوہ کی ادارت کی تکمیل ذمے داری کا بوجھ بھی تھا۔ اس کو کم کرنے اور مولانا آزاد کی علمی تربیت کے خیال سے باصرار انھیں لکھنؤ بلالیا۔ مولانا آزاد نے بھی اپنے علمی ذوق و شوق کی وجہ سے اس پیش کش کو منظور کر لیا۔"

مولانا ابوالکلام نے حضرت علامہ شبلی کی صحبت سے بہت فیض اٹھایا تھا اور اس کا خود مولانا نے اعتراف کیا ہے۔ لیکن دوسری بات شبلی نے کہی، نہ ابوالکلام کے قلم سے نکلی اور کسی اور کے بیان سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ حضرت سید صاحب، مولانا عبدالسلام، مولانا مسعود علی، ضیاء الحسن علوی وغیرہم حضرت علامہ شبلی سے جتنے قریب و عزیز تھے، معلوم ہے، اور ابوالکلام سے اتنے قریب اور واقف تھے کہ اس دور کا اور الندوہ میں قیام کی اصل حقیقت کا اتنا واقف کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ماحول کی حضرت شبلی اور ابوالکلام کی کوئی بات ان کے حوالے کے بغیر تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

ضیاء الحسن علوی نے پہلی بات کو اس طرح بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "علامہ (شبلی) بمبئی سے واپس ہوئے تو الندوہ کے کام کے متعلق مشورت ہوئی کہ بغیر کسی مددگار کے یہ کام اب دشوار ہو گیا ہے۔ علامہ کو پسند نہ تھا کہ ہم تعلیم کی راہ سے بھٹکیں اور ابھی سے زیادہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو جائیں۔ جو بات علامہ نے فرمائی، وہ میرے دل کو لگی، یعنی ہمارے دوست مولانا ابوالکلام آزاد کا تقرر اس جگہ پر ہو گیا۔"

علوی صاحب نے کچھ اور بھی لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان کو تنخواہ بھی ملتی تھی

لیکن انھیں اس کی بالکل پروا نہ تھی۔ اگر ان کا یہ مقصد ہوتا تو اس کی برابری کے نیے باپ کی مسند ارشاد و تعلیم بہت بڑا ذریعہ تھا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

> "اس میرے یار (ابوالکلام) کو روپے کی طلب اور طمع تو تھی نہیں، گھر بیٹھتا تو کھانے کو بہت تھا اور...... خاندانی مسند ارشاد و تعلیم پر بیٹھ کر دست غیب سنبھالتا تو پیر مغان تو بن ہی جاتا، مگر اس کو مولانا کے پاس رہ کر انھوں نے ایک وظیفہ اپنی تعلیمی ترقی کے لیے سمجھا اور علمی عیاشی اور بے رہ باشی میں وقت کٹنے لگا۔"

(ابوالکلام آزاد: مرتبہ عبداللہ بٹ، لاہور، ۱۹۴۲ء، ص ۱۰۳)

زمانۂ ادارت میں قیام:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے حوالے کے ساتھ یہ بات بھی لکھی ہے کہ الندوہ کی ادارت کے زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا قیام گولا گنج کی اسی عمارت میں تھا جہاں ندوہ کا دفتر تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "...... ایسے متعدد اشخاص تھے جنھوں نے مولانا آزاد کو (ان کے) آغاز شباب میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ رسالہ "الندوہ" کے معاون مدیر کی حیثیت سے پرانے ندوہ میں (جو گولا گنج کی اس عمارت میں تھا جس کو اب خاتون منزل کہتے ہیں......) مقیم تھے اور علامہ شبلی کی علمی صحبتوں سے استفادہ کرتے تھے۔"

(پرانے چراغ، ص ۴۴)

اسی طرح الندوہ سے تعلق کا خاتمہ کب ہوا، یہ بات بھی صاف نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام کا مرتب آخری پرچہ مارچ ۱۹۰۶ء کا ہے جو روایت کے مطابق مارچ کے پہلے ہفتے میں شائع بھی ہو گیا ہوگا۔ اس لیے اس کی اشاعت کے انتظار میں ٹھہر جانے کی بات ہو تو سمجھ میں آ سکتی ہے لیکن اس کے بعد ۳۰ مئی تک تو وہ ضرور ٹھہرے ہوئے تھے، مگر کیوں؟

اس سوال کا جواب باقی ہے۔

حواشی

۱۔ احمد شاہ شایق نے ''امہات المومنین'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ تحفۂ احمدیہ کان پور میں اس کے رد میں ایک مضمون شایع ہوا تھا۔ امہات المومنین کے مصنف نے اس کے کسی جملے پر عدالت میں ہتک عزت کا مقدمہ دایر کر دیا۔ عدالت نے مصنف کے حق میں فیصلہ کر دیا جس کے نتیجے میں تحفۂ احمدیہ (کان پور) بند ہو گیا۔ اس رسالے کی جگہ مولانا محمد علی مونگیری بانی و ناظم اعلیٰ ندوۃ العلماء نے ''تحفۂ محمدیہ'' کے نام سے نیا پرچہ جاری کر دیا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی احمد حسن فتح پوری تھے۔ کلکتہ آنے کے بعد اس رسالے کا اس کے پہلے نام (تحفۂ احمدیہ) سے احیاء کیا جو کچھ عرصے نکلتا رہا تھا۔

۲۔ علامہ شبلی حیدرآباد میں تھے کہ ان کی (دوسری) بیوی کے بطن سے بیٹا پیدا ہوا (۱۹۰۳ء)۔ مہدی افادی کے نام خط میں اپنی خوشی اور دل بستگی کا اظہار فرماتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں حیدرآبادی ذمے داری سے سبک دوش ہو کر آئے تو لکھنؤ میں اہل و عیال کے ساتھ قیام کیا۔ یہاں بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اہلیہ کو اعظم گڑھ پہنچا دیا۔ لیکن خود لکھنؤ میں قیام رکھا۔ بیٹے کے غم نے انھیں نڈھال اور بیمار کر دیا تھا۔ ۳؍ ستمبر ۱۹۰۵ء کو خط بنام مولانا حمید الدین فراہی میں اہلیہ کی سخت بیماری اور شفا سے مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اسی ماہ کے آخر تک حالت مزید بگڑ گئی۔ اطلاع ملی تو اعظم گڑھ گئے۔ انھی دنوں میں مولانا آزاد لکھنؤ پہنچنے والے تھے۔ ہدایت کر دی تھی کہ اگر وہ آ جائیں تو انھیں اعظم گڑھ بھیج دیا جائے! چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اعظم گڑھ سے لکھنؤ آئے تو مولانا آزاد ان کے ساتھ تھے۔ اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

حضرت علامہ کی اہلیہ کے انتقال کی تاریخ کا مجھے پتا نہیں چل سکا۔ اگر مرحومہ کی تاریخ انتقال معلوم ہو جاتی تو اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا کہ الندوہ سے ضابطے کا تعلق کب پیدا ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق مولانا آزاد ستمبر ۱۹۰۵ء کے وسط تک لکھنؤ پہنچ گئے تھے اور ۲۰؍ مئی ۱۹۰۶ء تک وہ ندوہ میں موجود تھے۔ البتہ بمبئی جانے کے لیے بالکل آمادہ تھے۔ مولانا محمد یوسف رنجور جعفری عظیم آبادی کے نام ۲۰؍ مئی کے خط میں لکھتے ہیں:

> ''آپ لکھنؤ تشریف لاتے ہیں، دیدہ و دل فرش راہ! میرا ارادہ تھا اور قطعی ارادہ کہ پرسوں بمبئی چلا جاؤں اور وہاں ایک ماہ رہ کر امرتسر کا رخ کروں۔ لیکن اگر آپ تشریف لاتے ہیں تو قیام ضروری ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ٹھہر جاتا ہوں، آیئے اور ضرور آیئے، اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے کہ تین سال کی غیبت کبریٰ لکھنؤ کی بدولت عشرۂ مبارک میں ختم ہو جائے۔''

(۲)

الندوہ اور ابوالکلام

(۱۹۰۵-۶ء)

جیسا کہ عرض کیا، مولانا ستمبر ۱۹۰۵ء میں کسی وقت لکھنؤ پہنچ گئے تھے۔ مولانا نے اپنے پہنچنے کی تاریخ سے یقیناً حضرت شبلی کو مطلع کر دیا ہوگا اور وہ ان کے انتظار میں تھے۔ اچانک اہلیہ کی شدید علالت کی خبر آئی اور وہ اعظم گڑھ چلے گئے۔ اور یہاں کہہ گئے کہ ابوالکلام آ جائیں تو انھیں اعظم گڑھ بھیج دیا جائے اور پھر اعظم گڑھ پہنچ کر بھی خط لکھوایا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں مولانا کا کتنی شدت سے انتظار تھا۔ چنانچہ جوں ہی مولانا لکھنؤ پہنچے اور حضرت علامہ کے بارے میں معلوم کیا، انھیں بتلایا گیا کہ وہ اعظم گڑھ چلے گئے ہیں اور انھیں وہیں بلایا ہے۔ مولانا آزاد بھی اسی وقت یا دوسرے روز اعظم گڑھ روانہ ہو گئے اور چند دن کے بعد حضرت علامہ کے ساتھ ہی لکھنؤ لوٹے۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء سے انھوں نے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ اس دور کے حضرت علامہ شبلی کے دو خط مولانا ابوالکلام کے نام یادگار اور مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) میں درج ہیں۔ الندوہ میں مولانا آزاد کا پہلا مضمون نومبر میں فرید وجدی مصری کی کتاب المراۃ المسلمہ پر تبصرے کی پہلی قسط تھی، جو نومبر میں شائع ہوئی تھی۔ یقین ہے کہ اس کتاب پر تبصرے کا فیصلہ حضرت علامہ سے مشورے کے بعد ہی کیا ہوگا۔ تبصرہ لکھ کر انھیں دیکھنے کے لیے دیا کہ وہ اس پر ایک نظر ڈال لیں۔ حضرت علامہ کے ایک رقعے سے اس بات کا پتا چلتا ہے۔ مکاتیب شبلی (حصہ اوّل) میں مولانا آزاد کے نام شبلی کا القاب و آداب اور سلام سے مبرا پہلا خط دراصل یہی پرچہ ہے، جس پر ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء تاریخ درج ہے۔ پرچہ نویس فرماتے ہیں:

"مضمون واپس ہے الندوہ میں درج ہونے کے لیے دے دیجیے" ... الخ

(مکاتیب شبلی، ص ۲۶۳)

دوسرا خط الندوہ کے بارے میں ہدایت پر مشتمل، مولانا آزاد کے ایک خط کے جواب میں بھوپال سے بھیجا گیا تھا۔ ۲۸/ اکتوبر کا یادگار ہے۔ القاب و آداب تو اس میں بھی نہیں لیکن خط کا خاتمہ "سلام" پر ہوا ہے۔ حضرت علامہ لکھتے ہیں:

"خط پہنچا ایک مضمون آج بھیجا ہے" ....الخ۔ (ایضاً ص ۲۶۳)

الندوہ میں مولانا آزاد کے مضامین:

اگرچہ لکھنؤ میں مولانا ابوالکلام کے قیام کا پتا مئی کے آغاز تک چلتا ہے لیکن الندوہ میں ان کے مضامین صرف نومبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۶ء میں نظر آتے ہیں۔ ان میں تین قسطوں پر مشتمل المرأۃ المسلمہ پر ایک تبصرہ ہے، جو نومبر، دسمبر ۱۹۰۵ء اور فروری ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا ہے۔ دوسرا مستقل عنوان "علمی خبریں" تھا، جو دسمبر ۱۹۰۵ء اور جنوری و مارچ ۱۹۰۶ء میں نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ مولانا کے دو مضمون اور شائع ہوئے۔ یہ تینوں مضمون فروری ۱۹۰۶ء کے ایک ہی شمارے میں چھپے ہیں:

۱۔ ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت ص ۱ تا ۶
۲۔ تیسرا مضمون المرأۃ المسلمہ ص ۶ تا ۲۴
۳۔ القضاء فی الاسلام ص ۲۵ تا ۳۲

المرأۃ المسلمہ کی تیسری قسط ہے اور اسی پر رسالے کی مقررہ ضخامت (۳۲ صفحات) پوری ہو جاتی ہے:

مارچ ۱۹۰۶ء میں مولانا کا ایک مضمون تیرہ صفحات پر مشتمل یورپ میں گونگوں کی تعلیم کے موضوع پر ہے۔ اس دور کے بعد جب کہ الندوہ سے مولانا کا ادارتی تعلق نہیں رہا تھا، ان کے دو مضمون اور شائع ہوئے:

۱۔ مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی اکتوبر ۱۹۰۸ء ص ۲۷ تا ۲۹
۲۔ ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہ مقصود اپریل ۱۹۱۰ء ص ۲۱ تا ۳۹

اب ہم ان مضامین کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

۱۔ المرأۃ المسلمہ:

مولانا ابوالکلام کے مضامین میں، جس نے الندوہ میں سب سے پہلے جگہ پائی تھی، فرید وجدی کی کتاب المرأۃ المسلمہ پر تبصرہ تھا۔ یہ تبصرہ تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون طویل بھی ہے اور اہم بھی ہے! قاسم امین بک نامور مصری مصنف کی کتابیں المرأۃ (عورت) اور المرأۃ الجدیدہ (نئے زمانے کی عورت) شائع ہوئیں اور جس آزاد خیالی اور بے باکی سے اس نے قلم اٹھایا تھا، اس سے آزاد خیال یا مغربی تہذیب کے شائقین میں ایک جوش اور اس کے اختیار کے لیے سرگرمی اور بے باکی کی ایک لہر دوڑ گئی، لیکن جو اسلامی تہذیب کے دل دادہ تھے یا مغربی تہذیب کے اختیار میں اتنی دور تک جانے کے لیے تیار نہیں تھے، ان کے ذہنوں میں اس آزادی کے نتیجے میں خواتین کی پاکیزگی اور عورتوں کے تقدس کی تباہی کے خطرات تھے، وہ سخت بے چین ہوئے۔ فرید وجدی مصر کے دوسرے مصنف تھے جو آزادی کی اس تحریک کے نتائج سے خوف زدہ ہوئے۔ ان کے خیال میں مشرقی تہذیب میں اصلاح کی ضرورت تھی اور اس سلسلے میں دوسری تہذیبوں سے استفادہ بھی کیا جا سکتا تھا لیکن اپنی تہذیب کو قطعاً ترک کر دینے اور دوسری تہذیب کلیتہً اختیار کر لینے کا ان کے خیال میں کوئی جواز نہ تھا۔ مشرقی تہذیب کا اپنا ایک حسن ہے اور خوبیوں سے مبرا نہیں اور مغربی تہذیب میں اگر کوئی خوبیاں ہیں تو ان سے استفادے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی تہذیب کلیتہً اختیار کی جائے تو اولاً ہمیں اپنی تہذیب کی خوبیوں سے دست بردار ہونا پڑے گا ثانیاً اختیار کی جانے والی تہذیب کی خرابیوں سے ہم اپنی زندگی کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ انھوں نے غور و فکر کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے قاسم امین بک کے جواب میں ایک کتاب لکھی، جسے عربی دنیا میں بہت پسند کیا گیا۔ ان کے خیالات نہایت متوازن اور مدلل تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ شبلی ان لوگوں میں سے تھے جو جدید عربی لٹریچر پر بھی نظر رکھتے تھے۔ فرید وجدی کی کتاب ''المرأۃ المسلمہ'' خواہ کسی نے حاصل کی ہو لیکن وہ ان کی گفتگو کا موضوع ضرور بنی ہوگی۔ اس پر تبصرے کے فیصلے میں دونوں شریک رہے ہوں گے۔ اور الندوہ میں اس کی قسط وار اشاعت اولاً اس کے مطالب اور ان کی افادیت سے اتفاق اور ثانیاً الندوہ میں علامہ شبلی کی رضامندی کے بغیر تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ مطالب کی افادیت سے اتفاق اور

اشاعت کی اہمیت کے اعتراف کو محض فرض نہیں کر لیا گیا ہے، بلکہ یہ واقعہ ہے کہ یہ سلسلہ ان کے نزدیک النّدوہ کے بہترین مضامین میں شمار ہوا۔ مولانا شبلی نے اپنے پسندیدہ اور قابلِ التفات مضامین کی جو فہرست بنائی تھی اس میں سترھواں مضمون "المرأۃ المسلمہ پر ریویو" ہے (حیاتِ شبلی: ص ۴۴۲) حضرت سید صاحب نے اس کی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "مولانا ابوالکلام نے النّدوہ میں..... "المرأۃ المسلمہ" کے نام سے..... فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردے پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا، جو النّدوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے۔ یہی وہ سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا۔" (حیاتِ شبلی: ص ۴۴۳)

ان بیانات سے نہ صرف شبلی کی پسندیدگی کا پتا چلتا ہے بلکہ حضرت سید صاحب کی اچھی رائے اور اس جانب علمی دنیا کا التفات بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مولانا آزاد کا یہ تبصرہ نومبر اور دسمبر ۱۹۰۵ء اور فروری ۱۹۰۶ء میں النّدوہ کی تین اشاعتوں میں چھپا تھا۔ آخری قسط کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ تبصرے کے چند مباحث اور بھی ہیں جو آیندہ شائع ہوں گے۔

لیکن اس کے بعد نہ اس سلسلے کی کوئی قسط چھپی اور نہ اس موضوع پر النّدوہ میں کوئی مضمون ہی شائع ہوا۔ مولانا آزاد کا یہ تبصرہ، جو المرأۃ المسلمہ کے نام سے چھپا تھا، النّدوہ میں اس کی اشاعت پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے۔ کتابی صورت میں اس کا پہلا ایڈیشن "وکیل بک ایجنسی" امرتسر سے اس کی اشاعت النّدوہ کے قریبی زمانے میں "مسلمان عورت" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ۱۹۴۰ء خصوصاً ۱۹۴۲ء کے بعد ابوالکلام کے مطالعے کا جو دور برِ اعظم ہند و پاکستان میں شروع ہوا تھا، اس زمانے سے اب تک اس کتاب کی دونوں ملکوں سے بیسیوں اشاعتیں نکل چکی ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت میں آج تک فرق نہیں پڑا۔

ہفتہ وار الکلام پٹنہ میں مولانا محمد یونس خالدی کا ایک مضمون "امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے افاداتِ علمیہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے لکھا تھا:

> "راقم الحروف نے آخر ۱۹۵۲ء میں "مضامین النّدوہ" کے جمع و ترتیب اور

> اشاعت کا ارادہ کیا۔ اس میں "المرأۃ المسلمہ" کی وہ تین قسطیں بھی تھیں ۔۔۔۔ میں نے اس اشاعت کے لیے ۹؍ نومبر ۱۹۵۲ء کو اجازت چاہی۔ اس کے جواب میں ۱۲؍ نومبر ۱۹۵۲ء کو محترم محمد اجمل صاحب نے تحریر فرمایا، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ یہ مضامین پندرہ سولہ برس کی عمر میں لکھے گئے تھے، ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں میری رائے بدل گئی ہے اور بہت سی باتیں اب میں صحیح نہیں سمجھتا، لہٰذا ان کے چھپوانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

(کلام۔ پٹنہ: ۷؍ مارچ ۱۹۵۸ء، ص ۱۲)

اسی مضمون میں ان تحریرات کی اشاعت کے مقصد کے بارے میں خالدی صاحب لکھتے ہیں:

> "یہ (مولانا کا) ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۶ء کا کارنامہ ہے جب کہ مولانا کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس لیے مولانا آزاد کے انداز نگارش کے تدریجی ارتقا کے مطالعے کے وقت اس کتاب کا سامنے ہونا بہت ضروری ہے۔" (ایضاً)

میرے خیال میں انداز نگارش کے تدریجی ارتقا کے مطالعے ہی کے لیے نہیں بلکہ مولانا کے ذہن اور افکار کے ارتقائی مطالعے کے لیے بھی یہ نہایت ضروری ہے۔

الندوہ میں المرأۃ المسلمہ پر تبصرے کے تین نمبر شائع ہوئے، جن کے مجموعی ۴۶ صفحات ہیں لیکن یہ تبصرہ مکمل نہیں ہے۔ مولانا کے خود بیان کے مطابق ایک اہم بحث باقی تھی۔ تیسرے نمبر کے اختتام پر مولانا لکھتے ہیں:

> "ہمارا ارادہ تھا کہ ریویو کو اس نمبر پر ختم کر ڈالیں، مگر ابھی ایک ضروری بحث باقی ہے، یعنی یورپ میں درحقیقت متمدن عورتوں کا کیا حال ہے؟ آزادی ان کو ترقی کی طرف لے جا رہی ہے یا تنزل کی طرف؟ مگر اس مضمون کو یہاں ختم کر دیتے ہیں۔ آیندہ نمبر میں ایک مستقل عنوان سے اس پر نظر ڈالیں گے۔"

مضمون کا یہ تیسرا نمبر فروری ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد مارچ کا شمارہ بھی مولانا کی ادارت میں نکلا، لیکن اس میں اس سلسلے کی کوئی بحث نہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

اب یہ تبصرہ مولانا نے لکھ کر نہیں رکھ لیا تھا بلکہ وقت کے وقت لکھتے تھے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ

۲۔ مولانا نے تبصرہ لکھ تو لیا ہو لیکن اسی زمانے میں چوں کہ وہ لکھنؤ چھوڑنے کا فیصلہ بھی کر چکے تھے اس لیے اپنے جانے کے بعد الندوہ میں اس کی اشاعت مناسب نہ سمجھی ہو۔

۳۔ اگر تبصرہ کر لیا تھا تو ساتھ لے گئے اور نہ کیا تھا تو امرتسر جانے کے بعد اسے مکمل کیا اور وہیں وکیل بک ایجنسی سے اس کی کتابی اشاعت کا انتظام کر دیا۔

کتابی شکل میں جو تبصرہ شائع ہوا وہ زبان و بیان کی اصلاح اور ترتیب و تدوین کی درستگی کے بعد اور الندوہ میں مطبوعہ تبصرے سے چند گنا زیادہ طویل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ الندوہ میں تبصرے کی تینوں قسطوں کی ضخامت جو ۳۶ صفحوں تک پہنچی تھی اور کتاب کے ۱۶/۳۰×۲۰ سائز کے ۶۵ صفحوں میں آ گئی تھی، کتابی شکل میں تبصرے کے دیگر پہلوؤں کی تکمیل و احاطے کے بعد ۲۳۸ صفحوں تک دراز ہو گئی ہے۔

مرحوم محمد یونس خالدی کے مقالے کے مطالعے سے پتا چلا کہ کتابی اشاعت کے وقت مضمون میں تبدیلیاں جو کی گئیں ان کا مقصد یہ تھا کہ مضمون کی اصلی نوعیت ''تبصرہ'' کا اس پر گمان نہ ہو، بلکہ اصل کتاب ''المرأۃ المسلمہ'' کا ترجمہ معلوم ہو۔ یہ تبدیلیاں خوب سے خوب تر کی جستجو کے عمل کے سوا اور کچھ نہیں! الندوہ اور کتاب کے متن دونوں سامنے ہوں تو اس امکان کا شبہ پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں دو باتیں اور عرض کروں گا:

۱۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ المرأۃ المسلمہ کا ترجمہ مولانا آزاد نے پہلے کر لیا تھا، اس کتاب پر تبصرہ علامہ شبلی کے کہنے پر کیا تھا۔ ان کے خیال میں وکیل بک ایجنسی امرتسر میں ترجمہ چھپا تھا، تبصرہ نہیں۔ تبصرہ الندوہ میں چھپا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''المرأۃ المسلمہ'' پر مولانا نے تبصرہ ہی لکھا تھا اور الندوہ میں چھپا تھا، وہی تبصرہ تکمیل کے بعد وکیل بک ایجنسی سے شائع ہوا۔ البتہ جو حصہ الندوہ میں اشاعت سے رہ گیا تھا، امرتسر ایڈیشن کے لیے وہ مکمل کر لیا گیا تھا۔

۲۔ یہ بیان بھی نظر سے گزرا ہے کہ امرتسر سے کتاب پہلے چھپی تھی۔ یہ بات بھی اس طرح نہیں ہے۔ الندوہ میں تبصرہ اور امرتسری کتاب ایک ہی چیز ہے۔ البتہ تبصرے کی تکمیل کے بعد کتاب کی شکل میں اشاعت کے وقت الندوہ میں مطبوعہ حصے پر نظر ثانی کی گئی اور اصلاح اور بعض معمولی ترامیم کے بعد اسے شامل کیا گیا۔ ایک ترمیم یہی ہے کہ الندوہ کے پہلے نمبر میں مضمون کا جو تمہیدی حصہ ہے اسے الگ کر کے کتاب کا مقدمہ بنا دیا ہے۔ اہم مباحث کے جلی عنوان اور بعض ذیلی عنوان

قایم کر دینے میں بعض الفاظ بدل دیے ہیں، بعض کا املا بدل دیا ہے، بعض حوالے درست کر دیے ہیں، الندوہ میں بعض حوالے چھوٹ گئے تھے انھیں مکمل کر دیا گیا، لیکن مضمون وہی رہا ہے اور کہیں ایسا احساس نہیں ہوتا کہ کتاب پر تبصرے کو کتاب کا ترجمہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت:

یہ مضمون الندوہ کے شمارۂ فروری ۱۹۰۶ء میں اڈیٹوریل کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ اپنے موضوع پر ایک مستقل زندہ و جاوید مقالہ ہے اور ایک سو سال کے بعد بھی مقالے کی اہمیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ سائنس کے موجودہ دور میں عوام کی تربیت کے لیے کتب خانوں کی اہمیت جس قدر واضح ہوگئی ہے، اس کا تذکرہ بھی تحصیل حاصل ہے۔ قوم کے مختلف علمی و عملی طبقات کے لیے ان کے اصناف اور عمروں کے لحاظ سے مختلف سطح کی اور علوم وفنون کی تقسیم کے لحاظ سے بھی ہر شہر میں اور اس کے ہر علاقے اور ہر محلے میں لائبریریوں کے قیام کی اہمیت واضح ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا تو لائبریریوں کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یونیورسٹی کی سطح کے بعد بھی مختلف علوم وفنون کی تحقیقی لائبریریوں کے قیام کی ضرورت ختم نہیں ہو جاتی، اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ تعلیم کے بارے میں کسی قوم کا نقطۂ نظر اور ملک کی پالیسی معلوم کرنے کا نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ اس میں لائبریریوں کی تعداد معلوم کر لی جائے۔ اس کے اور بھی طریقے ہیں، مثلاً تعلیم کا بجٹ معلوم کر لیا جائے اور دفاع کے بجٹ سے اس کا موازنہ کر لیا جائے۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں بدصورت شکل بدصورت اور حسین شکل حسین ہی نظر آتی ہے۔ ایشیائی، افریقی ممالک میں یہ تناسب اتنا افسوس ناک ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا ابوالکلام نے مضمون میں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ پہلے تو کتب خانے کے قیام کی عمومی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کتب خانہ بانکی پور (خدا بخش لائبریری، پٹنہ) اور اس کے بانی کی علمی فیاضی کا ذکر کیا ہے۔ پھر ندوۃ العلماء میں کتب خانے کے قیام کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے اور ندوے کے قیام کے بعد اس سلسلے میں جن اصحاب ذوق و ایثار نے سبقت کی اور اپنے ذاتی کتب خانوں کے عطیات سے ایثار اور فیاضی کا ثبوت دیا ان کا ذکر کیا ہے، ان کے ذخیروں کے نوادر علمیہ پر سرسری روشنی ڈالی ہے اور اہل علم اور اصحاب وسایل کو ندوۃ العلماء میں ایک معیاری

کتب خانے کے قیام کی اہمیت پر توجہ دلائی ہے اور اس میں تعاون کرنے کی ترغیب دی ہے۔ یہ مضمون اپنی ضرورت اور نوعیت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ علامہ شبلی کے ایماء و مشورے سے لکھا گیا ہوگا۔ ندوے میں کتب خانے کے قیام کی ضرورت اور اہمیت پر حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں بھی لکھا ہے۔ مولانا آزاد نے اپریل ۱۹۱۰ء میں ''ندوۃ العلماء کا جلسۂ دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود'' میں بھی پرزور الفاظ و اسلوب میں اس مسئلے کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام کے خیالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مولانا کے یہ خیالات صرف اسی زمانے میں قایم نہ ہوئے تھے، بلکہ ۱۹۰۲ء میں جب وہ احسن الاخبار میں مضمون نگاری کرتے تھے اور انجمن اصلاح قایم کی تھی تو اس کے تحت ایک ریڈنگ روم اور لائبریری بھی قایم کی تھی۔ مولانا نے اس کا ذکر اپنی کہانی میں کیا ہے۔ آزادی کے بعد انھوں نے ہندوستان کی قدیم لائبریریوں کے جدید انتظامات اور نئی لائبریریوں کے قیام میں جو دلچسپی لی تھی وہ ہندوستان کی بہت بڑی خدمت اور اہم ضرورت تھی، اس میں خود ان کے ذوق کی تسکین کا سروسامان بھی تھا۔

۳۔ القضاء فی الاسلام:

فروری ۱۹۰۶ء کے الندوہ کا ایک اہم مضمون ''القضاء فی الاسلام'' ہے۔ یہ مضمون نہایت جامع ہے۔ الندوہ کے صرف آٹھ صفحوں میں سما گیا ہے لیکن موضوع کی اہمیت، اس کی تاریخ، اس کی ضرورت و پس منظر اور اہمیت، اس کے آداب و شرایط اور قاضی/ جج کی خصوصیات اور اطراف پر محیط ہے۔ اس کے دایرہ و مباحث کی طرف مولانا نے اشارہ کر دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ''اس مضمون میں ہم قانون کے حصۂ قضاءت سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور دکھلانا چاہتے ہیں کہ حضرت بانی اسلامؐ نے کس جامعیت کے ساتھ اس مسئلے پر نظر ڈالی اور کس خوبی اور شایستگی سے اس کے قواعد و قوانین ضبط کیے۔ اس بنا پر اس مضمون کے تین حصے ہوں گے:
>
> ۱۔ مدعی اور مدعا علیہ کے فرایض
>
> ۲۔ ثبوت دعوے کا طریقہ
>
> ۳۔ شہادت کے اصول''

چناں چہ اگلے صفحات میں انھی پہلوؤں کی تفصیل نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

الندوہ کا یہ شمارہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ تمام صفحات ابوالکلام کے تین مضامین نے گھیر لیے ہیں۔ "ندوۃ العلماء میں ایک کتب خانے کی ضرورت" صفحہ ۱ تا ۶؛ "المرأۃ المسلمہ" کی تیسری قسط صفحہ ۶ تا ۲۴، تیسرا مضمون "الاقتصاد فی الاسلام" ہے جو صفحہ ۲۵ سے ۳۲ تک پھیلا ہوا ہے۔

۳۔ علمی خبریں:

الندوہ کے دستور العمل کے مطابق "علمی خبریں" اس کے مشمولات کا گویا ایک خاص باب تھا۔ الندوہ کی مکمل جلدیں تو پیشِ نظر نہیں کہ روایت کے استمرار کے بارے میں کچھ عرض کروں کہ کس دور میں اس باب کا کس درجے اہتمام رہا لیکن ابوالکلام کے دور کے پانچ نمبروں میں سے تین نمبروں میں علمی خبروں کا اہتمام نظر آتا ہے۔

اس عنوان کو دیکھ کر محترم قاری یہ گمان نہ کریں کہ جگہ کو بھرنے کے لیے اخبارات یا کتب و رسائل سے نقل و اقتباس کا ایک بے مقصد کام انجام پایا ہوگا۔ ان میں کچھ معلومات اور کچھ عجائب و غرائب ہوتے ہوں گے۔ لیکن دیکھنے کے بعد پتا چلا کہ یہ تو ایک نہایت مفید، معلومات افزا اور فکر انگیز باب تھا اور ابھی تو دیکھتا ہوں کہ ان علمی خبروں کی اہمیت اور افادیت علمی اور تحقیقی مقالوں پر بھی بھاری ہے۔ شاید اس لیے کہ یہ محض نقل و اقتباس کا کام نہیں، ان میں تالیف کے عمل نے ان کے حسن کو نکھار دیا ہے اور ان پر تبصرے کی تحریر نے ان کے محاسن اور افادیت کے پہلوؤں کو نمایاں کر دیا ہے۔ اس سلسلے کے بعض اندراجات کی حیثیت "علمی شذرات" کی سی ہے، جس کے الفاظ اور جملے دل پر عبرت کا ایک نقش اور ذہن پر غور و فکر کی ایک لکیر چھوڑ جاتے ہیں۔

دسمبر ۱۹۰۵ء کی "علمی خبریں" ہمارے سامنے ہیں۔ اس میں اولاً "انگلستان میں جنون" کے عنوان سے ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۳ء میں جنون میں مبتلا ہونے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد بتائی گئی ہے۔ اس میں سابق کے مقابلے میں تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔ اس کے اسباب میں شراب نوشی اور معاشرت میں غلط رجحانات کو بتایا گیا ہے۔ شراب میں الکحل کی آمیزش اس کا اہم عنصر ہے، جس کی مضرتوں نے معاشرے کو اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے۔ ساتھ ہی الکحل کی حقیقت اور اس کے خواص پر روشنی ڈالی ہے اور اس شہرت کی نفی کی ہے کہ الکحل میں فوائد کا عنصر اس کے نقصانات سے زیادہ ہے۔

علمی خبروں کے دوسرے اندراجات کتابوں کے متعلق ہیں۔

۱۔ ایک تحریر ہے کہ کتاب ''الفہرست ابن ندیم'' جو نہایت اہم اور گراں قیمت کتاب ہونے کی وجہ سے ہر صاحب ذوق خریدنے سے قاصر تھا۔ اب اس کی نقل مصر کے ایک تاجر نے چھپوانی شروع کر دی ہے اور دوسری کتاب ''الاصابہ فی معرفۃ اسماء الصحابہ'' جس کو پہلی بار ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ نے شائع کیا تھا اب اسے مصر کی ایک کمپنی شائع کر رہی ہے۔

۲۔ سال رواں ۱۹۰۵ء میں انگلستان نے اشاعت علوم و معارف پر ۹۹۷، ۲۸، ۱۲۳ گنی خرچ کی ہیں۔

۳۔ یورپ کی ایک انجمن یادگار الیاس ولکنس نے نوادر علمیہ میں تاریخ طبرستان اور بابرنامہ شائع کیا ہے۔

۴۔ ایک روسی مسلمان مصنف، جس نے اسلام کے بارے میں متعدد کتابیں پہلے تصنیف کی تھیں اور شائع ہوئی تھیں اب اس کی نئی تصنیف ''حقوق المراۃ فی الاسلام'' مصر سے شائع ہو رہی ہے۔

جنوری ۱۹۰۶ء میں علمی خبروں کے ضمن میں اللغۃ العامہ، جس نے اسپرنتو کے نام سے دنیا میں شہرت حاصل کر لی ہے، اس کی ایجاد، پس منظر تخلیق، اسپرنتو کی حقیقت، اس کی افادیت، اس کے اصول و قواعد، اس کے لٹریچر اور ان اہل علم و اصحاب کا مختصر تعارف کرایا ہے اور ان کی کارگزاریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اب اگرچہ اردو میں بھی اس کے درس و تعلیم کی چند کتابیں میسر آجاتی ہیں لیکن ایسا علمی اور تحقیقی مضمون آج تک نظر سے نہیں گزرا۔ حال آں کہ اب سے سو برس پہلے تو ایسے قیمتی معلوماتی مضمون کا تصور بھی دشوار تھا۔ لیکن ابوالکلام کے ذوق علمی کی بدولت الندوہ کے شائقین کو اس کے مطالعے سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا۔ اس نمبر میں یہی ایک مضمون ہے جو علمی خبروں کے صفحات میں شائع ہوا تھا۔

ان علمی خبروں کے خاتمے پر ''ابوالکلام آزاد دہلوی'' کا نام ''ندوہ۔ لکھنؤ'' کی صراحت کے ساتھ اس طرح درج ہے جیسے کہ الندوہ میں مصنفین کے نام درج کرنے کا طریقہ تھا۔ اس سے ہمارے اس خیال کو اور تقویت ملی کہ یہ اخبارات و رسایل اور جرائد و کتب سے صرف نقل کر دینے کا عمل نہیں بلکہ تالیف و تدوین کا ایک نہایت اہم اور مفید کام ہے جو الندوہ کے اس باب میں انجام پایا ہے۔

اس بحث کو ہم مولانا شروانی کے بیان قاطع پر ختم کرتے ہیں۔ حضرتؒ ایک پیغام میں تحریر فرماتے ہیں:

> "تیس سال پہلے کا الندوہ علمی و تحقیقی مضامین کا خزانہ تھا۔ اس میں کوئی مضمون سرسری یا سطحی شائع نہ ہوتا تھا۔ خبریں بھی وہی شائع ہوتی تھیں جو علمی شان لیے ہوتی تھیں۔"

(بہ حوالہ "مولانا ابوالکلام آزاد" مؤلفہ ضیاء الدین اصلاحی، اعظم گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۶)

۵۔ یورپ میں گونگوں کی تعلیم:

مولانا ابوالکلام کے قلم سے یہ مقالہ مارچ ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں صفحہ ۲۷ تا ۳۹، تیرہ صفحات پر محیط ہے۔ اس مضمون میں گونگوں کی معذوری اور ناقدری پر دنیا کے ابتدائی ماتم سے لے کر موجودہ دور میں ان کی کامرانیوں اور فتح مندیوں تک کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

> "انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں اگرچہ علوم وفنون موجودہ قالب اختیار کر چکے تھے، علم کی روشنی یورپ سے نکل کر دور دور تک پہنچ چکی تھی، قرونِ وسطیٰ کی بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو گئی تھیں، لیکن اس مسئلے پر جب کبھی توجہ ہوئی تو اس درجے ناممکن سمجھا گیا کہ کسی عالم نے اپنی کوششیں اس کے لیے وقف نہیں کیں۔ لیکن صدی کے آخری حصے میں یک بیک قدرت نے انسان کے اس بے انتہا مظلوم طبقے پر رحم آمیز نگاہ ڈالی اور اس کی علمی لذتوں سے محرومی کا طول طویل زمانہ ختم ہوا۔ یورپ میں جا بجا اس امر کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس بے زبان فرقے کو جہالت اور محتاجی کی حالت سے نجات دلائی جائے۔ لاکھوں روپے اس کام کے لیے وقف کیے گئے، بیسیوں انجمنیں اس مقصد سے قائم ہوئیں، یہاں تک کہ آج ان کوششوں کے نتائج حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں اور دنیا حیرت کی نگاہوں سے اس اعجاز کامیابی کو دیکھ رہی ہے، گونگے بول رہے ہیں، ہر مطلب کو مفہوم سمجھتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہیں، لکھتے پڑھتے

> ہیں، دنیا کی روزمرہ ترقی میں ہماری طرح حصہ لیتے ہیں، تجارت میں وہ نظر آتے ہیں، ہر قسم کی علمی ملازمتیں وہ کرتے ہیں، ان کے خاص خاص اخبارات نکلتے ہیں، جس کے ایڈیٹر اور مضمون نگار اسی طرح کے قابل افراد ہوتے ہیں، ان کی خاص انجمنیں ہیں جن کے ممبر، سیکریٹری گونگے ہی ہوتے ہیں۔ غرض کہ علم و تمدن کی روشنی سے اس طرح اپنے ضمیر کو منور کرتے ہیں کہ دنیا کی کوئی علمی لذت اور تمدنی دلچسپی ان سے اپنا دامن نہیں سمیٹ سکتی۔“

میں نے اس مضمون کا یہ طویل اقتباس اس غرض سے دیا ہے کہ میں یہ کہہ کر چھوٹ جاؤں کہ گونگوں کی تاریخ کی ابتدائی بدتر حالت سے علمی دور کی موجودہ بہتر حالت تک مختلف ادوار میں جو ترقیاں حاصل ہوئی ہیں اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اس مضمون میں چھوٹ گیا ہو۔ ایک طرف تو ایک مرض کی حیثیت سے گنگ کی فزیکل حالت پر تحقیق کی گئی کہ یہ گنگ عارضی ہے یا پیدائشی؟ پھر ان اسباب کی تشریح اور علاج کی تجویز و تجربات کی صبر آزما طوالت تھی۔ صدیاں تو نطق و سماعت کے تعلق کو دریافت کرنے میں گزر گئیں، دوسری طرف گونگوں کے لیے زبان کی جستجو تھی، اس زبان کے لیے حروف و الفاظ کی شکل و ساخت کا مسئلہ تھا۔ اس کی تعلیم کی مشکلات تھیں۔ چوں کہ یہ ایک فرد کا مسئلہ نہ تھا، لاکھوں انسانوں کا مسئلہ تھا۔ یہ کسی ایک ملک کا مسئلہ نہ تھا بلکہ کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی انسانیت کے ہر خطے کا مسئلہ تھا۔ ان مسائل پر قابو پانے کے لیے وسائل اور افراد کی ضرورت اور پھر ان کی تعلیم و تربیت کی دشواریاں تھیں۔ تحقیق کا یہ سلسلہ بھی کسی ایک علم یا فن کے میدان کا نہ تھا۔ ایک فن کا دوسرے سے اور دوسرے کا تیسرے سے رشتہ جڑا ہوا تھا۔ ہر دائرے میں، تحقیق کے ہر دور میں ہزاروں اصحاب علوم و فنون کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں تھیں۔ ہر محقق اور مفکر کی اہمیت تھی، کسی ایک شخص نے کسی ایک وقت اور ایک تجربہ گاہ میں یہ مسئلہ حل نہیں کرلیا تھا۔ تحقیق کا یہ سلسلہ کہاں تک دراز ہوا اور کب اور کس نے اس تحقیق کے فیضان عام کا دروازہ کھولا، اس پہلے شخص کی شخصیت پر مؤرخوں کا اتفاق ہونا تو مشکل ہے، جس نے انسانیت کی خدمت کے اس میدان میں پہلا قدم اٹھایا تھا۔ اور اگر اس میدان میں تگ و دو کا سلسلہ ابھی جاری ہے اور انسان تحقیق کی آخری منزل پر پہنچ نہیں گیا ہے تو آخری محسنِ انسانیت کا فیصلہ بھی کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اس بیان کا بس اسی بات پر خاتمہ کر دینا چاہیے کہ یورپ کی خدمات اس میدان میں بے مثال

اور لائق ستائش ہیں اور اس سلسلے میں ابوالکلام کا یہ مضمون بہت بلند پایہ اور تحقیقی ہے۔

اور اسی طرح اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا ابوالکلام نے الندوہ کے نائب مدیر کی حیثیت سے جو چھ ماہ گزارے تھے ان میں علمی دنیا سے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا تھا۔ یہ بات اس مقام سے گزر چکی ہے کہ میں ان کے علم و فضل کا دعویٰ کروں اور الندوہ میں ان کی خدمات کا اعتراف کرواؤں۔ حضرت علامہ شبلی کی ستائش اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے اعتراف کے بعد کسی تیسرے شخص کے بیان و شہادت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ بلاشبہ وہ غیر معمولی علم و فضل کی ایک نادر روزگار شخصیت تھے۔

ادارتی تعلق کے بعد:

الندوہ کی ادارت کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام کے قیام لکھنؤ کی مدت کا ستمبر ۱۹۰۵ء کے اواخر سے مئی ۱۹۰۶ء کے اوائل تک کا پتا چلتا ہے۔ الندوہ سے ضابطے کا تعلق انھی سات مہینوں کے اندر تلاش کرنا چاہیے۔ عام طور پر رواں مہینے کے پرچے کی اشاعت کے بعد اگلے نمبر کی تیاری کی طرف توجہ دی جاتی ہے، اس لیے یقین ہے کہ مولانا آزاد نے اکتوبر سے کام کا آغاز کیا ہوگا۔ اسی ماہ میں علامہ شبلی کے دو خطوں میں "الندوہ" کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> "مضمون واپس ہے۔ الندوہ میں درج ہونے کے لیے دے دیجیے۔ عبدالصمد طالب علم ندوہ جس نے میرا مضمون لکھا ہے، وہ لکھ دے گا۔ ۔ ۔ ۔ یہ پرچہ جس میں عربی کی لائف ہے اور جس میں آپ کا یہ مضمون بھی درج ہوگا، بہت جلد تیار ہو جائے۔ دیر ہوگی تو ذمہ داری آپ پر ہے۔"

(مکاتیب شبلی (حصہ اوّل)، ص: ۲۹۳)

ابوالکلام کا یہ مضمون جو علامہ شبلی نے واپس کیا، الندوہ میں درج کر لینے کی اجازت دی اور کتابت کے لیے عبدالصمد نامی طالب علم کو دینے کی ہدایت کی۔ یقیناً یہ فرید وجدی کی کتاب "المرأۃ المسلمہ" پر تبصرہ ہے جو انھوں نے ابوالکلام سے کروایا تھا اور نومبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں درج ہوا ہے اور یہی ان کا پہلا مضمون ہے جس نے الندوہ میں جگہ پائی ہے۔ (۱)

علامہ شبلی کا دوسرا خط ۲۸؍ اکتوبر کا یادگار ہے۔ اس وقت وہ بھوپال گئے ہوئے تھے۔ وہیں سے انھوں نے لکھا:

> ”خط پہنچا۔ ایک مضمون آج بھیجا ہے، منشی محمد علی کے نام۔ صحت کے ساتھ لکھوایا جائے! عنوان آپ خود تحریر کیجیے۔“

اسی خط میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

> ”ایک جلسہ ہوا، میں بیمار تھا۔ تاہم آدھ گھنٹے سے زیادہ تقریر کی۔ شاید لوگوں نے پسند کیا ہو!“

القاب و آداب سے دونوں خط مبرا ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الندوہ میں مولانا آزاد نے اکتوبر ۱۹۰۵ء سے کام شروع کر دیا تھا۔ الندوہ کا آخری نمبر، جس میں ان کے مضامین ہیں، مارچ ۱۹۰۶ء کا شمارہ ہے۔ اگرچہ لکھنؤ میں ان کی موجودگی کا پتا مئی کے پہلے ہفتے تک چلتا ہے اس لیے اگر اپریل تک الندوہ سے ان کا تعلق رہا ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ مئی میں الندوہ سے ان کا ضابطے کا تعلق ختم ہو گیا لیکن ندوۃ العلماء کے مقاصد علیہ و دینیہ سے ان کا تعلق کبھی ختم نہ ہوا۔ وہ اس کی علمی، تعلیمی اور اخلاقی و اصلاحی تحریک سے ہمیشہ وابستہ رہے، اسی لیے انھوں نے اس کے ترجمان ”الندوہ“ کو بھی فراموش نہ کیا۔ اس زمانے میں ان کے دو اہم مضمون شائع ہوئے:

۱۔ مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی (۱) یہ مضمون اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا اور

۲۔ ”ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود“ اپریل ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا۔

۱۔ مسلمانوں کا ذخیرہ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی:

مولانا ابوالکلام کا یہ مضمون الندوہ کے شمارہ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے شروع میں مولانا کا ایک تمہیدی نوٹ ہے جسے اس مضمون کا پیش لفظ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں مولانا نے مضمون لکھنے کے مقصد اور اس کے دائرۂ بحث پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلے تو انھوں نے مسلمانوں کو شرم دلائی ہے کہ جس میدان میں زمانہ ان کے قدم ہمت کا منتظر تھا، اس میں اغیار آن

سے بازی لے گئے۔ اس کے بعد مولانا نے اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا ہے کہ مسلمانوں کی غفلت سے عربی تاریخ وادب کا جو بیش بہا سرمایہ قریب تھا کہ ضائع ہو جائے، یورپ کی سرپرستی سے وہ محفوظ ہو گیا اور ان کی کوششوں سے عربی زبان اور علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ہمارے علما کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا۔ مولانا آزاد نے اس مضمون کی وضاحت کے لیے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ پہلے حصے میں یہ دکھلایا ہے کہ یورپ کو عربی زبان اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی اور عربی صرف ونحو اور لغت وادب میں کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں مرتب ہوئیں اور شائع کی گئیں؟

۲۔ مضمون کے دوسرے حصے میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شائع ہوئیں! الندوہ میں اس مضمون کا پہلا حصہ چھپا ہے، دوسرے حصے کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

جہاں تک عربی زبان وادب، صرف ونحو اور لغات وامثال کی طرف یورپ کی توجہ اور تحقیق کی تاریخ کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنے مضمون کی دو سطروں میں فیصلہ کر دیا ہے کہ ”گیارھویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم وفنون پر یورپ کی توجہ ہوئی اور چودھویں صدی کے اواخر تک فلسفے کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو گئیں۔“ اور جہاں تک تفصیل کا تعلق ہے تو یورپ کے محققین کے کارناموں اور عربی زبان، صرف ونحو اور لغات وضرب الامثال میں ان کی تصنیفات اور خدمات علمیہ کے تذکرے سے یہ مضمون بھرا ہوا ہے۔ دوسرے علوم میں ان کے کارناموں کے تذکرے کا تو ابھی آغاز بھی نہیں کیا۔ زیر نظر دائرے میں معلومات کی تفصیلات مولانا کے مضمون میں پڑھ کر لطف اندوز ہوں۔

۴۔ ندوۃ العلماء کا جلسۂ دہلی اور مسلمانوں کی شاہراہِ مقصود:

۱۹۱۰ء میں مارچ کی آخری تاریخوں میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ دہلی میں زیر صدارت مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں منعقد ہوا تھا۔ یہ اجلاس بڑا شاندار اور کامیاب تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی روداد لکھی تھی جو الندوہ کے اپریل کے شمارے میں چھپی ہے۔ نوع کے اعتبار سے

تو یہ روداد آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا احوال ہے لیکن ندوہ کی تاریخ، اس کے مقاصد، اس کی خدمات اور برِ اعظم ہند و پاکستان میں اس کی دعوت کے مستقبل پر ایک پرجوش، اثر انگیز، بلند پایہ اور مستقل مضمون ہے۔ اجلاس کے فیصلوں پر شاندار تبصرہ اور بہترین توقعات کا اظہار ہے۔ ابوالکلام نے اس کی جزئیات تک سمیٹ لیں اور مقررین کی تقریروں پر بہ شمول خطبۂ صدارت کے ان کی جامعیت اور عدم جامعیت تک کا فیصلہ کر ڈالا ہے۔ ندوے کی کامیابیوں اور کارگزاریوں پر تبصرے میں بعض دیگر باتیں بھی آ گئی تھیں جو دوسروں کے لیے کوئی پسندیدہ تذکرہ نہ تھا۔ یہ بات کہ ندوہ قدیم (دارالعلوم دیوبند) اور جدید (مدرسۃ العلوم علی گڑھ) میں اعتدال و وسطی کی راہ ہے، خواہ کتنے ہی خوبصورت لفظوں اور دل آویز اسلوب میں کہی جاتی دونوں کے لیے پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں دونوں کے نقش کی ناتمامی اور نصب العین کی پستی کا مطلب ضرور نکلتا تھا اور یہ بات دونوں کے رہبروں اور کارکنوں کے لیے گوارا نہیں تھی۔

ندوہ دارالعلوم اور مدرسۃ العلوم دونوں کے نزدیک بچہ تھا، جس نے اپنے بزرگوں کو ٹوکنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی اس گستاخی کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کی بات تھی۔ دارالعلوم کے ارباب بست و کشاد نے تو برداشت کر لیا، لیکن کالج کے اصحاب اخلاص ضبط نہ کر سکے۔ اس کا شدید ردعمل ہوا۔ ماہنامہ البشیر (اٹاوہ) میں ایک زوردار تنقیدی مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان تھا، "علی گڑھ کالج پر ایک اور حملہ۔" اس عنوان سے تنقید نگار کی رنجش ہی کا پتا نہیں چلتا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ندوے کی یہ پہلی گستاخی نہ تھی بلکہ وہ پہلے بھی اس قسم کی کوئی شرارت کر چکا تھا۔ اب اس نے ایک اور نالائقی کا ثبوت دیا تھا۔ اب اسے معاف نہیں کیا جا سکتا تھا، ضروری تھا کہ اسے سزا دی جائے۔ لیکن اب ندوہ بچہ نہیں تھا، ایک جوانِ رعنا تھا اور اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اب اسے کسی مدرسے یا کالج کے بزرگ کے غور و پرداخت یا سرپرستی کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بات اٹاوہ کے بزرگ بھی جانتے تھے اس لیے وہ اپنے ہی اوپر غصہ اتار رہے تھے اور کالج کے ارباب اہتمام و انصرام کو مشورہ دے رہے تھے کہ انھیں آخری فیصلہ کر لینا چاہیے۔ یہ تذکرہ علامہ شبلی کی زبان ہی سے سنیے۔ ابوالکلام ہی کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> "آپ کی رپورٹ جلسہ سالانہ ندوہ پر البشیر نے ایک اشتعال انگیز آرٹیکل لکھا ہے جس کی سرخی "علی گڑھ کالج پر ایک اور حملہ" ہے۔

اخیر میں لکھا ہے کہ:

"اگر یہ رپورٹ صحیح ہے تو ارکان کالج کو اپنا کام بالکل بند کر دینا چاہیے اور قطعاً ایک آخری فیصلہ کرنا چاہیے۔"

ارکان کالج کو توجہ دلائی ہے کہ

"ندوہ وغیرہ سے قطعاً علاحدگی اختیار کریں، پرچہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔"

(مکاتیب شبلی (حصہ اول) مکتوب مورخہ ۱۲ / جون ۱۹۱۰ء، ص ۲۱)

اگلے خط مورخہ ۲۴ / جون میں یہ اطلاع دی ہے کہ:

"آپ پر اسٹیٹسمین نے جو آرٹیکل لکھا تھا عبدالسلام نے اس کا جواب لکھ کر وکیل وغیرہ میں بھیج دیا ہے۔"

میرے خیال میں یہ رودادِ جلسہ مولانا آزاد کے ان بے شمار مضامین میں سے بہترین مضمون ہے جو انھوں نے ندوہ کی حمایت میں لکھے تھے اور الہلال میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا نے دہلی کے اسی جلسے میں ایک پرزور تقریر بھی کی تھی، لیکن انھوں نے اپنی تقریر کا اس رپورٹ میں ذکر نہیں کیا۔ لیکن حضرت صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنے ایک مکتوب گرامی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اس مقالے میں کئی جگہ اس پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

حواشی

۱۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

"مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی" لکھا جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا۔ اس کے بعد المرأۃ المسلمۃ کے نام سے۔ (حیات شبلی، ص ۴۴۳)

حضرت سید صاحب کو اس بیان میں تسامح ہوا۔ ابوالکلام کا پہلا مضمون "المرأۃ المسلمۃ" ہے جو نومبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا اور "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون۔۔۔" اس کے پورے تین سال کے بعد اکتوبر ۱۹۰۸ء میں چھپا تھا، جب کہ الندوہ سے مولانا آزاد کے ادارتی تعلق کے خاتمے پر اچھی خاصی مدت گزر چکی تھی۔ (ا۔ ش)

(۳)

الندوہ اور مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی

افادات حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی

''اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب ایڈیٹر رہے۔ اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا۔ مولانا شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانے تک ان کو اپنے پاس ندوے میں رکھا۔ وہ ان کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستقل فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے۔ یہیں انھوں نے مولانا حمیدالدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔

مولانا ابوالکلام نے الندوہ میں پہلا مضمون ''مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ'' لکھا، جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا(۱)۔ اس کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم امین بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا، جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے۔ یہی سلسلۂ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا۔ اسی قسم کے ایک خط کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں، ''آزاد کو تو آپ نے مخزن (۲) وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے معلومات یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔'' (مہدی ۱۹)

الندوہ میں ان کے مضامین نے ان کے نام کو ہر طرف پھیلا دیا اور اخباروں اور رسالوں سے ان کی مانگ شروع ہوگئی۔ آخر کار وہ ۱۹۰۶ء میں ''وکیل'' امرتسر میں چلے گئے، اور قریباً دو سال

وہاں رہے ہوں گے، اسی اثنا میں ان کے بڑے بھائی مولوی ابو النصر غلام یٰسین صاحب آہ کا عراق میں، جہاں وہ سیر و سیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے، انتقال ہوا (۳)۔ اور اس کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا خیر الدین صاحب نے، جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزارہا مرید تھے، وفات پائی (۴)۔ رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا۔ اب انھوں نے امرتسر چھوڑ کر پہلے بمبئی میں اور پھر کلکتہ میں قیام کیا اور ہدایت و ارشادِ خلق میں مصروف ہوئے۔ آخر ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ''الہلال'' نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں، لیکن اتحادِ اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمرہی جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے'' (۵)۔

> ''۱۹۰۶ء میری تعلیم کا آخری سال ہے، مولانا ابوالکلام کے امرتسر چلے جانے کے بعد مولانا نے الندوہ کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا، جس کو میں نے مارچ ۱۹۰۸ء تک انجام دیا اس کے بعد اپریل ۱۹۰۸ء سے یہ کام عزیزی صاحب کے سپرد ہوا، (سلیمان ۲۲) اور جون و جولائی ۱۹۰۸ء کے دو نمبر ان کی ادارت میں نکلے تھے کہ وہ پھر میرے حوالے کر دیا گیا، اگست ۱۹۰۸ء سے فروری ۱۹۱۰ء تک میں نے دوبارہ اس کی ادارت کا فرض انجام دیا۔''

(حیات شبلی، ص ۴۳۵-۴۴۳)

الندوہ میں وقتاً فوقتاً جو مضامین نکلے ان میں سے قابلِ ذکر مضامین کی فہرست ۱۹۰۶ء میں خود مولانا (شبلی) نے ایک موقع پر دی ہے، جو یہ ہے:

> ''علوم القرآن، فلسفۂ یونان پر مسلمانوں نے کیا اضافہ کیا؟ علوم جدیدہ، ابن رشد، فن بلاغت، تذکرہ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، فن نحو کی مروجہ کتابیں، مسائل فقہیہ پر ضروریات زمانہ کا اثر، موبدان مجوس، ذوالنون مصری، فارسی شاعری اور عرفی شیرازی، مسلمانوں کی بے تعصبی، پردہ اور اسلام، ابن جوزی کی کتاب مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو، جمہرۃ البلاغہ، سوانح امام بخاری اور ان کی تصنیفات، المرأۃ المسلمہ پر ریویو۔'' (۶) (ایضاً، ص ۴۴۳)

حواشی

۱۔ الندوہ میں مولانا آزاد کا پہلا مضمون "المرأۃ والمسلمہ" پر تبصرہ تھا جس کی پہلی قسط نومبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم..." مولانا کا تین سال بعد کا مضمون تھا۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا تھا۔

(ا۔ س۔ ش)

۲۔ رسالہ مخزن لاہور سے (سر) شیخ عبدالقادر ۱۹۰۱ء سے نکالتے تھے۔ مولانا ابوالکلام کے ابتدائی مضمون اسی میں نکلتے تھے۔ خود میرے بھی ابتدائی مضمون اسی میں چھپے تھے۔ (علامہ سید سلیمان ندوی)

۳۔ ابو نصر غلام یاسین آہ کا انتقال کلکتہ میں ہوا تھا۔ مانک تلہ قبرستان میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہیں۔ اسلامی ممالک کی سیاحت کے لیے عبدالرحمٰن نامی مشہور سیاح ممالک اسلامیہ کے ساتھ نکلے تھے۔ عراق میں بیمار پڑے، رفیق سفر نے حق رفاقت ادا نہیں کیا، تنہا چھوڑ دیا۔ عراق میں ہندوستانی قونصل خانے کے ایک رکن قصبہ نہٹور ضلع بجنور کے سید سجاد حیدر یلدرم نے کوشش کر کے انھیں ہندوستان واپس بھجوا دیا۔ پہلے بمبئی میں علاج ہوا، افاقہ نہ ہوا تو ان کے والد انھیں کلکتہ لے گئے، لیکن جاں بر نہ ہو سکے۔ شاید ستمبر ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ سید مقبول حسین وصل بلگرامی نے اپنے رسالے "عالم گیر" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ان کے انتقال پر ایک شذرہ لکھا تھا۔

(ا۔ س۔ ش)

(۴)

ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالکلام آزاد

بقائے ندوہ کی جنگ میں مولانا کا حصہ

(۱۹۰۶-۱۴ء)

(۱)

پچھلے صفحات میں جو کچھ عرض کیا ہے وہ شبلی ابوالکلام تعارف و تعلقات اور تاثرات کے ضمن میں تھا یا "ندوہ" سے مولانا آزاد کے ضابطے کے تعلق کے حوالے سے تھا۔ لیکن ان دونوں کے تعلقات کا تذکرہ اسی مقام پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سے آگے تعلقات کا دوسرا دور آتا ہے۔ یہ دور ایک بزرگ و خورد کے تعلقات کا تھا۔ ایک طرف بے پایاں شفقت تھی اور دوسری جانب عقیدت و احترام اور سعادت مندی کا اظہار تھا۔ یہ ابوالکلام کی انفرادیت تھی کہ ان کا رویہ روایتی شاگردوں کے بجائے برابری کا نظر آتا ہے۔ یہ حضرت شبلی کی عظمت ہے کہ انھوں نے اپنے اس خورد کی عزت نفس کا ہمیشہ خیال رکھا اور ابوالکلام کی یہ سعادت مندی تھی کہ انھوں نے اپنے بزرگ کے علمی مقام کا ہمیشہ اعتراف و احترام کیا۔ اور اب ۱۹۰۶ء کے بعد اس دور میں جب کہ دونوں کے درمیان الندوہ کی ادارت اور اس میں نیابت کا کوئی تعلق نہ باقی تھا اور اس دور کے دوسرے حصے میں جب الہلال کا اجراء عمل میں آچکا تھا، اس کی شہرت اور اس کے ساتھ ہی ابوالکلام کی مقبولیت بھی آسمان کو چھو رہی تھی۔ اور ان کا شمار نامورانِ ملت کی صف اول میں ہوتا تھا، ابوالکلام کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

شبلی و ابوالکلام کے تعلقات کی اس پائیداری کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ دونوں بے غرض اور ذاتی مفاد و مصالح سے ناآشنا تھے اور دونوں ایک دوسرے کے فضائل و

کمالات کے قدر دان، اور ذوق سخن اور مطالعہ و نظر کی وسعت و گہرائی کے معترف تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دونوں ہم ذوق وہم فکر تھے۔ ادب، مذہب، تاریخ، تعلیم، سیاست میں دونوں کا نقطۂ نظر یکساں یا قریب قریب تھا۔ ندوۃ العلماء دونوں کی توجہ کا مرکز تھا، سیرۃ نبوی کے منصوبے میں ابوالکلام شبلی کے مشیر و معاون تھے اور الہلال کی تعلیمی، سیاسی، اصلاحی تحریک میں شبلی آزاد کے ممد و معاون تھے۔ بلکہ الہلال کی سیاسی تحریک کے فروغ اور اس کے رنگ کو نمایاں کرنے میں آزاد کی تحریروں ہی کا نہیں شبلی کی تاریخی و سیاسی منظومات کا حصہ بھی ہے۔ آزاد کے تاریخی سیاسی مقالات میں ان کے اسلوب، طرز فکر اور حسن استدلال نے جو کام کیا تھا انھی مسایل میں رائے کو ہموار کرنے اور ذوق و جذبات کی تربیت میں شبلی کا حصہ صاحب الہلال سے کم نہیں تھا۔

ابوالکلام کا تعلق الندوہ سے صرف ملازمت ہی کا نہ تھا۔ بقول ضیاء الحسن علوی کے، روپے کی تو انھیں طلب اور طمع نہ تھی بلکہ ندوۃ العلماء اور اس کی تحریک جدید سے دونوں کو دل چسپی تھی۔ یہ دل چسپی الندوہ کے تعلق سے نہ پیدا ہوئی تھی اور نہ اس تعلق کے خاتمے کے ساتھ ختم ہوگئی تھی۔ خود ابوالکلام کے بیان کے مطابق ۱۹۰۱ء میں ندوہ کے سالانہ جلسہ کلکتہ سے ان کی دل چسپی کا آغاز ہوا تھا اور بعد کے دور میں نہ صرف شبلی کے انتقال تک بلکہ ۱۹۱۴ء کے بعد بھی ندوۃ العلماء، اس کے بزرگوں، خردوں سے ہمیشہ ان کے خلوص و مروت کے تعلقات رہے۔ الندوہ سے ادارتی تعلق کے بعد بھی نہ تو انھوں نے شبلی سے راہ و رسم التفات ختم کی اور نہ الندوہ کو فراموش کیا۔ شبلی مرحوم سے ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں اور مراسلت کا سلسلہ بھی مرحوم کی وفات تک دراز رہا۔ مکاتیب شبلی (حصہ اول) میں مکتوب نگار کے چالیس خط یادگار ہیں۔ پہلا خط ۲۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء بہ زمانۂ قیام لکھنؤ کا اور آخری خط وہ تاریخی تار ہے جو وفات سے چار دن قبل سیرت نبوی کی اسکیم کے تحفظ و انتظام کے لیے ندوے کا تھا۔ اس مراسلت میں ابوالکلام کا حصہ چھ رقعوں تک ہے جو شبلی کے ذخیرۂ علمی میں محفوظ رہے تھے۔ یہ خطوط ۲۶ر اگست ۱۹۰۸ء تا ۲۰ر اکتوبر ۱۹۱۰ء کے یادگار ہیں۔

۱۹۰۵ء میں حضرت علامہ شبلی نے حیدر آباد سے قطع تعلق کر لیا تھا اور نصف ثانی میں لکھنؤ پہنچ کر معتمدی کا چارج سنبھال لیا تھا۔ اس عہدے پر کئی سال پہلے ان کا تقرر کیا جا چکا تھا لیکن مختلف موانع کی بنا پر وہ اس کا چارج نہ لے سکے تھے۔ اب انھوں نے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے اسے تاریخ ندوۃ العلماء کے ایک نئے دور انقلاب کا آغاز قرار دیا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے

طویل اور معرکۃ آرا مضمون میں، جو الہلال کی آٹھ قسطوں میں ۲۱ جنوری سے یکم اپریل ۱۹۱۳ء تک شائع ہوا، ندوۃ العلماء کی ۱۹۰۵ء میں اس حالت پر نظر ڈالی ہے جب علامہ شبلی کی معتمدی کا دور شروع ہوا تھا۔ فرماتے ہیں:

> "دارالعلوم کی اس وقت کی حالت کا اگر اندازہ کرنا چاہتے ہو تو ایک مریض جاں بہ لب کے بستر کو دیکھو یا کسی لٹے ہوئے اور برباد قافلے کو! اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر پرانی دہلی کے ان کھنڈروں کی سیر کرو جن کی بہت سی دیواریں گر چکی ہیں اور جو کچھ باقی ہے وہ بھی عن قریب گرنے والا ہے۔"

اس تمثیل کے بعد مولانا ابوالکلام راست بیانی سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "افلاس و فقر، بے نوائی اور شکستہ حالی، کس مپرسی و محتاجی، خرابۂ کار اور بربادیٔ محنت کا ایک ویرانہ تھا یا جس کے اندر تباہی و ہلاکت کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ ایک ظاہری صورت ضرور قائم تھی۔ مدرسہ تھا، مدرس تھے، طالب علم تھے، لیکن نہ تو روپیہ تھا جس سے تمام کام زندہ رہتے ہیں اور نہ کوئی تعلیمی روح تھی جو بہت سے مادی نقصانوں کی بھی تلافی کر دیا کرتی ہے۔"

(الہلال: ۱۸ مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۲۰۹)

مولانا آزاد نے محض استعارات اور اشارات ہی سے کام نہیں لیا بلکہ مالی حالت اور ندوے کی بعض ضرورتوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے جن کو پورا کرنے کا کوئی سروسامان موجود نہ تھا۔ منشی محمد علی محرر دفتر نے اطلاع دی کہ "تحویل بالکل خالی ہے۔ اور سو روپے ریاست حیدرآباد کے اور پچیس روپے دیگر ذرائع سے کل سوا سو روپے دارالعلوم کا مایۂ حیات تھا۔" خرچ ڈھائی سو روپے تھا جو چندوں سے پورا ہوتا تھا۔ "نگران کا بھی یہ حال تھا کہ کبھی روزی اور کبھی روزہ!" فراہمی زر کا کام نہایت مشکل ہو گیا تھا۔ شبلی مرحوم کی کوششوں سے تمام حالات و مشکلات پر قابو پا لیا گیا۔ گورنمنٹ ندوے کی طرف سے شکوک و شبہات میں مبتلا تھی، اس کے زیر اثر امرا مخالف تھے، عام لوگوں کو توجہ نہ تھی۔ علامہ شبلی نے سب سے پہلے اور ۱۹۰۵ء کے ختم ہونے سے قبل بھوپال سے پچاس روپے مقرر کروائے، گورنمنٹ کے شکوک دور کیے، بالآخر پانچ سو روپے ماہوار ایڈ مع ایک وسیع و بہترین قطعۂ زمین کے دیا گیا۔ دارالعلوم کی تاسیس کا عظیم الشان جلسہ ہوا اور لیفٹننٹ

گورنر نے بنیاد کا پتھر رکھا۔ ریاست رام پور سے سالانہ ایک رقم مقرر ہوئی۔ اس سے عام پبلک میں ایک نئی توجہ پیدا ہوگئی اور لوگ یک مشت رقمیں بھی بھیجنے لگے۔ اخبارات میں بھی اب ندوے کے کاموں کا تذکرہ کیا جانے لگا۔

سب سے اہم سوال دارالعلوم کی تعمیر کا تھا، جس کے لیے اوّلاً ایک لاکھ روپیہ مطلوب تھا۔ مولانا شبلی نے تعمیر دارالعلوم کے لیے ایک اپیل شائع کی۔ "یہ اپیل ریاست بہاول پور کے خاندانِ شاہی تک پہنچی اور خدا تعالیٰ نے کچھ اس طرح کی توفیق عطا فرمائی کہ پچاس ہزار روپے کے گراں قدر عطیے کا صرف بہاول پور ہی سے اعلان ہوگیا۔ اسی طرح بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کا انتظام بھی ہوگیا۔ مولانا شبلی نے جب اس کو لیا تھا تو سوا سو روپے ماہوار آمدنی تھی اور خزانہ بالکل خالی تھا۔ لیکن اب ایک ہزار روپے تک ماہوار آمدنی پہنچ گئی اور دارالعلوم اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارت کے لیے ستر اسی ہزار روپیہ جمع ہوگیا۔"

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> "مولانا شبلی نے ندوے کے لیے سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی کہ جس چیز کو لوگ بھلا چکے تھے، اسے پھر ان کے سامنے کر دیا اور جس کے لیے مایوسی کا فیصلہ ہوگیا تھا اس کے لیے امیدیں مر کر پھر زندہ ہوگئیں۔
>
> ایسا ہونے کے لیے صرف ایک ہی شاخِ عمل کافی نہیں ہے بلکہ مسلسل اور غیر منقطع کاموں کا ایک پورا سلسلہ چاہیے۔ دارالعلوم ندوہ کے متعلق جو کچھ ہوا وہ اس قسم کے کاموں کے لیے ایک عمدہ تجربہ ہے۔
>
> ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس، مدراس کے جلسے کے بعد بالکل موقوف ہوگئے تھے کیوں کہ نہ تو کام کرنے والے تھے اور نہ لوگوں ہی کو اس قسم کی دلچسپی باقی رہی تھی۔ مولانا شبلی نے کوشش کی کہ سالانہ جلسوں کا سلسلہ پھر شروع ہو۔
>
> سب سے پہلے بنارس میں اس کی تحریک کی گئی اور برسوں کے بعد ندوۃ العلماء کے انعقاد کا غلغلہ ہوا۔ پھر دوسرا جلسہ لکھنؤ میں ہوا۔ تیسرا دہلی میں اور پانچواں دارالعلوم کی نئی عمارت میں، جس کی صدارت کے لیے سید رشید رضا مصر سے آئے۔ گو علمائے ندوہ نے کہا کہ ہمیں ان کی قابلیت معلوم نہیں۔ دارالعلوم کے

> سنگ بنیاد نصب کرنے کا جلسہ بھی اسی سلسلے میں شامل ہے۔
> ان جلسوں سے ملک میں ندوہ کی صدائیں دوبارہ بلند ہوئیں اور اس کے متعلق عرصے کی خاموشی سے جو افسردگی پھیل گئی تھی، دور ہوئی۔"

(ایضاً، ص ۱۰-۲۰۹)

اس کے بعد مولانا آزاد نے ندوۃ العلماء میں شعبہ وار ترقیات اور علامہ شبلی کی رہنمائی میں اس کی کارگزاریوں پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ تعلیمی حالت، ۲۔ ادب و تفسیر، ۳۔ درجۂ تکمیل، ۴۔ علوم عصریہ و زبان انگریزی، ۵۔ تصنیف و تالیف، ۶۔ جماعت خدام اسلام (ایضاً: ۱۸/ مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۱۳-۲۱۱)، ۷۔ کتب خانہ (ایضاً: ۲۵/ مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۲۳۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے ندوہ کی "حیات بعد الممات اور عروج بعد از زوال" قرار دیا ہے اور اس کا سہرا حضرت علامہ شبلی کے سر باندھا ہے۔

مولانا آزاد نے صرف یہی ایک مقالہ نہیں لکھا بلکہ "ایک عظیم الشان دینی تحریک کی انتہائی تخریب" کے عنوان سے دو قسطوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی اسٹرائک کے مالہ وما علیہ پر ایک فکر انگیز مقالہ لکھا جس میں ان کے خیالات کی شدت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسے ندوے کی عظیم الشان تحریک کے لیے انتہائی تخریب کا عمل قرار دیا ہے۔ یہ ندوے کی وہی تحریک ہے جسے اول الذکر مقالے کے آغاز ہی میں "مسلمانان ہند کے قومی کاموں میں سے ایک عظیم الشان اور مایۂ امید و آمال کام" بتایا ہے۔ (الہلال: ۲۱/ جنوری ۱۹۱۳ء، ص ۲۱) ثانی الذکر طلبہ کی اسٹرائک والے مضمون کے آخر میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ:

۱۔ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو بذریعہ مجالس و جرائد ندوے کی حفاظت و اصلاح کے لیے متحد صدا بلند کرنا!

۲۔ فوراً ایک کمیشن کا تقرر جو لکھنؤ جائے اور دارالعلوم کے مقاصد کی تحقیق کرے۔ اس سلسلے میں مولانا نے ملک کے دس زعماء کے نام بھی پیش کیے کہ مجوزہ کمیشن میں یہ نام ضرور ہونے چاہئیں۔

۳۔ ایک عظیم الشان جلسے کا انعقاد جو ندوے کے مسئلے کا آخری فیصلہ کر دے۔

(ایضاً ۱۱/ مارچ ۱۹۱۳ء، ص ۲-۱)

مولانا کے نزدیک یہ مسئلہ ندوے کی بقا اور موت کا مسئلہ تھا۔ اسی پر انھوں نے الہلال کے اگلے شمارے (۱۸/ مارچ ۱۹۱۳ء) کا مقالہ افتتاحیہ لکھا اور اس کی اہمیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ”اصحاب درد و کار“ کو متوجہ کیا کہ وہ اس مسئلے کے حل اور ندوے کو اس کی تباہی سے بچانے کے لیے فوری قدم اٹھائیں۔ اس جلسے میں مولانا نے طلبہ کو اپنے موقف کی وضاحت کا موقع دیا اور ان عاقبت نااندیشوں کو بھی اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کا موقع دیا، جن کی غلط روی نے معاملے کو اس حد تک پہنچایا تھا۔ مولانا کے پرزور حقائق سے معمور اور فکر انگیز مقالات نے ملک کو اس مسئلے کی طرف متوجہ کر دیا اور انجمن ہائے اصلاح ندوہ، جلسوں، اخبارات میں مراسلات و مضامین کی اشاعت کا ایک طوفان امڈ پڑا۔ بالآخر مولانا کی تجویز کے مطابق ۰ ؍ مئی کو دہلی میں ایک جلسے کا اعلان کر دیا گیا۔ الہلال نے کئی ہفتے تک اس اعلان کو مشتہر کیا اور جیسا کہ مولانا نے چاہا تھا کہ یہ نمائندہ جلسہ ندوے کے مسئلے کا آخری فیصلہ کر دے، زعمائے ملت نے جمع ہو کر ایک فیصلہ کر دیا۔ اگرچہ اس جلسے کے بعد بھی بے چینی ختم نہیں ہوئی اور سازشوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن جلسے کے فیصلے سے کسی کو مفر نہ تھا۔ اور اس طرح اکابرین ملت کی کوششوں سے ”ایک عظیم الشان دینی تحریک“ عاقبت نااندیشی اور تخریب کے انتہائی اعمال کے نتائج سے دوچار ہونے سے بچ گئی۔

ہمارے پاس کوئی ایسی ترازو نہیں کہ ندوے کو تباہی سے بچانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے حصے کا وزن کر کے بتا دیں۔ لیکن ان کے حصے کی اہمیت اور اس کی سحر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت سید صاحب علیہ الرحمۃ کی رائے اس باب میں حرف آخر ہے۔ فرماتے ہیں:

> ”حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوے کے انقلاب اور اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا۔ انھوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک آگ سی لگ گئی اور ہر طرف ندوہ، ندوہ کا شور برپا ہو گیا۔“

(حیات شبلی اعظم گڑھ، دار المصنفین ۱۹۴۳ء، ص ۶۵۲)

ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے لکھا ہے:

”ندوہ مولانا کی دل چسپی کا خاص مرکز تھا اور الہلال کا تقریباً ایک تہائی حصہ

ندوے یا مباحث ندوہ ہی پر مشتمل ہے۔ ۱۹۱۳ء کا تو شاید ہی کوئی شمارہ اس ذکر جمیل سے خالی ہو۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد: رام پور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱۳)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی اسی حق کی گواہی دی ہے۔ فرماتے ہیں:

> "یہ ندوے کی وہ تاریخی اسٹرائک ہے، جس نے سارے ملک کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور وہ اس وقت کے تعلیم یافتہ حلقوں کا ایک زندہ اور سنجیدہ مسئلہ بن گیا۔ ملک کے متعدد کثیر الاشاعت اور آزاد خیال پرچوں نے، جو نوجوانوں میں بہت زیادہ مقبول تھے، اس اسٹرائک کو ایک قومی و ملی مسئلہ بنا دیا۔ ہمدرد دہلی، زمیندار لاہور، مسلم گزٹ لکھنؤ، الہلال کلکتہ کے صفحات گویا علامہ شبلی کی حمایت اور طلبہ کی ہمدردی کے لیے وقف تھے۔ سب سے بڑھ کر مولانا ابوالکلام آزاد کے آتش ریز اور طوفان خیز قلم نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عالم اسلامی کا سب سے بڑا حادثہ پیش آیا ہے اور ملت اسلامی کا عروج و ترقی ندوے کی اصلاح پر موقوف ہے، جس کی راہ میں چند استبداد پسند اور قدامت پرست عناصر حائل ہیں۔ ملک میں جابجا جلسے ہو رہے تھے، جس میں ندوے کی اصلاح اور طلبہ کے ساتھ انصاف کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔"

(پرانے چراغ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۱)

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ:

مولانا ابوالکلام آزاد نے جس جوش و ولولے کے ساتھ ندوے کے مسئلے میں حصہ لیا تھا اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ چوں کہ حضرت شبلی سے مولانا آزاد کو عقیدت ہے، ندوے کے مسئلے میں ان کی اس درجہ دل چسپی اور یہ جوش و خروش اسی عقیدت کا شاخسانہ ہے۔ ندوۃ العلماء کے اچھے برے سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ بات فریق مخالف نے پروپیگنڈے کے نقطۂ نظر سے پھیلائی ہو کہ ان کو مسئلہ ندوہ کے معاملے میں غیر مخلص ثابت کر کے ان کی رائے کے وزن کو کم کر دیا جائے لیکن واقعی کسی کی سنجیدہ رائے ہو یا پروپیگنڈا، بہر صورت یہ بات اپنے

اندر کوئی سچائی نہ رکھتی تھی۔ مولانا نے علامہ شبلی کا نام لیے بغیر اس غلط فہمی یا بدگمانی کی صاف تردید کر دی ہے۔ مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

> "مجھے اوروں کے دلوں کی خبر نہیں، لیکن با ایں ہمہ خود میرے دل کو تو کامل طمانیت تھی اور الحمدللہ کہ بغیر کسی تزلزل کے اب تک وہ طمانیت قائم ہے۔ میں اس تحریک میں جو کچھ حصہ لے رہا تھا، اس کو کسی شخص یا جماعت کی طرف داری سے تعلق نہ تھا بلکہ صرف اپنے یقین اور بصیرت کے ماتحت جو کچھ دیکھتا تھا لکھتا تھا۔ غلط فہمیاں آج پھیلائی جا سکتی ہیں اور نیتوں کو شک اور بدگمانی کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر کل تک انھیں قائم رکھنے پر کوئی قادر نہیں اور خدا کا ہاتھ سب سے زیادہ زبردست ہے۔ وہ جس طرح نیتوں کے کھوٹ کو فلاح نہیں دیتا اسی طرح غلط فہمیوں اور بے جا شکوک کو بھی زندگی اور طاقت نہیں بخشتا۔ میرے لیے یہ یقین اور اعتقاد کافی ہے کہ اگر میں ندوے کی اصلاح کی خواہش میں کسی فرد واحد کی حمایت یا کسی جماعت کی ذاتی عداوت کے لیے کر رہا ہوں تو میری ہلاکت خود میرے کام کے اندر ہی سے پھوٹ نکلے گی اور میری آواز کو کبھی سچی آوازوں کی سی عمر نصیب نہ ہوگی۔"

(الہلال: ۱۳-۲۰ مئی ۱۹۱۲ء، ص ۳۸۱)

بلاشبہ مولانا آزاد کو حضرت علامہ شبلی سے بہت عقیدت تھی۔ وہ ان کے فضائل علمی کے بہت مداح تھے۔ وہ ان کی جامعیت علوم وفنون کے بھی قائل تھے۔ لیکن وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ حضرت شبلی مرحوم نے ندوے کی معتمدی کی ذمہ داری سنبھالی تھی تو ندوہ ایک بے روح لاشہ تھا اور ۱۹۰۷ء کے بعد جو زندگی کے آثار اس میں پیدا ہوئے تھے وہ صرف علامہ شبلی کی مسیحائی اور ان کی توجہ اور محنت کا نتیجہ تھا اور صرف ندوے سے محبت کا تقاضا ہے کہ ندوے سے حضرت شبلی کے تعلق کو توڑ کر اسے موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے اور اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسئلے کا ایسا حل تلاش کیا جائے کہ ندوہ علامہ شبلی کی رہنمائی اور سرپرستی سے محروم نہ ہو۔ پھر مولانا آزاد نے جو کچھ لکھا تھا وہ بادلیل تھا اور ان دلائل کو رد کر دینے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی تھی۔ اس لیے حضرت علامہ شبلی کے موقف کی حمایت ندوے کی حمایت اور اس کی بقا سے محبت کا لازمہ تھا۔

پھر ایسا بھی نہ تھا کہ حضرت علامہ شبلی کو انھوں نے معصوم اور تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ قرار دیا ہو۔ مولانا آزاد نے شبلی کو بھی ان کے تساہل اور بروقت قدم نہ اٹھانے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صاف صاف لکھا ہے کہ ندوے میں ”حزب الفساد“ کے نشو ونما پانے میں سب سے زیادہ حصہ مولانا شبلی ہی کا ہے۔ اگر وہ بروقت توجہ کرتے اور جرأت کا ثبوت دیتے تو تخم فساد نشو ونما نہیں پا سکتا تھا۔ مولانا کی تحریر یہ ہے

> ”سب سے اول تو میں افسوس کے ساتھ اس کا سبب مولانا شبلی کی کمزوری خیال کروں گا۔ کیوں کہ وہی ایک شخص تھے جو سب سے زیادہ ان کاموں کا درد رکھتے تھے اور ضرور تھا کہ وہی سب سے زیادہ کمزوری اور عدم استعمال وسائل کار کے جواب دہ بھی ہوں۔ انھوں نے نہ تو کبھی اپنی پوری قوت کا استعمال کیا اور نہ وہ وسائل اختیار کیے جن سے ندوے کی مجلس انتظامی کے اندر ہی ایک قوی حزب الاصلاح پیدا ہو جاتی؛ جو لوگ عمدہ خیال رکھتے تھے، نہ تو ان سے کبھی انھوں نے مراسلت کی، نہ خاص مشورہ وصحبت کا سلسلہ قائم کیا اور نہ ہی باہر سے لوگوں کو اپنے ساتھ لینے کی کوشش کی۔ برخلاف اس کے وہ لوگ پوری سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اور سعی وکوشش کا دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔“

(الہلال کلکتہ ۲ اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۲۔۵)

حضرت علامہ شبلی فرشتہ نہ تھے، وہ خامیوں سے پاک اور کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ ان کے ارادت مندوں کی کمی نہ تھی لیکن ابوالکلام کی طرح ان کے ذوق ومزاج پر تنقید کی نظر شاید ہی کسی نے ڈالی ہو۔ وہ لکھتے ہیں

> ”جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے ۔ ایک مرتبہ ..... میں نے کہا ”آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے: ”قرآن اور سیرت محمدیہ“ اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط وترتیب جمع کرکے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ کی شخصیت اور آپ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کی طبیعت میں

> ایک خاص بات یہ تھی کہ کوئی معاملہ ہو، وہ اس کی ابتدا ہمیشہ شک اور تردد سے کیا کرتے تھے اور جب تک یقین کے لیے مجبور نہ ہو جائیں یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس چیز نے ان کی عملی زندگی کو بھی (یعنی کاروبار و انتظامات کی زندگی کو) بہت نقصان پہنچایا۔ اور وہ کوئی عملی کام جم کر نہ کر سکے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اس مطالعے کو پیش کرنے کے بعد اس کی صحت پر ندوۃ العلماء کے معاملات میں ان کے مشکوک و مذبذب رویے سے استدلال کیا ہے۔ اور یہ بھی ان کا مشاہدہ تھا۔ فرماتے ہیں:

> "ندوے کے معاملے میں جو جھگڑے لوگوں نے ڈالے، وہ ان کے اسی ضعف یقین و عدم جزم و صلابت ارادہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا۔"

(تذکرہ (مرتبہ مالک رام): دہلی، ۱۹۶۸ء، ص: ۲۰۴_۵)

مولانا آزاد نے ان مواقع کی بھی نشان دہی کی ہے، جب خرابیاں راہ پا رہی تھیں اور انھوں نے حضرت شبلی مرحوم کو توجہ دلائی تھی کہ وہ اسی وقت ان کا تدارک کر دیں۔ لیکن حضرت مرحوم کو توقع تھی کہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں، سب کی اصلاح کر دیں گے۔ لیکن شبلی مرحوم کا یہ خیال درست نہ تھا۔ شبلی کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں، ندوے کی تحریک کو نقصان پہنچ رہا تھا اور وہ اس سے بے پروا تھے۔ خود ابوالکلام کے نام خطوط میں سازشوں کی تفصیلات موجود ہیں لیکن اصلاح کا کوئی قدم اٹھتا اور تدارک کی کوئی راہ کھلتی نظر نہیں آتی تھی۔

حضرت علامہ شبلی ۱۹۰۵ء میں معتمد کی حیثیت سے لکھنؤ تشریف لائے اور ذمہ داریوں کو سنبھالا تو ان کے خلاف ایک مولویانہ انداز فکر موجود تھا۔ وہ مولویت کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان کا طرز زندگی، ان کا انداز فکر، ان کی آزاد خیالی، ان کی شاعری، ان کی تاریخی و سوانحی اور ادبی و تنقیدی تصنیفات بعض کے نزدیک گویا یہ مولویانہ کام ہی نہ تھے۔ ان کا دین کی خدمت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کی صحبت طلبہ کے لیے مضر تھی۔ سب سے زیادہ ناخوشی اس بات سے تھی کہ شبلی بے غرض تھے اور مخالفین کے پاس نہ کوئی ایسی تلوار تھی جو انھیں کاٹ سکے اور نہ کوئی ایسی طاقت تھی جو انھیں جھکا سکے۔ ایک وجہ شکایت و رنج یہ تھی کہ پورے ملک میں ان کی قابلیت کا

ڈنکا بج رہا تھا۔ بہاول پور، بھوپال، رام پور، حیدرآباد میں ان کی علمی شخصیت کا اعتراف موجود تھا اور خالص مذہبی اور نام نہاد دینی درس گاہوں، خانقاہوں اور ان کے مولویوں اور سجادہ نشینوں کے سوا تمام علمی و تعلیمی اداروں اور یونی ورسٹیوں اور ان سے وابستہ اور آزاد اہل علم اور اصحاب فکر و رائے میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ پھر انھوں نے دو سال کے عرصے میں ندوۃ العلماء کی نشست ثانیہ کا جو سرو سامان کر دیا تھا اور ندوۃ العلماء کے مخلصین کا جو حلقہ پیدا کر دیا تھا اور جس آسانی کے ساتھ مجلس انتظامیہ اور ارباب بست و کشاد کے فیصلوں پر اثر انداز ہو جاتے تھے اس نے ندوہ کے اندر کے بعض افراد کو مشتعل کر دیا تھا۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک ندوہ کے معاملات میں حضرت علامہ شبلی نے بہت سی اور غیر متوقع کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

خاص طور پر مارچ ۱۹۰۶ء میں ندوے کے سالانہ اجلاس بنارس اور علمی نمائش کے اہتمام میں کامیابی، مارچ ۱۹۰۷ء میں جلسہ عطائے اسناد لکھنؤ، نومبر ۱۹۰۸ء میں لیفٹنٹ گورنر یوپی کی ندوے میں آمد اور اس کے ہاتھوں سنگ بنیاد کا قیام اور حکومت کی طرف سے ایک معقول ماہانہ امداد اور قطعۂ زمین کے عطیے کے اعلان اور سالانہ جلسے کی شاندار کامیابی اور اس کے ساتھ ہی حضرت علامہ مرحوم کی نیک نامی اور ان کے اسم اعظم کی سحر انگیزی نے ان لوگوں کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔ اب ان کے لیے شبلی نعمانی کا وجود بالکل ناقابل برداشت ہو گیا تھا اور انھوں نے شبلی سے آخری جنگ کے لیے گویا ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ خود حضرت علامہ مرحوم مولانا آزاد کو اپنے خط مورخہ ۵/دسمبر ۱۹۰۹ء میں اطلاع دیتے ہیں

> ”آپ کے مولوی خلیل الرحمن وغیرہ نے جلسۂ انتظامیہ میں میری علاحدگی کی تجویز پیش کی، اس لیے کہ جب سے میں ندوہ میں آیا لوگوں کی توجہ کم ہو گئی اور ندوہ کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ کیوں! آپ بھی اس رائے سے متفق ہیں یا نہیں؟! افسوس ہے کہ ان کے ووٹ نہیں آئے ورنہ کمیٹی میں آکر ٹھکانا ملتا اور خوب صحبت رہتی!“

(مکاتیب شبلی۔ اعظم گڑھ ۱۹۲۶ء (چہارم) ، ص ۲۴۲)

بھلا ندوہ کو نقصان اور لوگوں کی توجہ کی کمی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ شبلی آئے تھے تو سوا سو روپے ماہانہ آمدنی تھی۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ خرچ تھا اور تحویل خالی تھی۔ اب پانچ سو روپے نقد ماہانہ گورنمنٹ سے آتے ہیں۔ حیدرآباد کے سو روپے بدستور آتے تھے۔ پچاس روپے بھوپال

سے اور پانچ سو روپے سالانہ شاید رام پور سے مل جاتے تھے اور ستر اسی ہزار روپے ندوے کے اکاؤنٹ میں دارالعلوم اور دارالاقامہ کی تعمیر کی مد میں موجود تھے۔ لیکن اس سے زیادہ حیرت افزا رویہ شبلی کا تھا! انھوں نے ایک فتنہ انگیز بات سنی ہی نہیں، ایک سنگین واقعہ ان کے سامنے پیش آیا اور انھوں نے قطعاً اس کی پروا نہ کی۔ ان کے نزدیک یہ ایک مزاح تھا۔ انھوں نے اس کی سنگینی کا ذرا خیال نہ کیا، اس کا تدارک کیوں کر کرتے۔ حالاں کہ اس سے نہ اس وقت اور نہ آج کوئی انکار کرسکتا ہے کہ یہ ایک فتنہ تھا، جس نے سر اٹھایا تھا اور ضروری تھا کہ اسی وقت اسے کچل دیا جاتا۔

۲۰ دسمبر کے خط میں لکھتے ہیں:

> "رفیع الدین کی کامیابی سے میں بھی خوش ہوا اور منافقوں سے تو غریب اچھا کام کرے گا۔"

۲ مئی ۱۹۱۰ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> "دیوبند والوں نے ندوہ کو سخت نقصان پہنچانا چاہا، لیکن حکیم اجمل خاں صاحب نے مداخلت کی۔ تاہم وہ ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں۔ ڈھاکا تک استغاثہ ہوا ہے اور لطف یہ کہ مستغیثوں کے وکیل مولوی حفیظ اللہ صاحب ہیں۔"

اس مقام پر میں نے دو الگ الگ اقتباسوں کو ایک تبصرے کے لیے درج کر دیا ہے۔ پہلے اقتباس میں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ندوہ کی انتظامیہ میں منافق موجود ہیں۔ یہ بات شبلی کو معلوم تھی لیکن ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے انھوں نے کیا انتظام کیا؟ اس بات کا پتا نہیں چلتا۔ دوسرے اقتباس میں ریشہ دوانی کرنے والی ایک جماعت اور ایک فرد ہے۔ جماعت "دیوبندی" اور فرد خود ندوہ کا سابق "صدر مدرس"!

دیوبند ایک مکتب فکر کا مرکز تھا۔ اس کا ایک دارالعلوم تھا۔ اس کا ایک نظام فکر و عمل تھا۔ ندوۃ العلماء کی تاریخ سے ۲۵،۳۰ سال زیادہ پرانی اس کی تاریخ تھی۔ اور اس وقت تک وہ اپنے مقاصد کے سفر کی کئی منزلیں طے کر چکا تھا۔ اس کے مقاصد میں ندوۃ العلماء کہیں اس کے راستے میں نہ آتا تھا۔ دیوبندیوں کا اپنے ادارے کے مقاصد کے لیے تگ و دو کرنا اور حصول مفاد کے اعمال بجا لانا، خواہ ان سے ندوے کے مفاد کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جاتا، ندوے کے خلاف ریشہ دوانی میں ہرگز شمار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ "مولوی حفیظ اللہ صاحب" ۱۹۰۸ء میں ندوہ سے الگ ہو چکے تھے، اب وہ

ڈھاکا یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ان پر ضابطے کی کوئی ذمے داری نہ تھی۔ ان کا شکوہ لاحاصل تھا۔ یہاں سوال دیوبند والوں کے دفاع یا مولوی حفیظ اللہ صاحب کی وکالت کا نہیں، مسئلہ حضرت علامہ شبلی کے اقدام و تدارک کا ہے! حکیم اجمل خاں نے جو کچھ کیا سو کیا، خود حضرت علامہ شبلی نے حفظِ مفاداتِ ندوہ کے لیے کیا کیا؟ جواب یہ ہے کہ کچھ نہیں!

۷ار نومبر ۱۹۱۰ء کے خط میں مخالفین کے عزائم و الزامات کی جو تفصیلات نقل کی ہیں انھیں پڑھ کر تو حیرت ہوتی ہے کہ اسلام نے ان کی راج پوتی حمیت کو کس طرح مٹا دیا تھا کہ مخالفین کی اخلاق سے گری ہوئی باتیں سن کر بھی بے قابو نہ ہوئے۔ تفصیل میں نہیں جاتا، خط کی اوّل و آخر کی چند سطریں نقل کرتا ہوں۔ مخالفین کی اخلاق سے گری ہوئی باتیں پڑھیے اور حضرت شبلی کے ضبط و تحمل کی داد دیجیے۔ فرماتے ہیں:

> ”آج کل سخت زغہ ہے۔ سہارن پوری، شاہ جہان پوری، پھلواروی، کاکوروی، سب یک جا جمع ہیں۔ رپورٹیں تیار ہو رہی ہیں، مضامین لکھے جا رہے ہیں، قرارداد جرم مرتب ہو رہی ہے، بلکہ ہو چکی ہے۔ اقرار نامۂ عقاید تیار ہو گیا ہے، جس کا مجھ سے اعتراف کرایا جائے گا اور ان سب کاموں کے چیف ایڈیٹر شاہ صاحب ہیں..... فردِ جرم بہت بڑی ہے ..... اور سب پر مستزاد الحاد اور زندقہ! جن عقاید کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامت اولیائے حق (بھی ہے)......“

اور بہت سے الزامات جرائم کی تفصیل کے بعد لکھتے ہیں:

> ”بھائی حقیقت یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے۔ کہاں تک صبر کروں۔ بار بار قلم اٹھاتا ہوں اور پھر رکھ دیتا ہوں۔ طلبہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں، انھیں بڑی مشکل سے روکتا ہوں کہ فساد سے کیا حاصل ہے۔ دیکھیے کیا انجام ہوتا ہے؟“

اس ظلم کا انجام کیا ہوتا؟ یہ ہوا کہ ایک فتنہ کھڑا کر دیا گیا، شبلی کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری ہوا، ان سے ان کے عقیدے کی بازپرس کی گئی اور ان کی اشاعت سے ندوے کی اصلاح کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے اور دنیا کو اپنا تماشا دکھانے کی پوری کوشش کی گئی۔ اگر ندوے کی اصلاح کی تحریک

اتنی آگے نہ بڑھ چکی ہوتی اور حزب الافساد کی فتنہ انگیزیوں سے پردہ نہ ہٹ چکا ہوتا، تو نہ صرف ندوۃ العلماء کی عظیم الشان تحریک کا خاتمہ ہو چکا ہوتا، بلکہ شبلی کی علمی موت واقع ہو چکی ہوتی اور ان کی موت کے ساتھ ہی سیرت نبوی کی تالیف کا تاریخی منصوبہ بھی دفن ہو جاتا، نہ دار المصنفین کا نقش ظہور پذیر ہوتا اور نہ اس کا مایۂ ناز سلسلۂ خدمات علمی و دینی کا کوئی نشان تاریخ ملت اسلامیۂ ہند کے صفحات میں نظر آتا!

حضرت شبلی مخالفین کے ہجوم کو ظلم اور ظلم بھی حد سے بڑھا ہوا قرار دیتے ہیں لیکن اس ظلم کو مٹانے کی کوئی تدبیر نہ خود کرتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں بلکہ رفع ظلم کے عمل کو فساد قرار دیتے ہیں۔ حال آں کہ فساد ان فتنہ پروروں نے پھیلایا تھا۔ شبلی مرحوم کا رویہ اس کے فروغ کا موجب بنا تھا اور اس کے نتائج نے نہ صرف انھیں پریشان کر دیا تھا بلکہ ندوے کی عظیم الشان تحریک اصلاح کے مٹا دینے کا سروسامان کر دیا تھا۔ مخالفین کی تمام کارروائیاں علی الاعلان تھیں۔ شبلی کو خلوت میں بات کرنے اور ندوے کو تباہی سے بچانے کے لیے اپنی کوششوں کو منظم کرنے میں بھی تذبذب تھا۔ اس تذبذب کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا کہ پورے ملک کو اس فتنے نے ہلا کر رکھ دیا۔ اگر ابوالکلام، حکیم اجمل خاں نہ ہوتے، مولانا محمد علی آخر آخر میں اپنا رویہ نہ بدلتے، دیگر سنجیدہ حضرات میدان میں نہ نکلتے تو ندوے کی قسمت کا فیصلہ تو ہو ہی چکا تھا۔

بہرحال مولانا ابوالکلام میدان میں نکلے، لیکن اس میں شبلی سے محض عقیدت نہ تھی، ندوے کے حفظ و بقا کا مسئلہ خود اتنا بڑا تھا کہ اس کے لیے اپنا سب کچھ لٹایا جا سکتا تھا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آنا چاہیے تھا۔ ابوالکلام نے یہی کیا۔ اس میں شبلی کے علمی مقام اور ان کی عزت و آبرو کا تحفظ بھی تھا۔ ابوالکلام کے سامنے اگر یہی مقصد ہوتا تب بھی اس کے لیے جواز تھا۔ ابوالکلام نے شبلی کی کوئی بے جا طرف داری نہ کی تھی۔ وہ ندوہ اور اس کی تحریک اصلاح کے مخلص و مؤید تھے اور انھوں نے اس کے تحفظ و بقا کی تحریک میں اپنی جان لڑا کر ایک اہم ملی و اسلامی فریضہ انجام دیا تھا۔ انھوں نے ندوے کو انتہائی تخریب اور تباہی سے بچا لیا تھا لیکن اس فتنے کے ختم ہوتے ہوتے شبلی گور کنارے پہنچ گئے۔ تاریخ کے نئے دور میں اور کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے زندہ نہ تھے۔

تحریک اصلاح و بقائے ندوہ اور رفع اختلاف کے سلسلے میں جو جلسہ ۱۰؍مئی کو دہلی میں حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں کی کوشش سے ہونے والا تھا، اس کی مخالفت کی گئی، حتیٰ کہ جلسے کے دوران

اسے درہم برہم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن جلسہ ہوا اور اپنے مقصد میں نہایت کامیاب ہوا۔ اس نے مسئلے کا فیصلہ کر دیا اور جو فیصلہ کیا تھا اسے ندوے کی قابض انتظامیہ کو بھی تسلیم کرنا پڑا۔ جلسے کے بعد مولانا آزاد نے ۱۳ و ۲۰ رمئی ۱۹۱۴ء کے مشترکہ شمارے میں اس پر تبصرہ کیا ہے۔ مسئلے کی اہمیت اور حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنے کے لیے اس مضمون پر نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔ اس کے بعد ایک اور مضمون میں اس مسئلے اور اس کے اطراف پر نظر ڈالی ہے، اس کے بعد ان کے قلم سے کوئی تحریر نظر نہیں آئی۔ سلسلہ بحث اصلاح و بقائے ندوہ و تصفیۂ اختلافات کے باب میں آخری اہم تحریر حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں کے قلم سے یادگار ہے جو جلسہ اور اس کے بعد کے حالات پر تبصرہ اور بعض غلط فہمیوں یا غلط بیانیوں کے رفع و جواب میں ہے۔ اس پر اس بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام نے ندوے کی بقا اور اصلاح کے لیے جو بے غرضانہ کردار پیش کیا تھا اس کا اعتراف علامہ شبلی اور ان کے پورے حلقۂ اثر کو تھا اور ملک کے باخبر حلقوں میں یہ بات ہر کسی کو معلوم تھی کہ ندوے کے فتنہ و فساد کو رفع کرنے میں مولانا ابوالکلام کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا اعتراف ہم پچھلے صفحات میں نقل کر آئے ہیں، جو اس امر میں قول فیصل کا حکم رکھتا ہے۔

اگر الہلال کے ان تمام مضامین، مقالات، افتتاحیہ اور شذرات و مراسلات کو جمع کر لیا جائے جو مولانا نے ندوے کے دفاع میں لکھے تھے تو ندوے کی ایک ضخیم اور نہایت دل چسپ سبق آموز اور عبرت خیز تاریخ وجود میں آ جائے گی۔ لیکن یہاں اس طول کلامی کا مقصد صرف یہ تھا کہ مولانا ابوالکلام کے ندوے سے تعلق کو علامہ شبلی سے تعلقاتِ ارادت اور عقیدت کا رہین منت نہ سمجھا جائے۔ وہ ندوے کی تحریک کی اہمیت کی وجہ سے اس کے مؤید تھے۔ ندوے سے ان کا تعلق حضرت شبلی مرحوم سے راہ و رسم سے پہلے شروع ہوا تھا اور ان کے انتقال کے بعد خود مولانا آزاد کی زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ ندوہ کا جو دور شبلی کی معتمدی اور ان کے تربیت یافتگان اور تلامذۂ خاص کے دور تک رہا تھا، وہ اپنی پیداوار کی قدر و قیمت کے لحاظ سے پلٹ کر نہیں آیا۔ مولانا ابوالکلام کے الفاظ میں:

> ”یہ ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی صورتیں تھیں جو اس کے دارالعلوم کے اولین دور کے نتائج قائمہ ہیں اور جو اپنی ممتاز خصوصیات کے اندر لوگوں کے لیے ایک

دعوتِ جالب اور پیغامِ جاذب تھے۔“

(الہلال: یکم اپریل ۱۹۱۴ء، ص ۵)

ندوہ اپنے مقاصد کی اہمیت اور تعلیمی خدمات کے دائرے میں ہندوستان کی ایک بڑی درس گاہ ہے اور اس کے پڑوسی ممالک میں بھی اس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ ندوہ مسلمانوں کی ایک قابلِ فخر تحریک اصلاحِ ملی کا مرکز ہے۔ وہ اپنی ایک شان دار تاریخ اور نیک نامی کی شہرت رکھتا ہے۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ندوہ سے مولانا آزاد کا تعلق ندوہ کے لیے تھا۔ اس کے تعارف کی تقریب خواہ کچھ ہوئی ہو اور وقتی طور پر کسی کی موجودگی کا ان پر کچھ اثر ہوا ہو لیکن ندوے سے ان کا تعلق نہ کسی کی وجہ سے تھا، نہ کسی کے لیے اور نہ وقتی تھا۔ وہ قیامِ ندوہ کے مقاصد کی اہمیت کا یہ تقاضا سمجھتے تھے کہ اس کو فتنہ و فساد کی نذر ہو جانے سے بچایا جائے۔ اسی لیے ندوے کے خطرات سے محفوظ ہو جانے کے بعد بھی اس سے ان کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی۔ ۱۹۰۵-۶ء میں ندوے کے جن بزرگوں، مثلاً علامہ شبلی نعمانی، حضرت نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سے تعلقات پیدا ہوئے تھے، مولانا آزاد نے نہ صرف ان کی زندگیوں میں نبھایا بلکہ ان کے بعد ان سے رشتے یا شاگردی کا تعلق رکھنے والے ان کے خردوں سے بھی اپنی زندگی میں ہمیشہ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا۔ حضرت شبلی کے شاگردوں کی پوری جماعت سے، جن میں مولانا مسعود علی ندوی، سید سلیمان ندوی، عبدالسلام ندوی، عبدالباری ندوی وغیرہم، حضرت صدر یار جنگ رحمہ اللہ کے خلف سعید حضرت عبیدالرحمٰن خاں شروانی اور ان خلف الرشید ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی سے ان کا ایسا ہی شفقت اور مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے بعد ان کے اخلاف ڈاکٹر عبدالعلی حسنی اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہما اللہ تعالیٰ سے ان کا ہمیشہ محبت اور شفقت کا برتاؤ رہا۔ مولانا علی میاں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر اپنے یادگار مضمون میں ذکر کیا ہے۔ ۱۹۳۹ء کی مولانا سے ایک ملاقات کی گفتگو کے بارے میں لکھا ہے:

> ”مولانا (ابوالکلام) اس مجلس میں دیر تک ندوے کا، مولانا شبلی کا اور ندوے کی تحریک کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے رہے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس تحریک کے پورے طور پر کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے بعد پھر کوئی اس کے

> آستانے پر آکر پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں گیا۔‘‘

(پرانے چراغ (حصہ دوم)، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۲-۵۱)

حضرت مولانا علی میاں نے کئی بار ندوے میں ان کے تشریف لانے، اس کے طلبا اور حضرت سید صاحب وغیرہم سے ملاقات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

> ’’ایک مرتبہ اور بھی طلبہ کی دعوت پر مولانا خطبہ کی انجمن ’’الاصلاح‘‘ میں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تھے۔ رات کا وقت تھا، مولانا کے ساتھ مولانا عبداللہ ورقصوری بھی تھے۔‘‘ (ایضاً، ص ۵۲)

ایک مرتبہ مولانا علی میاں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی دعوت پر دہلی تشریف لے گئے تاکہ ان کی موجودگی میں ’’نزہۃ الخواطر‘‘ کی بقیہ جلدوں کی اشاعت کے لیے توجہ دلائی جائے۔ دہلی میں ملاقات ہوئی، حضرت شیخ الاسلام نے مولانا علی میاں کا تعارف کرایا اور ’’نزہۃ الخواطر‘‘ کا ذکر کیا۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

> ’’مولانا (ابوالکلام) نے اپنی واقفیت اور دلچسپی کا ذکر کیا اور فرمایا، ’’اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہیے۔‘‘ میں نے عرض کیا: کیا یاددہانی کی ضرورت ہوگی؟ تو فرمایا نہیں! چناں چہ ایسے ہی ہوا۔ ادارے سے اس کے بقیہ حصے طلب کر لیے گئے اور پوری کتاب چھپ کر شائع ہوگئی۔‘‘ (ایضاً، ص ۵۷)

ایک اور ملاقات کے بارے میں مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’تیسری ملاقات نئی دہلی میں مولانا کی قیام گاہ پر ہوئی، جس میں مولانا عمران خاں صاحب ساتھ تھے۔ ہم لوگ ندوے کے ایک کام کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ مولانا نے اس سے بڑی دلچسپی لی اور مفید مشورے دیے اور بہت جلد اس کام کی تکمیل ہوگئی جس کے لیے ہم گئے تھے۔‘‘ (ایضاً)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مولانا ابوالکلام پر یہ ایک یادگار مضمون ہے۔ اس کے خاتمے میں انھوں نے مولانا کے بارے میں لکھا ہے:

> ’’وہ (مولانا ابوالکلام) ہندوستانی سیاست اور ہماری قدیم تہذیب وثقافت کا ایک ستون تھے۔‘‘ (ایضاً، ص ۶۰)

نوٹ:

اوپر کے ایک اقتباس میں بعض اشخاص کا ان کے ناموں کے بجائے ان کی وطنی نسبتوں سے ذکر آیا ہے۔ یہ ندوے کی تاریخ کی اہم شخصیات ہیں، لیکن آج کے بہت سے قارئین انھیں ان کی وطنی نسبتوں سے شناخت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی نسبتوں کے ساتھ ان کے ناموں کی وضاحت کردی ہے۔

۱۔ سہارن پوری: مولانا خلیل الرحمٰن ابن مولانا احمد علی محدث سہارن پوری استاذ حدیث علامہ شبلی نعمانی۔

۲۔ شاہ جہاں پوری: مولانا مسیح الزماں خاں استاد و اتالیق نواب میر محبوب علی خاں نظام حیدر آباد دکن۔ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

۳۔ پھلواروی: مولانا شاہ سلیمان

۴۔ کاکوروی: شاید منشی اعجاز علی کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔ شاہ صاحب: اسی اقتباس میں ”شاہ صاحب“ کے عرف سے اشارہ مولانا حافظ شاہ محمد حسین الٰہ آبادی کی طرف ہے۔

جیسا کہ متن کی عبارت سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات علامہ شبلی نعمانی کے مخالف تھے۔ ایسا نہ سمجھ لینا چاہیے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہوں اور وہ کسی درجے میں حالات کی خرابی کا ذمے دار حضرت شبلی کو سمجھتے ہوں یا ان کی کسی کمزوری کی وجہ سے دل میں کوئی رنجش پیدا ہو گئی ہو۔ ندوے کے تو سبھی مخلص تھے۔

ان حضرات خمسہ میں سے نمبر ۱، ۳، اور ۵ تو ندوے سے متعلق پہلے بنیادی جلسے میں شریک تھے جو ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کان پور میں ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ شبلی مرحوم کو سب یکساں نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ شاید بعض اپنی بزرگی کے زعم میں اور بعض اپنے علم و فضل کے مقابلے میں ان کو اہمیت نہ دیتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حسد کی وجہ سے ان کی عیب جوئی میں مصروف رہتے ہوں۔

(۲)

مولانا ابوالکلام نے اصلاح و بقائے ندوہ کی جو تحریک شروع کی تھی۔ اس نے ملک کے سنجیدہ طبقے کو بیدار کر دیا، اسے منظم کیا اور ندوے کو تخریب اور تباہی سے بچانے کے لیے متحد کیا۔ اور حزب اصلاح اور حزب فساد دونوں کو ۱۰؍ مئی ۱۹۱۴ء کی عوامی عدالت دہلی میں لا کھڑا کیا۔ حزب فساد نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور اس سے بچنا چاہا اور اس نے بہت سے ہتھکنڈے استعمال کیے لیکن ملک کی رائے عامہ نہ صرف بیدار ہو گئی تھی بلکہ ان کے خلاف بھی ہو گئی تھی، اس نے اسے عوامی عدالت کے فیصلے سے بھاگنے نہیں دیا۔ ابوالکلام نے تحریک اس خوبی سے چلائی تھی کہ اس میں فریقین سے شبلی کے سوا کسی دوسرے شخص کا نام بھی نہ لیا تھا، نہ کسی ایک شخص پر کوئی الزام لگا کے اسے رسوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے ان پر طرف داری کی کوئی تہمت بھی نہ لگ سکتا ہے۔ انھوں نے اس تحریک کو اصول کی بنیاد پر ایک متعین مقصد کے لیے چلایا تھا اور وہ تھا ایک اہم تحریک کو انتہائی تخریب کے انجام سے بچانا اور اس کی حیات کا سروسامان کر دینا۔ ۱۰؍ مئی کا یوم حساب آیا اور تاریخ کا ایک اہم فیصلہ کر کے گزر گیا۔ ندوے کی موجودہ زندگی کی تاریخ میں ۱۰؍ مئی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ بعد کی زندگی اسی تاریخی فیصلے کی رہین منت ہے۔

۱۰؍ مئی کے جلسے کی تفصیل میں جانے کے بجائے اس کی کارگزاری کی جو روداد کم سے کم الفاظ میں حضرت سید صاحب نے ”حیاتِ شبلی“ میں مرتب کر دی ہے، قارئین کرام کو ہم اسی کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

> ”بہرحال ۱۰؍ مئی ۱۹۱۳ء کو دلی میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی صدارت میں اصلاحی کانفرنس منعقد ہوئی۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے اس کا ایسا معقول انتظام کیا تھا کہ ایسا ہنگامہ خیز اجلاس پوری دل جمعی کے ساتھ بیٹھا اور اس نے اپنا کام کیا۔ اس کانفرنس میں تمام ہندوستان سے لوگ آئے تھے اور ہر طرف سے موافق و مخالف سمٹ کر اس میں جمع ہوئے تھے، دونوں طرف کے ممبروں نے تقریریں کیں، اپنی اپنی رودادیں سنائیں، اور تجویزیں پیش کیں۔
>
> اس سلسلے کا ایک دل چسپ واقعہ یہ ہے کہ محمد علی مرحوم، جو حزب احرار کے دوسرے

دست دراز تھے، وہ ابھی تک گومگو میں تھے، اور پوری مستعدی کے ساتھ ہمارے ساتھ نہ تھے۔ میں اور مولوی مسعود علی صاحب ان سے کئی دفعہ ملے، اور ان کو طلبہ کے مطالبات کی حمایت کے لیے آمادہ کیا، انھوں نے کہا کہ جب تک طلبہ اسٹرائک نہ ختم کردیں میں ان کی حمایت نہیں کرسکتا۔ ہم دونوں نے کہا، اگر آپ ان کے مطالبات کی ذمے داری قبول کرلیں تو امید ہے کہ وہ ابھی اسٹرائک ختم کر دیں گے۔ یہ سن کر وہ خوش ہوئے، کیوں کہ اس سے پہلے بہت سے اکابر اس کے لیے کوشش کرکے ناکام ہوچکے تھے۔ غرض اسی وقت ہم نے اور انھوں نے مل کر طلبہ کو لکھنؤ تار دیا، وہاں سے محمد علی مرحوم کے نام جواب آیا کہ ”ہم بہ خوشی اپنی قسمت کی باگ آپ کے مضبوط ہاتھوں میں دیتے ہیں اور آپ کے حسب مشورہ اسٹرائک کو ختم کرتے ہیں۔“ یہ ایسی خوش خبری تھی کہ محمد علی مرحوم اپنی اس کامیابی پر اچھل پڑے اور فوراً تار لیے ہوئے جلسے میں آئے اور ایک تمہیدی تقریر کے ساتھ اس تار کو پڑھ کر طلبہ کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کردیا۔

دوسرا واقعہ جس نے محمد علی مرحوم کو طلبہ کی حمایت میں اور زیادہ سرگرم بنادیا وہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی تقریر تھی، وہ محمد علی مرحوم کی جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور منتظمین کی حمایت میں ایک مبسوط تقریر کی، میں پاس بیٹھا تھا، محمد علی مرحوم کا یہ حال تھا کہ صاحب زادہ صاحب مرحوم کے ہر ہر فقرہ پر وہ اور زیادہ مشتعل ہوتے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ صاحب زادہ صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہہ اٹھے کہ ”اگر استبداد مجسم دیکھنا ہو تو ادھر دیکھو۔“ آخر صاحب زادہ صاحب کی تقریر کے بعد وہ پھر کھڑے ہوئے اور ایسی گرم اور پرزور تقریر کی کہ استبدادی منتظمانہ اصول کی جڑیں ہل گئیں۔ اس سلسلے میں خواجہ غلام الثقلین، حکیم اجمل خاں، مولانا ابوالکلام، مرزا حیرت دہلوی، سید جالب دہلوی، مولانا عبدالوہاب بہاری نے تائیدی تقریریں فرمائیں۔“

(روداد جلسۂ عام انجمن اصلاح منعقدہ دہلی بہ تاریخ ۱۰ر مئی ۱۹۱۴ء)

اصلاحی سب کمیٹی:

بہرحال ان گرما گرم تقریروں کے بعد حاضرین کی کثرت رائے سے چند تجویزیں منظور ہوئیں اور ایک سب کمیٹی بنی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ ندوے کے لیے ایک نیا دستورالعمل بنائے جس میں کسی کو پھر مستبدانہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔ اس دستورالعمل کے بنانے کا کام حکیم صاحب مرحوم کے حسب منشا پیرزادہ محمد حسین (پنشنر جج دہلی) کے سپرد ہوا، اور حکیم صاحب، مولانا ابوالکلام صاحب، محمد علی مرحوم، مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، خواجہ غلام الثقلین مرحوم، نواب علی حسن خاں مرحوم، حکیم عبدالولی صاحب مرحوم (جھوائی ٹولہ لکھنؤ) وغیرہ ممبر منتخب ہوئے۔

اصلاحی سب کمیٹی نے اپنا کام فوراً ہی شروع کر دیا، پہلی کمیٹی میں محمد علی مرحوم نے اس بات پر زور دیا کہ یہ کمیٹی پچھلے واقعات کی تنقید سے تعلق نہ رکھے، بلکہ یہ پیش نظر رکھے کہ اب ایسے قواعد بنائے جائیں اور جمہور کی قوت کو اتنا بڑھایا جائے کہ آئندہ کسی کو خودمختارانہ کارروائی کا موقع نہ ملے۔ غرض یہ قرار پایا کہ ۲۴ مئی کو ایک جلسہ بلایا جائے جس میں تمام ارکان جمع ہوں اور پورا خاکہ اس طرح مرتب کر دیا جائے کہ بار بار جلسے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ہر طرف کے توسط کے لحاظ سے دہلی کو بہترین مقام جلسہ تجویز کیا گیا (مکاتیب شبلی بنام نواب علی حسن خان) اور مجلس اصلاح ندوہ لکھنؤ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ اس تجویز کے مطابق ۲۴ مئی کو ایک جلسہ ہوا اور آئندہ کارروائی کی راہیں متعین کی گئیں اور پیرزادہ محمد حسین صاحب نے ایک نیا دستورالعمل بنایا جس کو مجلس اصلاح نے چھاپ کر شائع کیا۔

علامہ شبلی کی زندگی کا یہ دور جس اضطراب میں گزرا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ انھوں نے تحریک کو مقصد سے ہمکنار کرنے کے لیے جس ضبط و تحمل کا ثبوت دیا تھا وہ ان کی سیرت کی ایک مثال ہے۔ انھوں نے خود بھی ضبط کیا اور بعض مواقع پر ابوالکلام وغیرہ اور بعض باتوں میں حدود کی پابندی کی تلقین کی اور بے موقع اپنا نام لینے سے بھی منع کیا لیکن اب کہ انھیں اس خرخشے سے نجات مل گئی تھی اور ندوے کے مستقبل کی طرف سے انھیں اطمینان ہو گیا، سیرۃ النبی کی تالیف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

”مولانا نے اس اصلاح ندوہ کے سلسلے میں پورا اپریل، مئی اور جون کا ایک حصہ

> دہلی میں بسر کیا، اصلاحی سب کمیٹی کے کاموں سے فرصت کر کے وہ وسط جون میں بمبئی روانہ ہو گئے اور سیرۃ النبی جلد اوّل کی تکمیل میں مصروف ہوئے اور ساتھ ہی دارالمصنفین کے تخیل کو عملی صورت میں لانے کی تدبیروں پر غور کرنے لگے اور احباب و تلامذہ کو خطوط بھیجتے رہے کہ ندوہ کے پرانے دستورالعمل کے نقائص اور پیرزادہ محمد حسین صاحب کے مجوزہ دستورالعمل پر ناقدانہ مضامین لکھے جائیں۔“

حضرت علامہ ابھی اطمینان کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ مجلس انتظامیہ کے جلسے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ انھوں نے معتمدی کے عہدے سے استعفا دیا تھا، انتظامیہ کی رکنیت سے دستبردار نہیں ہوئے تھے۔ ایجنڈا جو بنایا گیا تھا اس کے آئینے میں بعض دلوں کا کھوٹ صاف نظر آرہا تھا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ ان کا رویہ نہایت مدبرانہ تھا۔ علامہ شبلی نے مولانا عبداللہ ٹونکی کی رپورٹ پر تبصرے میں ۲۵ مئی ۱۹۱۴ء کو خط لکھا تھا، اسے حضرت سید صاحب نے نقل کیا ہے۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

> ”خاص طور پر میری یہ گذارش ہے کہ بجائے اس کے کہ باہمی مخالفت میں دو قوتیں ہمیشہ ٹکراتی رہیں، اسلامی (مصالح) کا یہ اقتضا ہے کہ دو تین شخصوں کو حکم مان کر تمام معاملات ان کے ہاتھ میں دے دیجیے، جو فیصلہ وہ لوگ کریں سب منظور کر لیں، پھر وہ جلسۂ انتظامیہ میں باقاعدہ منظور ہو جائے، ورنہ تمام ہندوستان میں ہم سب کی سخت تضحیک ہو چکی اور ہوتی رہے گی، اس وقت اس بحث سے بھی قطع نظر کیجیے کہ جھگڑا کہاں سے شروع ہوا، کیوں کہ ہر فریق یہی سمجھتا ہے کہ دوسرا فریق برسر ناحق ہے، ایسے اشخاص خود ندوہ میں موجود ہیں، جن کی دیانت پر فریقین کو اعتماد ہے۔“
>
> ”ممبروں کی خالی شدہ جگہوں کے لیے اشخاص ذیل موزوں ہیں:
>
> ڈاکٹر ناظر الدین حسن (بیرسٹر)
> مسٹر ممتاز حسین (بیرسٹر)
> مولوی آزاد صاحب سبحانی (کان پور)
> مولوی سید سلیمان، پونہ، دکن“ (حیات شبلی: ص ۶۶-۶۶۵)

انتظامیہ کا جلسہ ہوا اور افسوس کہ شبلی کے اخلاص کی نہ قدر کی گئی نہ ان کی معقولیت کو تسلیم کیا گیا۔ اس رویے نے ندوے کے مخلصین کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن جن حضرات نے ۱۰ رمئی کے جلسے میں رسوائی کی شرم سے منہ چھپا لیا تھا، ۱۵ رجون کے انتظامیہ کے جلسے میں کامیابی سے ان کے چہرے چمک اٹھے تھے۔ بعد کے چند ماہ غور و فکر اور جدید اقدام کے لیے موقع کی تلاش میں گزرے۔ ابھی کسی نتیجے تک نہ پہنچے تھے کہ ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو حضرت علامہ شبلی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ندوہ تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ حزب فساد جو مر چکی تھی، شبلی کی وفات نے اسے زندگی کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ موجود نہیں رہی، لیکن قدرت کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ شبلی کی وفات پر چند ماہ گزرے تھے کہ انتظامیہ نے ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کا فیصلہ کیا۔۔۔۔ مجلس اصلاح ندوہ نے اصلاحی کاموں کے لیے میدان کو ہموار اور فضا کو سازگار پایا اور بہ قول حضرت سید صاحبؒ:

> "اس موقع پر ۱۸ رمارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام صاحب کی رائے سے نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم نے دفتر نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی، مصالحت کا مبارک وقت آ پہنچا تھا، اس لیے ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا اور مولانا ابوالکلام صاحب، بابو نظام الدین صاحب رئیس امرتسر، ڈاکٹر ناظر الدین حسن بیرسٹر لکھنؤ (حال نواب ناظر یار جنگ جج ہائی کورٹ حیدرآباد) اور نواب سید علی حسن خاں صاحب، اور موجودہ ارکان ندوہ کی طرف سے مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب، منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری، مولوی محمد نسیم صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ، مولوی ظہور احمد صاحب وکیل لکھنؤ اور مولوی اعجاز علی صاحب رئیس کاکوری منتخب ہوئے۔ یہ اصحاب ۳۱ رمارچ کی رات کو بعد مغرب دارالعلوم کی عمارت میں جمع ہوئے اور تمام امور پر نہایت ہمدردی سے غور و فکر کیا اور حسب ذیل امور اتفاق کامل سے منظور کیے:
>
> ۱۔ ندوۃ العلماء کے دستور العمل میں مناسب اصلاح و ترمیم،
>
> ۲۔ مسئلۂ نظامت کا تصفیہ، مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوری نے استعفا دیا اور ان کی جگہ مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم کو سب نے بالاتفاق ناظم منتخب کیا۔

جس کو مولانا نے اصرار کے بعد قبول فرمایا،

۳۔ معتمد صاحب مال نے اپنے تمام حسابات کی جانچ پڑتال کی شرط کو منظور کیا،

۴۔ دارالعلوم کے طلبائے قدیم میں سے پانچ اشخاص کو ندوے کا ممبر بنانا قبول کیا۔

اس تصفیے کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب "مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے ضروری اجلاس میں شرکت کے لیے پہلی اپریل کو علی گڑھ چلے گئے جہاں سے وہ ۵/اپریل کو واپس آکر ندوے کے آخری سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے اور مجلس اصلاح کی طرف سے کھلے جلسے میں تمام اختلافات کے خاتمے کا اعلان کیا اور دونوں فریق نے اتحاد و اتفاق کے اس پُرمسرت منظر پر خوشی ظاہر کی، لیکن اس خوشی و شادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ یہ تھی کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی، مگر اس کی روح، امید ہے کہ شاد ہوئی ہوگی۔"

(حیات شبلی۔ ص ۴۶۶_۴۶۷)

حواشی

۱۔ اگست ۱۹۰۳ء میں الندوہ کا پہلا شمارہ شاہجہان پور سے شائع ہوا تھا۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء تا مارچ ۱۹۰۶ء مولانا ابوالکلام اس کے نائب مدیر رہے۔ اس دور کے اہم اور قابل ذکر مضامین کی جو فہرست زمانی اعتبار سے علامہ شبلی نے بنائی تھی، اس میں آخری مضمون (نمبر ۱۷) المرأۃ المسلمۃ پر مولانا آزاد کے قلم سے تبصرہ ہے۔ ابھی اس کا کچھ حصہ باقی تھا کہ مولانا وکیل امرتسر میں چلے گئے۔ اور یہ تبصرہ ترمیم و اضافہ اور تصحیح و تکمیل کے بعد وکیل بک ایجنسی، امرتسر کی طرف سے کتابی صورت میں ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان سے اب تک بیسیوں بار چھپ چکا ہے۔ (ا۔ س۔ ش)

(۵)

ندوۃ العلماء اور مولانا ابوالکلام آزاد

افادات مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

میں نے کہا کہ الندوہ سے مولانا ابوالکلام کے ضابطے کے تعلقات ختم ہو جانے کے بعد بھی مولانا آزاد کا تعلق الندوہ سے اور ندوۃ العلماء سے ختم نہیں ہو گیا تھا۔ الندوہ سے ان کا قلمی تعلق رہا اور ندوۃ العلماء کے حفظ و بقا کی جنگ میں انھوں نے ندوہ کے بزرگوں، مخلصوں اور بہی خواہوں کے ساتھ مل کر اس کے مخالفوں اور دشمنوں کا ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ اور ملک کی رائے عامہ کو ایسا ہموار کیا کہ کہہ و مہ کے نہ صرف کان ندوہ کی تحریک اور اس کے مقاصد سے آشنا ہوئے بلکہ ندوے کا نام لوگوں کے دلوں پر نقش ہو گیا۔ مولانا نے ندوے کے کاموں کے لیے نہ صرف اپنے وقت کا ایثار کیا، بلکہ صلاحیتوں کو صرف کیا اور الہلال کے سیکڑوں صفحات کو ندوے کے ذکر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بلاشبہ ملک کے بعض دوسرے اخبارات زمیندار لاہور، ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہا نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا، لیکن الہلال کا پیمانۂ خدمت بہت بلند اور اس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

الندوہ اور ندوۃ العلماء سے تعلق و خدمت کے علاوہ ندوہ کے بزرگوں، مثلاً علامہ شبلی نعمانی، حضرت صدر یار جنگ مولانا شروانی، نواب سیّد علی حسن خان، مخلصین میں مولانا سیّد عبدالحی اور احباب میں سیّد سلیمان، مولانا مسعود علی، مولانا عبدالسلام، ضیاء الحسن علوی، مولانا عبدالباری، مولانا ریاست علی اور خردوں میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی، عبدالرحمٰن نگرامی، اور ندوے سے باہر اسی حلقے کے ارکان میں عبدالماجد دریابادی وغیرہم سے ان کے تعلقات ہمیشہ قائم رہے اور ان کا احترام کیا، اور اگرچہ سیاسی ذوق و عمل کی بنا پر دیو بند کے ایک بزرگ اور ان کے بعض تلامذہ سے وہ بہت قریب تھے اور اسی ذوق کی بنا پر وہ جمعیت علمائے ہند کی شوریٰ میں ہمیشہ شریک رہے

اور اگر کبھی ایسا نہ ہوا تب بھی کسی نہ کسی طرح اہم سیاسی مسائل میں انھیں شریک کر لیا جاتا رہا اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے تعلقات خاطر اور حضرت کے ان کی جانب التفات کی بنا پر تو انھیں جمعیت کے حلقے میں ایک بزرگ، ایک معمر اور مدبر کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ابوالکلام کا حلقۂ احباب بیشتر حضرت شبلی کے تلامذہ کا تھا۔

اس بحث میں دور تک جانا اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ البتہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بعض افادات اس مقام پر مرتب کر دینا نہایت مفید خیال کرتا ہوں۔ مولانا علی میاں نے اپنے مضمون میں نہ صرف اپنی ارادت اور تعلق کا ذکر کیا ہے، بلکہ انھوں نے اپنے شعور سے پہلے کے بزرگوں کے تعلقات، ان کے رویوں اور ان کے دیکھنے والوں کے بیانات، الندوہ کے زمانۂ ادارت کے بعض واقعات و واردات، اپنے والد گرامی مولانا سید عبدالحی سے روابط، اس دور کے بعد کے ایام میں ندوہ، تحریک ندوہ اور علامہ شبلی کی کسی خصوصیت کے اعتراف، انجمن اصلاح میں مولانا کی شرکت، ندوے کے طلبہ سے مولانا کی ملاقاتوں کا تذکرہ، ندوے کے کاموں میں ان کی معاونت، نزہۃ الخواطر کی اشاعت سے مولانا کی دلچسپی کے جو واقعات بیان فرمائے ہیں ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ندوہ اور اس کے متعلقین مولانا کو کتنے عزیز تھے اور اسی تعلق کا نتیجہ تھا کہ جب بھی انھیں ندوے کے کسی کام کی طرف توجہ دلائی گئی انھوں نے اس بارے میں صائب مشورہ دیا اور نہایت خوش دلی سے وہ کام کروا دیا۔

الندوہ کی ادارت اور قیام لکھنؤ کا زمانہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے شعور ہی سے پہلے کا نہیں بلکہ حضرت کی ولادت (۲۴ر نومبر ۱۹۱۳ء) سے بھی پہلے کا زمانہ تھا۔ اس دور کی باتیں انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنی تھیں۔ اگرچہ مثل تو یہ ہے کہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ لیکن تاریخ و سوانح ہی میں نہیں، مذہب میں بھی سماعت کا ایک مقام ہے۔ خواہ وہ رویت و شہادت کے برابر نہ ہو۔ لیکن قیاس کے مقابلے میں سماعت کا مقام بہت اونچا ہے۔ پھر راوی کی حیثیت بھی حضرت مخدومی مولانا علی میاں جیسی ہو تو روایت کا درجۂ استناد انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ مولانا علی میاں فرماتے ہیں کہ ہمارے یہ بزرگ عزیز مولانا کے کچھ ایسے معتقد نہ تھے۔ لیکن وہ مولانا کی غیر معمولی ذہانت، حاضر دماغی، انشا پردازی اور اس کے ساتھ ان کی خودداری اور لطافت و ظرافت کے قصے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ لیکن سترہ برس کی عمر کے "بڈھا" سے ذہانت، حاضر دماغی، انشا پردازی تک کے

چٹکلے چتوں کی توقع کرنا چاہیے۔ اگر اس میں خودداری اور نظافت و لطافت کی خوبیاں بھی ہوں تو کیا کہنا! اگر انھیں ان میں بزرگی نظر نہیں آئی تو انھوں نے بھی ابوالکلام کی شرافت اور سلامتی طبع کا انکار تو نہیں کیا۔ انھوں نے بھی ان کی خوبیاں ہی بیان کیں! اور پھر ان کے معتقدین نے بھی انھیں مادر زاد ولی کب کہا؟ پھر یہ زمانہ تو واقعتاً ان کے شک و تذبذب ہی کا نہیں کامل درجے میں الحاد کا تھا، جس نے ان کے گھر کے دینی ماحول میں ان کی زندگی کو مشکل بنا دیا۔ اور اسی لیے وہ گھر سے دور اور اس کے ماحول سے نفور تھے۔ اس دور کے ابوالکلام کے لاابالی پن اور آزادروی کے قصے تو عام طور پر مشہور ہیں۔ خودداری اور نظافت و لطافت کے ساتھ وضع داری اور رکھ رکھاؤ کی صفات ملتی جلتی ہیں۔ ان کی ذات میں اس وقت بزرگی، پرہیزگاری، زہد و تقویٰ اور دین داری کی اعلیٰ صفات اور مثالی اور معیاری انسانی صفات کا ان میں تلاش کرنا خود ان بزرگوں کے دینی ذوق و نظر کی خوبی تو ہے، ابوالکلام کی ذات میں کوئی عیب نہیں۔ ان پر اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ الحاد و فسق کی جس دلدل میں پھنس گئے تھے، اس سے انھیں نجات ملی اور اس پر انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے۔ ان کے معتقدین کے لیے بھی خوشی کا بہت بڑا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا انجام بخیر فرمایا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ! بزرگوں نے ابوالکلام کے بارے میں جو کچھ بیان کیا درست تھا۔ انھوں نے ان کی تنقیص نہیں کی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ کہا وہ تنقید کے درجے میں بھی نہیں آتا، تذکرے ہی کے دائرے میں رہتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابوالکلام کا قیام اس زمانے میں گولا گنج میں ندوے کی قدیم عمارت میں تھا۔ اور حضرت علامہ شبلی کے قریب ہی میں ان کا کمرہ تھا۔ یہ بات خود ابوالکلام نے بیان کی ہے۔ وہ بھی شبلی ہی کی طرح سحر خیزی کے عادی تھے اور صبح سویرے ان کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ چائے کا دور چلتا تھا اور علمی، ادبی، تاریخی تذکرے رہتے۔ ابوالکلام بیان فرماتے ہیں:

> "ہر وقت مولانا (شبلی) مرحوم سے یک جائی رہتی۔ وہ بھی صبح سویرے اٹھنے کے عادی اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر! جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ اسی وقت چائے کا دور چلتا۔ طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ اکثر فارسی اشعار کو اپنے خاص لحن میں ترنم کرتے۔ ان اشعار کے متعلق تذکرے رہتے۔" (آزادی کی کہانی، ص ۳۱۴-۱۵)

اسی سال (اگست ۲۰۰۵ء) خاکسار کو ہندوستان کے سفر کا اتفاق ہوا تو ندوۃ العلماء میں ایک ہفتہ قیام رہا، اس دوران گولا گنج بھی جانے کا موقع ملا اور خاتون منزل بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ یہاں تو دارالعلوم کے طرز کی کوئی عمارت ہی نہیں۔ میں اندازہ نہیں کر سکا کہ کہاں کلاسیں ہوتی ہوں گی اور کہاں اور کس طرح طلبہ کی رہائش ہوگی؟ یہیں الندوہ کا دفتر ہوگا، یہیں ابوالکلام نے قیام کیا تھا، یہیں علامہ شبلی قیام کرتے تھے۔ اس وقت کا ندوہ میرے تخیل میں آج کے ندوے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بہرحال یہیں کسی مکان کے کسی کمرے میں الندوہ کا دفتر ہوگا، یہیں کسی جگہ شبلی رہتے ہوں گے اور اس کے قریب ایک کمرے میں ابوالکلام کی رہائش ہوگی۔

اب میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پر لطف بیان اور قارئین کے درمیان حائل رہنا نہیں چاہتا۔ حضرت فرماتے ہیں:

> ”میرے ذہنی شعور اور پڑھنے لکھنے کا زمانہ وہ ہے، جب مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان میں طوطی بولتا تھا۔ اُردو کا یہ پرانا محاورہ کسی اور مقرر، مصنف یا ادیب و شاعر کے متعلق اتنا صحیح اور حسب حال نہیں، جتنا مولانا آزاد کے متعلق ہے۔ علمی و ادبی ذوق رکھنے والوں میں سے شاید کوئی ایسا آدمی ہو جو ان کی خطابت و زورِ قلم کا قائل اور ”الہلال“ کے سحر حلال سے مسحور نہ ہوا ہو! میری جس ماحول میں پرورش ہوئی وہ ان کے افکار و خیالات سے پورے طور سے ہم آہنگ تھا اور ان میں ایسے متعدد اشخاص تھے جنھوں نے مولانا کو آغاز شباب میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ رسالہ ”الندوہ“ کے معاون مدیر کی حیثیت سے پرانے ندوے میں (جو گولا گنج کی اس عمارت میں تھا، جس کو اب خاتون منزل کہتے ہیں، اور جو مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی مرحوم لکھنؤ کی قیام گاہ رہی ہے) مقیم تھے، اور علامہ شبلی کی علمی صحبتوں سے استفادہ کرتے تھے۔
>
> ہمارے یہ بزرگ عزیز مولانا کے کچھ ایسے معتقد نہ تھے، لیکن وہ مولانا کی غیر معمولی ذہانت، حاضر دماغی، انشاپردازی اور اس کے ساتھ ان کی خودداری اور نظافت ولطافت کے قصے اس طرح مزے لے لے کر سناتے تھے کہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم یونان کے حکما و فلاسفہ اور الف لیلہ کی خیالی شخصیتوں کے قصے سن رہے

> ہیں۔ ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ وہ مولانا کو معیاری اور مثالی انسان سمجھتے ہیں، جو ہر طرح کے نقص یا تنقید سے بالاتر ہو بلکہ کچھ معاصرانہ تنقیدی اشارے بھی ہوتے تھے، لیکن ان سب کا ان کی غیر معمولی ذہانت، خداداد حافظے اور خودداری وخود اعتمادی کے نمایاں وصف پر اتفاق تھا۔"

ندوے میں جو حضرات مولانا ابوالکلام کے بہت قریب تھے، انھوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا اور جانچا پرکھا تھا۔ ان میں سے حضرت سید سلیمان ندوی کے حوالے سے حضرت مخدومی مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

> "بعد میں حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی متعدد مجلسوں میں ان کی غیر معمولی ذہانت، اخذ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت، پھر اس کو بہتر سے بہتر طریقے پر پیش کرنے اور اپنے معلومات سے کام لینے کی غیر معمولی قابلیت کے واقعات سنے۔"

ابوالکلام کی ایک آزمائش:

اس زمانے میں بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ حضرت علامہ شبلی نے کسی سے کوئی مضمون لکھوایا۔ پسند نہ آیا تو دوسرے سے لکھوایا لیکن ان کے ذوق و معیار پر پورا نہ اترا اور ان کی اس پریشانی کو مولانا ابوالکلام نے آسان کر دیا اور وہ خوش ہو گئے۔ ایسے مواقع کی طرف حضرت مولانا علی میاں نے توجہ دلائی ہے۔ اگرچہ معصوم الفاظ میں اس کے راوی حضرت سید صاحب نہیں ہیں، لیکن جس تسلسل میں ان مواقع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس سے تو یہ روایت حضرت سید صاحب ہی کی معلوم ہوتی ہے اور اس بات سے تو انکار کیا نہیں جا سکتا کہ اگر سید صاحب اس کے راوی نہیں تو جن حضرات سے یہ روایت سنی گئیں ان میں حضرت سید صاحب کا شمار ہوتا ہے اور ان کے مؤید تو ضرور ہیں! مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

> "بارہا ایسا ہوا کہ علامہ شبلی نے اپنے ارشد تلامذہ سے کسی موضوع پر لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے مواد و معلومات کا ایک ذخیرہ رکھ دیا، ان کے بعض لائق ترین تلامذہ نے مضامین لکھ کر پیش کیے، لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے، بعض مرتبہ کئی

بار یہ کوشش کی گئی اور نا کام رہی۔ مولانا آزاد کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، قریب آئے اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ علامہ شبلی نے مختصر تقریر کی، وہ اسی وقت بیٹھ گئے اور مضمون لکھ کر پیش کیا، مولانا نے فرمایا، بس میں یہی چاہتا تھا۔

یہ مضامین بعض اوقات بڑے نازک اور دقیق کلامی و فلسفیانہ مباحث پر ہوتے تھے، حاضرین مجلس کو یقین ہوتا تھا کہ اس موقع پر اس نوجوان انشا پرداز کا، جس نے اپنی طلاقت لسانی سے سب پر اپنے علم و مطالعے کا سکہ بٹھا رکھا ہے، بھرم جاتا رہے گا اور اس کی علمی کم مائیگی کا راز فاش ہو جائے گا، لیکن معاملہ ہمیشہ اُلٹا ہوا اور وہ ہر مرتبہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔"

(پرانے چراغ ۲: ص ۳۵)

مولانا سید عبدالحی اور ابوالکلام:

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد گرامی حضرت مولانا سید عبدالحی (دسمبر ۱۸۶۹ء۔ فروری ۱۹۲۳ء) کا ندوۃ العلماء سے تعلق جس اخلاص، ایثار، ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ طویل عرصے تک رہا تھا، اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ وہ ۱۸۹۴ء میں کانپور کے جلسۂ ندوہ میں شریک تھے۔ اس وقت ندوے کے مقصد سے انھوں نے جو پیمان وفا باندھا تھا اسے زمانے کا کوئی فساد و انقلاب توڑ نہ سکا تا آں کہ فرشتۂ اجل نے ۱۹۲۳ء میں ان کی دنیوی زندگی کا ورق الٹ دیا۔ تقریباً تیس برس ندوے سے ان کا تعلق رہا۔ اس مدت میں ندوے کے پہلے ناظم حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری کے معاون و معتمد خصوصی اور دوسرے ناظم مولانا مسیح الزماں خاں شاہ جہان پوری کے مددگار ناظم رہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ ندوے کے ناظم ہو گئے۔ دفتر شاہ جہان پور منتقل ہوا تو انھوں نے بھی وہیں رہائش اختیار کر لی۔ دفتر کے معتمد اور انتظام کے ذمہ دار تھے۔ الندوہ جاری ہوا تو مضامین کی فراہمی اور انتخاب کے سوا تمام ذمے داریاں انھی کی تھیں۔ کہنے کو ان کا شعبہ نظامت دفتری کا تھا لیکن ندوے کی خدمت کے شوق میں کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہ تھا جو انھیں سونپا گیا ہو، انھوں نے اس کی بجا آوری کی ذمے داری بخوشی قبول نہ فرمائی ہو، اور خوش اسلوبی

نے اسے انجام نہ دیا ہو۔

اس کے ساتھ وہ ایک طبیب حاذق اور بلند پایہ کتب کثیرہ عربی و اردو کے مصنف اور مؤلف بھی تھے۔ ان کی زندگی کے تمام معاملات مدت العمر معاش کے لیے مطب، خدمت کے لیے ندوہ، علمی و ادبی ذوق کی تسکین کے لیے تصنیف و تالیف اور شوق مطالعہ کے کاموں تک محدود رہے۔ ندوے کے کاموں اور فرائض کی ادائیگی کے ذوق نے ملک کے دور دراز گوشوں تک ان کے روابط کو پھیلا دیا تھا اور تصنیف و تالیف کے کمال شوق نے انھیں اصحاب ذوق کا مرجع بنا دیا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ خود زحمت اٹھائی اور کسی چھوٹے بڑے کو علمی کاموں میں رہنمائی اور تعاون سے مایوس نہ کیا۔ ان کے اخلاص کے سب معترف اور اخلاق کے سب گرویدہ تھے۔ ان کی خدمات علم و ادب اور فن میں تاریخ، تذکرہ، سوانح، ادب و تاریخ اردو و عربی، تنقید، طب وغیرہ اور ان کے انواع و اقسام اور اطراف و متعلقات تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لیے ہر ذوق و فن کا شائق ان کے پاس آتا تھا اور اگرچہ کسی ادیب کے لیے اپنی زیر تصنیف کتاب سے استفادے کا موقع فراہم کرنا سخت مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن انھیں اس قسم کی خدمت میں بھی کسی خاص و عام سے تکلف نہ ہوا۔

اس حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی ان کے تعلقات تھے اور ابوالکلام (۱۸۸۸ء) ان سے ۱۸، ۱۹ برس چھوٹے تھے، عمر کے لحاظ سے وہ مولانا سید عبدالحی حسنی کے فرزند اکبر مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (دسمبر ۱۸۹۳ء - مئی ۱۹۶۱ء) کے قریب العمر تھے، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر دونوں کے روابط میں دوستی کا تعلق تھا۔ مولانا علی میاں مرحوم نے اپنے والد گرامی مرتبت سے ابوالکلام کی بعض نسبتوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں، جو اب ''پرانے چراغ'' (حصہ دوم) میں شامل ہے، فرماتے ہیں:

> ''ندوے کے تعلق نیز خاندانی تعارف کی بنا پر وہ میرے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ مرحوم سے ملنے مکان پر ضرور کئی بار آئے ہوں گے۔ مجھے ان کے قلمی ذخیرے اور کاغذات میں ایک وزیٹنگ کارڈ ملا جس پر حاذق الملک حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں کے دستخط ہیں، والد صاحب کے نام ان کے ایک سے زاید خط ہمارے خاندانی مرقع خطوط کی زینت ہیں۔ تعارف و تعلق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی جوانی کے آغاز میں شمس العلماء

> مولانا محمد یوسف رنجور عظیم آبادی کی، جو کلکتہ میں مقیم تھے، عرصے تک صحبت میں رہے اور استفادہ کیا، وہ خاندانِ صادق پور کے چشم و چراغ تھے، جو حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے مخلص و صادق اور وفادار ترین معتقدوں میں تھا، اور جس کا ان قربانیوں میں سب سے بڑا حصہ ہے جو سیّد صاحبؒ کی دعوت و تحریک کے مجاہدوں کو انگریزی دورِ اقتدار میں دینی پڑیں۔
>
> جب ان صادقینِ صادق پور کا پہلا تذکرہ اردو میں "الدر المنثور" یا "تذکرۂ صادقہ" کے نام سے شائع ہوا، جو مولانا عبدالرحیم صاحب صادق پوری اسیر انڈمان کے قلم سے تھا تو اس پر مقدمہ ایک نوجوان، گمنام اہلِ قلم محی الدین ابوالکلام احمد کے قلم سے تھا، جس میں قدیم طرزِ تحریر کا رنگ ہے، اور اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کا لکھنے والا کسی دن ہندوستان کے علمی و ادبی مطلع پر ہلالِ عید بن کر اس طرح چمکے گا کہ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جائیں گے۔
>
> لیکن مجھے ان کا گھر پر آنا یاد نہیں اس لیے کہ والد صاحب کا انتقال ۲ فروری ۱۹۲۳ء کو ہوا، اس وقت میری عمر ساڑھے نو سال کی تھی، اس سے پہلے کا زمانہ، جب وہ ندوے کے قیام میں یا خلافت تحریک کے آغاز میں کبھی ملنے آتے رہے ہوں گے، میرے شعور سے پہلے کا زمانہ ہے۔"

بلاشبہ ابوالکلام حضرت مولانا حکیم سیّد عبدالحی حسنی سے کئی بار ملے ہوں گے، اس لیے کہ اس کے بغیر تعلقات میں پختگی اور بے تکلفی اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوتی اور جب تک یہ اعتماد پیدا نہ ہو جائے اس سے کسی کی سفارش نہیں کی جاتی۔ چوں کہ تعلقات اس منزل سے گزر چکے تھے اور اعتماد پیدا ہو گیا، اس لیے انھوں نے ایک صاحب کے لیے ان کی تالیف سے استفادے کا موقع دینے کی سفارش کی تھی۔ اس سلسلے میں ابوالکلام کا ایک خط حضرت مولانا علی میاں نے اس خاکسار کو عنایت فرمایا تھا جو اس کے مرتبہ مجموعۂ خطوط (غیر مطبوعہ) میں شامل ہے۔ ایک خط مولانا علی میاں کے بڑے بھائی ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنی کے نام بھی ہے، جو کسی کام میں ایک شخص کی رہنمائی کی سفارش کے مضمون ہی میں ہے، یہ خط خاکسار کے مرتبہ مجموعے "مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد" (مطبوعہ) کراچی، ۱۹۶۹ء میں شامل ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کروں کہ حضرت

مولانا علی میاں نے مولانا کے مکتوب بنام مولانا سید عبدالحی حسنی بھیجا تھا تو یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ یہی خط دستیاب ہوسکا ہے۔

ہمیں حضرت مولانا حکیم عبدالحی رحمۃ اللہ کی کوئی تحریر واثر ابوالکلام کے بارے میں دستیاب نہیں ہوا، لیکن ندوہ کے اجلاس دہلی (۱۹۱۰ء) کی روداد مولانا کے قلم سے یادگار ہے۔ اس میں حضرت مولانا حکیم صاحب کے تذکرے میں ان کے اخلاص، ایثار اور خدمات کا جو عظیم الشان اعتراف کیا ہے وہ ان دونوں بزرگوں کے مابین اخلاص و محبت کے تعلقات کا بڑا ثبوت اور ان دونوں کے اس عقیدت کیش کے لیے بہت فخر و مسرت کا سرمایہ ہے۔ ہم اس تحریر کے لطف مطالعہ میں اپنے قارئین کو بھی شامل کرلینا چاہتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:

”اس اجلاس میں پریسیڈنشل ایڈریس کے علاوہ دو اور اہم کارروائیاں ہوئیں۔ ندوۃ العلماء کی رپورٹ مولانا سید عبدالحی صاحب سیکریٹری دفتر ندوۃ العلماء نے حسب معمول پیش کی اور مولانا شبلی کا لیکچر ندوے کی ضرورت اور اس کے مقاصد پر، جن کی تقریریں اجلاس ہائے ندوہ کی سب سے زیادہ قابل قدر نعمت ہے۔“

اس تمہید کے بعد خاص طور پر حضرت کے نام نامی کو عنوان قرار دے کر لکھتے ہیں:

”مولانا سید عبدالحی

مولانا سید عبدالحی کا چوں کہ ذکر آگیا ہے، اس لیے یہ کہے بغیر قلم آگے نہیں بڑھتا کہ مولانا شبلی کے بعد وہ دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے ندوۃ العلماء کی خدمت گزاری میں قابل صد تحسین ایثار نفس سے کام لیا ہے اور آغاز کار سے اس وقت تک ندوے کی تاریخ میں ایک مثال رہے ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ فرض اور ضمیر کے معانی سے قوم کی قوم بیگانۂ محض ہو رہی ہے اور قومی ترقی کے عام شور و غوغا میں ایک آواز بھی خلوص اور ایثار کی سنائی نہیں دیتی، ایک ایسے شخص کی تعریف کیوں نہ کی جائے، جس نے ابتدا سے ندوے کا ساتھ دیا اور اس وقت بھی جب کہ حد درجے کی کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں ندوہ چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے اغراض شخصیہ کے لیے مفید نہ پاکر تمام مدعیان کار ایک ایک کرکے الگ ہو

> رہے تھے، وہ اس کی خدمت میں برابر سرگرم رہا اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ باوجود مالی بے اطمینانی و ضروریاتِ معاش کے جو قلیل رقم ندوہ پیش کرتا تھا، اس کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا وجود فرض کے خیال اور ایثار کے جوش کا کتنا مؤثر نمونہ ہے۔"

(الندوۃ، لکھنؤ، بابت ماہ اپریل ۱۹۱۰ء، ص ۱۰)

مولانا آزاد سے کئی اور نسبتیں:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے مولانا آزاد کو کئی لحاظ سے تعلق خاطر تھا۔ پہلا اور قریبی تعلق تو ندوے ہی کا تھا۔ اس کے ساتھ انھیں خاص شفقت اس وجہ سے تھی کہ وہ ان کے دوست کے خلفِ رشید ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے، جو مولانا کے قریب العمر ہیں اور قریبی تعلق بھی زیادہ ہے، برادرِ خورد ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپی یہ تھی کہ ان کا تعلق حضرت سید احمد رائے بریلوی شہید کے خانوادۂ اصحابِ عزیمت و ایثار سے ہے اور سید احمد شہید پر وہ ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ ان متعدد نسبتوں کی بنا پر ان سے زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ مولانا سید علی میاں مرحوم نے مولانا آزاد سے اپنی کئی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک ملاقات میں مولانا علی میاں اپنی ایک کتاب کا مسودہ لے گئے تھے اور اس پر مقدمے کے لیے مولانا سے درخواست کی تھی اور مولانا نے وعدہ بھی فرما لیا تھا۔ لیکن جب کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کتاب میں مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی کا شامل تھا۔ مولانا سے ملاقات ہوئی تو فرمایا، "مجھے اس سلسلے میں تمھارا کوئی خط نہیں ملا۔ بہرحال مقدمہ اب بھی لکھا جا سکتا ہے اس کا وقت اب بھی ہے۔" مولانا سید علی میاں فرماتے ہیں:

> "میں نے مناسب جواب دیا لیکن اصرار نہیں کیا۔ افسوس ہے کہ مولانا کی مصروفیات اور ان کی ذمہ داریوں کی بنا پر جو بڑھتی ہی گئیں، اس کی نوبت نہیں آئی۔"

مولانا شبلی کا ذکر:

اسی ملاقات کی تفصیلات میں یہ بھی لکھا ہے:

> ''مولانا اس مجلس میں دیر تک ندوے کا، مولانا شبلی کا اور ندوے کی تحریک کی اہمیت اور افادیت کا ذکر کرتے رہے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس تحریک کے پورے طور پر کامیاب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے بعد پھر کوئی اس کے آستانے پر آکر پاؤں توڑ کر بیٹھ نہیں گیا۔''

مولانا علی میاں مرحوم نے ایک اور ملاقات کا ذکر فرمایا ہے کہ دارالعلوم کے کچھ طلبہ مولانا آزاد کو یہ تاثر دے کر کہ مولانا شروانی تشریف لائے ہیں، دارالعلوم میں ہیں۔ مولانا آزاد ان سے ملاقات کے شوق میں کشاں کشاں تشریف لے آئے، لیکن انکشاف حقیقت کے بعد وہ طلبہ پر ناراض نہیں ہوئے۔ بقول مولانا علی میاں کے ''اس میں ناگواری و احتجاج کی تلخی نہ تھی۔ ایک بزرگانہ شکایت، جس میں محبت و شفقت کی آمیزش تھی۔''

طلبہ کی انجمن میں شرکت:

مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ اور بھی طلبہ کی دعوت پر مولانا طلبہ کی انجمن ''اصلاح'' میں تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تھے، رات کا وقت تھا۔ مولانا کے ساتھ مولانا عبدالقادر قصوری بھی تھے۔ یہ واقعہ اور پیشتر کا ہے۔''

(ایضاً، ص۵۲_۵۳)

زمانۂ وزارت میں تین ملاقاتیں:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا کے زمانۂ وزارت میں اپنی تین ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے:

> ۱۔ ''تین مرتبہ زمانۂ وزارت میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ایک مرتبہ جب

مولانا حسین احمد مدنیؒ کی دعوت پر دہلی اس لیے گیا تاکہ وہ مولانا کو میری موجودگی میں والد صاحب کی کتاب "نزہۃ الخواطر" کی طرف توجہ دلائیں، جس کی چار یا پانچ جلدیں دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد نے شائع کی تھیں، لیکن پولیس ایکشن کے بعد اس کا سلسلہ رک گیا تھا، یہ ملاقات جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی کے ایک جلسے میں ہوئی جو گلی قاسم جان میں ہو رہا تھا۔ مولانا آزاد تشریف لائے تو مولانا مدنیؒ نے میرا تعارف کرایا اور "نزہۃ الخواطر" کا ذکر کیا، مولانا نے اپنی واقفیت اور دل چسپی کا اظہار کیا اور فرمایا: اس کتاب کو ضرور چھپنا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا یاد دہانی کی ضرورت ہوگی؟ تو فرمایا نہیں۔ چناں چہ ایسے ہی ہوا۔ ادارے سے اس کے بقیہ حصے طلب کیے گئے اور پوری کتاب چھپ کر شائع ہوئی۔"

(ایضاً، ص ۵۷)

حضرت مولانا سید علی میاں نے نزہۃ الخواطر کی جلد ہشتم (۱) میں بھی اس واقعے کا ذکر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"آپ (مولانا مدنیؒ) نے اس زمانے کے جمہوریہ ہند کے وزیر المعارف مولانا ابوالکلام آزاد کو اس کی اہمیت اور اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی۔ مولانا آزاد خود بھی صاحب کتاب سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کتاب کی اہمیت بھی ان کے دل میں تھی۔ چناں چہ آپ نے دائرۃ المعارف (حیدرآباد دکن) کو اس کے بقیہ حصوں کو شائع کرنے کے لیے اشارہ فرمادیا۔ چناں چہ اس کے بعد اس کا چھٹا حصہ ۱۹۵۷ء میں اور ساتواں حصہ ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آگیا۔"

(چودھویں صدی کے علمائے برصغیر، نزہۃ الخواطر۔ (۸)، کراچی ۲۰۰۲ء، ص ۳۱)

۲۔ "دوسری ملاقات پارلیمنٹ ہاؤس میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ اس ملاقات میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان مصری ساتھ تھے۔ مولانا نے ان سے مختصراً عربی میں گفتگو کی اور انڈونیشیا کی "ماشومی" پارٹی کے متعلق دریافت کیا۔"

۳۔ "تیسری ملاقات نئی دہلی میں مولانا کی قیام گاہ پر ہوئی، جس میں مولانا عمران

> خاں صاحب ساتھ تھے، ہم لوگ ندوے کے ایک کام کے لیے حاضر ہوئے تھے، مولانا نے اس سے بڑی دل چسپی لی اور مفید مشورے دیے اور بہت جلد اس کام کی تکمیل ہوئی، جس کے لیے ہم گئے تھے۔‘‘ (ایضاً، ص ۵۷)

حضرت مخدومی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ان افادات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام کو ندوۃ العلماء اور اس کی اصلاح، ترقی اور بقا کی تحریک سے کتنا گہرا لگاؤ تھا اور اسے تعلیم کی ایک معیاری درس گاہ اور تصنیف و تالیف و تحقیق کا ایک بلند پایہ ادارہ بنانے سے، نیز اس کے علمی و تعلیمی ترجمان الندوہ سے، ندوہ کے بزرگوں کے علمی و تحقیقی کاموں اور ان کی اشاعت سے، ندوہ کے طلبہ سے اور ان کی تعلیم و تربیت کے مسائل سے کس درجے جذباتی لگاؤ تھا اور ان کے ذوقِ ایثار و خدمات اور اخلاص کا پیمانہ کتنا بلند تھا۔

آخر کلام:

مناسب ہوگا کہ ابوالکلام کے تذکرے میں حضرت مولانا علی میاں کے ان افادات کا خاتمہ آں مرحوم کے اسی تاریخی مضمون کے اختتامیے پر کر دیا جائے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> ’’مولانا آزاد کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا اور بہت کچھ لکھا جائے گا، ان کی سیرت اور ان کے کمالات کا ایک ایک گوشہ سامنے لایا جائے گا۔ ان کے سیاسی خیالات اور موقف کے متعلق بہت کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہے گا۔ وہ ہندوستانی سیاست اور ہماری قدیم تہذیب و ثقافت کا ایک ستون تھے۔ بے عیب ذات خدا کی ہے اور سراپا عصمت زندگی خدا کے پیغمبر کی جس میں کہیں قیل و قال کی گنجائش نہیں، ان کی بشری لغزشوں اور کمزوریوں کے متعلق بھی ان کے معاصرین اور ناقدین کی نہ زبان کو روکا جا سکتا ہے، نہ قلم کو، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے جن سفروں کا تذکرہ کیا ہے، ان کے تاریخی ثبوت اور ان کے زمانے کے تعین کے بارے میں اختلاف اور بحث و تحقیق کی بڑی گنجائش ہے، لیکن ان کا حیرت انگیز حافظہ، ان کی غیر معمولی ذہانت، ان کی حاضر دماغی اور بیدار مغزی، ان کی ادبیت اور ان کی انشا پردازی جو کسی وقت اور کسی جگہ ان کا ساتھ نہیں

چھوڑتی، ان کے اپنے مطالعے اور معلومات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی عجیب و غریب صلاحیت، ان کی سیاسی بصیرت اور دور بینی، ان کے اپنے خیالات میں پختگی اور اپنے مسلک پر ثابت قدمی و استقامت اور لوگوں کی مدح و تنقید سے بے پروائی، ان کی خودداری اور عزت نفس ہر شبہ سے بالاتر اور ہر اختلاف سے بے نیاز ہے۔

میں لاہور میں تھا کہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو پاکستان ریڈیو نے یہ صاعقہ اثر خبر سنائی کہ مولانا آزاد اس جہان آب و گل اور اس کے طوق و سلاسل کی قید سے آزاد ہو کر ان ہمرہوں سے جا ملے، جن کے اس جہان فانی سے سفر کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے جاری ہے:

"ایک روشن دماغ تھا نہ رہا"

(ایضاً ص ۹_۶۰)

(٦)

الہلال کا لب ولہجہ اور علامہ شبلی

الہلال کی فنی خصوصیات، اس کی دینی دعوت اور سیاسی فکر سے حضرت علامہ شبلی مرحوم کے تعلق کے کئی پہلو ہیں، اور صحافت کی تاریخ میں الہلال اپنی ظاہری اور معنوی خصوصیت کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا واحد صحیفہ تھا۔ اس کے امتیازات اس کے ظاہر سے باطن تک نمایاں تھے۔ ظاہری طور پر اس کا کاغذ، اس کی تصاویر، اس کا ٹائپ، اس کی پرنٹنگ سے لے کر اس کے اشتہارات کی پیشکش میں بھی ایک حسن تھا۔ مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے اس کے صفحات کو مختلف ابواب میں تقسیم کر کے ان کی خصوصیات کو نمایاں کر دیا تھا۔ الہلال ایک مصور جریدہ تھا۔ اس کی تصاویر صفحات کی زینت اور قارئین کے جذب نظر و توجہ کا محض ذریعہ نہ تھیں، تاریخ کا ایک حصہ تھیں۔ وہ اپنی مستقل حیثیت رکھتی تھیں اور اپنی اہمیت کے اعلان و وضاحت کے لیے آپ اپنی زبان تھیں۔ ان کی اشاعت میں تاریخ و سیاست کے کتنے ہی اسرار پوشیدہ ہوتے تھے۔ جنگ بلقان کی ستم رانیوں، مسجد کان پور کے انہدام کے واقعے اور جنگ عظیم اول کے دوران صرف تصاویر کی اشاعت سے واقعات و حالات کے ایسے پوشیدہ گوشوں کی طرف متوجہ کیا، جن کی وضاحت مضامین کی تفصیلات سے بھی ممکن نہ تھی۔ کان پور کی مسجد کے سلسلے میں گرفتار شدہ بچوں کی تصاویر کی اشاعت نے ملک میں آگ لگا دی تھی۔ یہ حکومت کے خلاف اس کے ظلم کی ایسی تشہیر تھی جو کسی اشتعال انگیز مضمون سے بھی ممکن نہ تھی۔ ۱۹۱۳ء میں دوسری بار الہلال کی ضمانت ضبط ہوئی تو ضبطی کی وجہ ایک مضمون ہی نہیں ایک جہاز کی تصویر کی اشاعت بھی تھی۔

الہلال اپنے موضوع اور نوعیت کے لحاظ سے ایک ادبی جریدہ نہ تھا۔ ٹھیک اسی طرح وہ صرف مذہبی یا سیاسی اخبار بھی نہ تھا لیکن ادب اور سیاست کے شائقین کو اس کی انھی خصوصیات نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ یہ صرف فنی لحاظ سے اس کی تالیف و تدوین اور تہذیب مضامین و تصاویر کی خوبی تھی۔

وقت کے افکار و مسایل اور واقعات و حوادث کا مستند ترین ذخیرہ اس کے صفحات میں موجود ہے۔ سر سید مرحوم کی ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ کالج اور یونی ورسٹی کی تحریک اور ندوۃ العلماء کے قیام کی معنویت اور تاریخی اہمیت، اس کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک اور اس کے حفظ و بقا اور قومی اصلاح کے مسئلے پر سب سے قیمتی اور تاریخی لٹریچر الہلال کے صفحات میں موجود ہے۔

سیاست میں مسلمانوں کی ذہنی و فکری حالت، پستی، بندگی اور افتادگی اور شاہراہ مقصود کی طرف رہنمائی کے باب میں جو فکری اور تاریخی لٹریچر الہلال کے صفحات میں موجود ہے اس کی افادیت اور نتیجہ خیزی میں کلام نہیں۔ باب التفسیر کے مضامین کو جمع کر دیا جائے تو قرآن کی آیات و سورۃ کی ایک نہایت فکر انگیز، ایمان پرور، اصول و مبادی تفسیر اور ان کے اطراف کے مطالب کی جامع، بہت مفید و موثر تفسیر بن جائے۔ یہ الہلال کی وقتی خدمت قرآن ہے جس کی طرف مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو متوجہ کر دیا تھا۔ جس کی بدولت مسلمانوں میں ذوق قرآنی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور قرآن سے مسلمانوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ قائم ہوا تھا۔ الہلال ایک مختلف الجہات تحریک تھی جس کی بعض خصوصیات اور اطراف کی طرف اشارہ کیا گیا۔ مولانا آزاد کی تحریک حزب اللہ اور اس کے دارالارشاد کے قیام، مقاصد اور اس کی خصوصیات کی تفصیلات صرف اسی کے صفحات میں موجود ہیں۔

الہلال کے ابواب اپنی خاص اہمیت اور معنویت رکھتے تھے۔ مختلف اوقات میں پچاس سے زیادہ ابواب کے عنوانات اس کے صفحات میں نمایاں ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

باب التفسیر، اسوۂ حسنہ، بصایر و حکم، مذاکرۂ علمیہ، تاریخ و عبر، دقایق و حقایق، آثار عتیقہ، مقالات، ادبیات، حکایات، انتقاد، عالم مطبوعات و صحایف، اقتباسات و تراجم وغیرہا۔

کسی مضمون کا کسی باب میں جگہ پانا اس کے علمی معیار کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔

الہلال ادبی صحافت میں ایک مثال بن کر نمودار ہوا تھا۔ اس نے ادب و صحافت کو ایک نئی زبان، ایک جدید اُسلوب نگارش اور ایک نئے لب و لہجہ سے آشنا کیا۔ الہلال دین کے احیا اور ملت کی بیداری کی ایک دعوت تھی اور اس دعوت کا تقاضا تھا کہ اس کا مخصوص اُسلوب تحریر اور جدا انداز خطابت ہو۔ الہلال کا اُسلوب تحریر اور انداز خطابت اس کی دعوت کے تقاضے کے عین مطابق تھا۔ (۱)

حضرت علامہ شبلی کو الہلال سے نہایت دل چسپی تھی۔ وہ اس کے اجرا کے مقاصد، اس کی دینی دعوت، تحریک اصلاح اور سیاسی موقف سے متفق اور ابوالکلام کے نقطۂ نظر کے موید تھے۔ وہ اس کے اسلوب بیان اور طرز نگارش کی اہمیت کے اندازہ شناس اور دل ربائی کے والہ و شیدا تھے۔ ۲۰ راگست ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ”آپ نے بہت اونچا نصب العین رکھا ہے۔ ورنہ جی یہ چاہتا تھا کہ سب طرف سے نظر کر کے وہیں آ رہتا۔ اور آپ کے ساتھ مل کر کوئی ضروری خدمت انجام دیتا۔ اس وقت مسلمان سخت پراگندہ اور پریشان خیال اور پریشان عمل ہو رہے ہیں۔ کسی خاص مرکز پر ان کو لانا ہے، ورنہ ہر طرف سے بھٹکتے بھٹکتے آخر بالکل برباد ہو جائیں گے۔“

(مکاتیب شبلی (حصہ اول) ص ۲۸۴)

۲۷ راکتوبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں:

> ”الہلال.... نے احساس عام پیدا کر دیا ہے۔ یعنی تمام اسلامی کاموں پر لوگوں کو مداخلت کا دعویٰ پیدا ہو گیا ہے۔“ (ایضاً، ص ۲۸۸)

اس کے ادبیات و فکاہات کے کالم میں سب سے زیادہ منظومات حضرت علامہ شبلی ہی کی چھپی ہیں۔ شائقین کو شبلی کی اسلامی، تاریخی یا وقت کے سیاسی مسائل پر مثلاً ہنگامہ طرابلس و بلقان کے موقع پر ”شہر آشوب اسلام“، جنگ کے زخمیوں کی خدمت اور ڈاکٹر انصاری کے میڈیکل مشن کی واپسی پر ان کا خیر مقدم، ہنگامۂ مسجد کان پور، سوٹ ایبل گورنمنٹ، مسلم لیگ اور اس کے انداز فکر اور ذوق عمل، ترکوں کو آغا خاں کے مشورے، سید امیر علی سے خطاب، مسلم یونی ورسٹی کے مسائل، یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اجلاس، یونی ورسٹی کے الحاق، اس کے ڈیپوٹیشن، اس کے نصاب تعلیم، ندوۃ العلماء میں اختلاف کا فتنہ اور اس کے اطراف و متعلقات، جنگ یورپ ۱۹۱۴ء اور متعدد شخصیات، جماعتوں وغیرہ پر ان کے ادبی اور فکاہی رشحاتِ فکر کا قارئین الہلال کو انتظار رہتا تھا۔ ان کی منظومات نے الہلال کو مقبول بنایا تھا اور الہلال نے شبلی مرحوم کے افکار اور ان کے فیضان کو عام کیا تھا۔ شبلی کی منظومات الہلال کی فکر اور تحریک کا ایک حصہ تھیں۔

حضرت علامہ شبلی کو ایک عرصے تک شاید اس بات میں شبہ تھا کہ ابوالکلام جس دعوت کو لے

کر اٹھے ہیں اور جس تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں، وہ اس میں ثابت قدم بھی رہیں گے اور راہ کی جو مشکلات اور آزمائشیں پیش آئیں گی وہ ان کا مقابلہ بھی کر سکیں گے اور جس جوش وولولے کے ساتھ وہ الہلال کے مضامین لکھ رہے ہیں اور جس اُسلوب اور لہجے میں وہ عام و خاص کو مخاطب کر رہے ہیں، یہ وقتی ہے یا اس میں پائیداری بھی ہے؟ حضرت شبلی مرحوم نے چند اشعار میں اپنے تذبذب کا اظہار بھی کیا۔ مولانا آزاد نے ان کے رشحاتِ فکر کو الہلال میں جگہ دی۔ یہ اشعار "جزرومد ... الہلال کا لب ولہجہ" کے عنوان اور "کشاف" کے قلمی نام سے شائع ہوئے ہیں:

دیکھ کر حریتِ فکر کا یہ دورِ جدید سوچتا ہوں کہ یہ آئینِ خرد ہے کہ نہیں؟
رہنماؤں کی یہ تحقیر، یہ اندازِ کلام اس میں کچھ شائبۂ بغض و حسد ہے کہ نہیں؟
اعتراضات کا انبار جو آتا ہے نظر اس میں کچھ قابلِ تسلیم و سند ہے کہ نہیں؟
نکتہ چینی کا یہ انداز، یہ آئینِ سخن بزمِ تہذیب میں یہ مستوجبِ رد ہے کہ نہیں؟
جس نئی راہ میں ہیں بادیہ پیما یہ لوگ کوئی اس جادۂ مشکل کا بلد ہے کہ نہیں؟
شاطروں نے جو نئی آج بچھائی ہے بساط اس میں ان پر بھی کہیں سے کوئی زد ہے کہ نہیں؟
پہلے گر شانِ غلامی تھی، تو اب خیرہ سری اس دوراہے میں کوئی بیچ کی حد ہے کہ نہیں؟
فیصلہ کرنے سے پہلے میں ذرا دیکھ تو لوں
"جزر" جیسا تھا اسی زور کا "مد" ہے کہ نہیں؟

شبلی مرحوم کے یہ اشعار "نکات" کے باب میں الہلال کی پہلی جلد کے نمبر ۲۳، (ص ۱۳) میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد الہلال کے دوراتوں کی چار جلدیں شبلی مرحوم کی زندگی میں اور شائع ہوئیں۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال کا آخری شمارہ شبلی مرحوم کے انتقال کی دردانگیز خبر کے ساتھ شائع ہوا۔ اس وقت تک الہلال اسی شان کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور جب مولانا آزاد نے محسوس کر لیا کہ حکومت نے الہلال کا گلا گھونٹنے ہی کا فیصلہ کر لیا ہے تو ضمانت کی مطلوبہ رقم جمع کرانے کے بجائے اسے بند کر دیا۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہ کر دینا چاہیے کہ اُسلوبِ تحریر اور طرزِ تخاطب اور اس کا لب ولہجہ حالات و مصالح اور دعوت یا تحریک کی ضرورت کے مطابق تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے بادشاہوں، دین کے امرا و وزرا، علما و مشائخ اور ان کی اولاد سے خطابات اس وقت کے حالات و

مصالح کے مطابق تھے۔ شاہ اسماعیل شہید کے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے مواعظ کی زبان اور لہجہ ان کے مرض کی اس وقت کی حالت اور دعوت واصلاح کی ضرورت کے مطابق تھے۔ ابوالکلام کے الہلال کی زبان اور اس کا اُسلوب بیان اپنے وقت کی ضرورت کے مطابق تھا۔ جب موسم بدلا اور حالات کا تقاضا ہوا تو ان کا لہجہ اور ان کا طرزِ خطاب بھی بدل گیا۔ چنانچہ دینی، اصلاحی، تبلیغی جلسوں کی تقریروں اور کانگریس کے خطبوں اور اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی کی تقریر اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں کل جماعتی کانفرنس لکھنؤ اور پارلیمنٹ کی تقریروں میں نہ صرف ان کا لب ولہجہ، بلکہ ان کی زبان اور طرزِ بیان بھی آپ بالکل بدلا ہوا پائیں گے کہ وقت کی ضرورت اور موقع ومحل کا تقاضا یہی تھا۔ مدرس کے درس اور مولوی کے وعظ کی زبان، اُسلوب بیان اور لہجہ کب ایک ہوا ہے کہ ابوالکلام یا کسی اور پر زبانِ طعن دراز کی جائے؟

حواشی

۱۔ خاکسار نے الہلال کی فنی خصوصیات، اس کی ترتیب وتہذیب، زبان وبیان اور اس کی دعوت وتحریک پر "ابوالکلام کی صحافت" میں زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ (ع۔ س۔ ش)

(۷)

تحریکِ تالیفِ سیرۃ النبیؐ اور مولانا آزاد

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے عشق کی حد تک محبت ہر مسلمان کے ایمان کا جز ہے۔ شبلی نعمانی کے اجداد چوں کہ راجپوت نومسلم تھے اور نومسلم ہونے کے ناتے ان میں یہ جذبہ کچھ سوا ہی تھا۔ انھوں نے اپنی علمی زندگی میں تاریخ و سوانح کے علاوہ مختلف علوم و فنون میں پچاسوں کتب و رسائل اور سیکڑوں مضامین و مقالات تحریر فرمائے اور خطبات دیے۔ لیکن علمی زندگی کا آغاز سیرت نبویؐ میں ایک رسالے کی تالیف سے ہوا تھا۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ''بدء الاسلام'' کے نام سے تھا اور علی گڑھ کالج کے نصاب میں ایک مدت تک داخل رہا تھا۔ اور یہ بھی کیسا اتفاق تھا کہ ان کی زندگی کا آخری علمی کارنامہ بھی سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین تھا۔ بلکہ ان کی زندگی کی آخری مصروفیت اور آٹھ نو برس کے شب و روز کا مستقل مشغلہ سیرت نبویؐ کا مطالعہ، اس میں غور و فکر، تحقیق اور تالیف و تدوین تھا اور جب فرشتۂ اجل ان کے پاس پہنچا تو سیرت نبویؐ کی تالیف کے ذوق و فکر سے ان کا سینہ معمور اور زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ ان کی زندگی کے آخری مشاغل کتنے مبارک اور خاتمہ کیسا قابلِ رشک تھا۔ اس مصروفیت پر انھوں نے ایک قطعے میں خدا کا شکر ادا کیا ہے:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

زندگی کے دورِ آخر میں انھیں سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تالیف کے اس عظیم کام کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا احساس ہوا، پھر اس میں کس طرح پختگی آئی، عزم راسخ ہوا،

میدانِ عمل میں قدم رکھا، سروسامان کی فکر کی، کتابیں فراہم کیں، کارکنوں کو جمع کیا، مجلسِ تالیف سیرت قائم کی اور اس مبارک قافلے کی روانگی کس طرح اور کس اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی، حضرت سید سلیمان ندوی نے اس کی ضروری تفصیل "حیاتِ شبلی" کے ایک مستقل مبحث میں بیان کی ہے اور اس کی تالیف کے مراحل اور سفرِ مبارک کے سنگ ہائے میل گنائے ہیں۔ ان کے تفصیلی مطالعے کے لیے حیاتِ شبلی (سیرت النبی، صلی اللہ علیہ وسلم: ص ۷۱۸۔ ۶۹۹) سے رجوع کرنا چاہیے۔

اس سفرِ مبارک کے قافلہ سالار حضرت علامہ شبلی تھے اور وقت کے فاضلین کی ایک جماعت ان کے "رفقائے علمی" کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھی۔ اس کام میں ان کے معاونین اور مشیرانِ اہلِ علم کا دایرہ برِاعظم ہند پاکستان کے دور دراز گوشوں تک پھیلا ہوا تھا۔ ان میں شبلی مرحوم کے ایک مخلص ابوالکلام بھی تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نہ صرف آغازِ کار (۱۹۱۲ء) سے بلکہ اس وقت سے جب انھیں تالیفِ سیرت کی ضرورت کا احساس ہوا تھا، حضرت علامہ کے مشیر تھے اور سروسامان کی فراہمی کے انتظام سے لے کر تالیف و تحریر کے مسایل اور کتاب کی اشاعت و طباعت کے معاملات تک میں مشیر و معاون رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام کے خطوط بنام حضرت شبلی اور مولانا سید سلیمان میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ خود مولانا آزاد "تذکرہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

> "جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک اس کی کوشش نہیں کی گئی کہ صرف قرآن حکیم میں دایرۂ استناد و اخذ محدود رکھ کر ایک کتاب سیرت میں مرتب کی جائے۔ جس زمانے میں مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سیرت نبویہ کے بارے میں تذکرے رہتے تھے تو ایک مرتبہ مجھے اس کا خیال ہوا تھا۔ میں نے کہا، آپ سیرت میں ایک خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے:
>
> قرآن اور سیرت محمدیہ..."

(تذکرہ: مرتبہ مالک رام، دہلی ۱۹۶۸ء، ص ۳۰۲)

اکتوبر ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انھیں سیرت کی بعض اچھی کتابیں ملیں۔ اس خوشی میں وہ مولانا آزاد کو بھی شریک کرتے ہیں اور انھیں ترغیب بھی دیتے

ہیں کہ "آپ چاہیں تو خرید سکتے ہیں۔" اسی خط میں لکھتے ہیں:

> "آپ سے ملنے کی بہت ضرورت ہے کہ آیندہ کوئی منظم پروگرام تیار ہو کر کارروائی ہو سکے۔"

(خطوط شبلی بنام آزاد: بہار اردو اکیڈمی، مکتوب مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۵۵)

سیرت نبوی کا پہلا حصہ ابھی پوری طرح مکمل بھی نہ ہوا تھا۔ البتہ دیباچے کا مسودہ تیار ہو گیا تھا جو انھوں نے مولانا آزاد کو بھیجا تھا۔ مولانا آزاد نے اسے ایک طویل نوٹ کے ساتھ چار قسطوں میں چھاپا تھا۔ لیکن یہ دیباچے کا صرف ایک حصہ تھا۔ یہ دیباچہ ۲۲ر و ۲۹ر جنوری اور ۵ر و ۱۲ر فروری ۱۹۱۳ء کی چار قسطوں میں مقالات کے باب میں "سیرت نبوی" کے عنوان سے شریک اشاعت کیا گیا تھا۔ دوسری قسط سے عنوان "باب مقالات" کے نیچے داہنی طرف صفحے کے کنارے "تراجم احوال" کی ایک ذیلی سرخی کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ الہلال کے نوٹ کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

این نیست کہ صحرائے سخن جادہ ندارد
وا ذوق روش کج نگری راچہ کند کس؟

اگر قوم میں کام کرنے والوں کی کمی ہے تو چنداں شکایت نہیں، کام کرنے والے ہمیشہ کم ہی رہتے ہیں۔ لیکن افسوس اس عالمگیر خیرہ مذاقی پر ہے کہ جو کام کرنے والے موجود ہیں، ان کے حسن و قبح کو پہچاننے والے بھی ناپید ہیں۔ تحسین ہے تو ناشناسانہ اور طعن ہے تو معاندانہ!

از رد و ہم قبول تو فارغ نشستہ ایم
اے آں کہ خوب ما نشناسی ز زشت ما

(الہلال: ۲۲ر جنوری ۱۹۱۳ء، ص ۸)

زیر نظر نوٹ کے نصف ثانی میں مولانا لکھتے ہیں:

> "ناظرین کو معلوم ہے کہ کچھ عرصے سے شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ایک نہایت عظیم الشان دینی و علمی خدمت میں مصروف ہیں یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جامع و مکمل سیرت کی تدوین و تصنیف میں جو کہ نہ صرف اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی بلکہ افسوس کہ عربی اور ترکی زبانوں میں بھی جن پر اردو سے

بہتر تصنیف و تالیف کا دور گزر رہا ہے! لیکن شاید بہت کم لوگوں کو اس کام کی مشکلات کا صحیح اندازہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کام ایک شخص کے بس کا نہ تھا، گو وہ اپنے اندر قابلیتوں اور فضیلتوں کا کیسا ہی مجمع رکھتا ہو! کیوں کہ قابلیت اور دماغ ہی نہیں بلکہ وقت اور محنت بھی مطلوب تھی۔ ضرورت تھی کہ ایک منتخب ترین اربابِ علم کی مجلس ہوتی اور یورپ کے مجامع علمیہ کے اصول پر اس کام کو انجام دیا جاتا لیکن افسوس کہ ہم میں دماغ اور دل، دونوں کا قحط ہے۔ اور آدمی کسی مشین میں ڈھال کر پیدا نہیں کیے جا سکتے۔

اس وقت سیرۃ النبی کا کام جس رفتار سے ہو رہا ہے اس کے لحاظ سے امید کی جا سکتی ہے کہ غالباً چند ماہ کے اندر کتاب کا پہلا حصہ پریس میں جانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اس وقت تک مسودے کی صورت میں اس کا بڑا حصہ مرتب ہو چکا ہے اور بدر تک کے حالات کی پہلی تحقیق بھی ہو چکی ہے۔

ہم نے مولانا سے عرض کیا کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کے بعض اہم اجزا جن سے طرزِ تصنیف و ترتیب اور مشکلاتِ موضوع کے خاص مقامات سامنے آ جائیں، شائع کر دیے جائیں تا کہ اربابِ فن و رائے کو اس کی نسبت بحث کرنے اور مشورہ دینے کا موقع مل سکے۔" (ایضاً)

مولانا ابوالکلام کے اس مشورے کو حضرت علامہ نے قبول کر لیا اور سیرۃ نبوی کے دیباچے کے چند خاص مباحث مولانا کو بھیج دیے، جنھیں مولانا نے اپنے نوٹ کے ساتھ الہلال میں شائع کر دیا تھا، اسی نوٹ کے خاتمے کے قریب مولانا لکھتے ہیں۔

"آج کی اشاعت میں ہم دیباچۂ کتاب کا ایک ٹکڑا شائع کرتے ہیں، جس کے مطالعے سے موضوعِ کتاب کے متعلق ناظرین کو نہایت مفید بصیرت حاصل ہوگی۔ اس کے بعد اصل کتاب کے بعض اہم حصے بھی شائع کیے جائیں گے۔"

اس کے بعد مولانا نے اصحابِ ذوق و فن سے یہ گذارش کی ہے:

"ان علمائے کرام سے، جن کو فنِ سیرت و حدیث سے دلچسپی ہے، خاص طور پر امید کی جاتی ہے کہ وہ بہ تعمق نظر ملاحظہ فرمائیں گے اور کوئی امر قابل بحث و مذاکرہ

یا مشورہ ضرور ان کے خیال میں آئے تو اسے دفتر سیرۃ نبوی یا صفحات الہلال تک پہنچانے میں دریغ نہ فرمائیں۔" (ایضاً)

معلوم نہیں اس مسئلے سے کتنے لوگوں نے دل چسپی لی اور حضرت علامہ شبلی کو اپنے تجدید و نقد، تبصروں اور مشوروں سے نوازا اور دفتر سیرت نبوی (لکھنؤ) کو استفادے کا موقع دیا۔ الہلال میں صرف دو اصحاب: حکیم غلام غوث بہاول پور اور مولوی محمد اسحاق مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مراسلات شائع ہوئے ہیں۔ ۳۱ر اپریل ۱۹۱۳ء کو حکیم صاحب کا مراسلہ شائع ہوا، اس میں انھوں نے بیان کیا کہ طبری چوں کہ شیعہ تھا اس لیے حاشیے میں اس کے تشیع کا اظہار کردینا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ لکھی کہ ولادت نبویؐ کے وقت کسریٰ کے محل کے کنگورے گرنا ایک تاریخی واقعہ ہے اور شاہ نامہ فردوسی میں اس کا ذکر آیا ہے اور شاہ نامے کا تاریخی ہونا خود شبلی نے شعر العجم میں تسلیم کیا ہے۔ مراسلے پر الہلال کا نوٹ ہے۔ اسی میں دونوں مشوروں کا جواب دیا گیا ہے:

> ۱۔ "امام طبری کی نسبت مولانا شبلی نے کوئی خاص بحث نہیں کی ہے اور نہ وہاں اس کا کوئی موقع تھا۔ بلکہ مورخین سیرت کے ذکر میں ضمناً ذکر آگیا ہے۔ رہا الزام تشیع تو براہ کرم اس کے وجوہ رقام فرمایئے۔"
>
> ۲۔ دوسرے اعتراض کے جواب میں مولانا نے فرمایا:
>
> "محل کسریٰ کے زلزل کی نسبت شاہ نامے سے استدلال تعجب انگیز ہے! اگرچہ مولانا (شبلی) نے شعر العجم میں اس کی تاریخی حیثیت پر زور دیا ہے تو اس سے یہ مقصود ہوگا کہ خود فردوسی نے بہ طور قصص اور داستان سرائی کے واقعات گھڑے نہیں ہیں، بلکہ قدیم ایران کی تاریخ کا جو سواد عربی میں آچکا تھا اسی کو بہ حیثیت ایک دیانت دار مورخ کے نظم کردیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ فردوسی بہ طور ایک محدث اور مورخ سیرت کے تسلیم کیا جائے!"

(الہلال، ۳۰ر اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۱۰)

مولوی محمد اسحاق کلکتہ کے نقد کا کوئی جواب الہلال میں نہیں دیا گیا۔ البتہ حکیم غلام غوث کے مراسلے پر الہلال کے نوٹ سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب الہلال کے نزدیک ان کے اعتراض کی کوئی اہمیت نہ تھی، مذکورہ بالا نوٹ ہی میں لکھتے ہیں:

> ”صرف کلکتہ سے ایک صاحب نے ایک ضمنی امر کی نسبت تحریر بھیجی تھی جو آئندہ نمبر میں شائع کر دی جائے گی۔“ (ایضاً)

چناں چہ اسی پر اکتفا کیا۔ ۲۱ اور ۲۸ مئی کے الہلال کے ”باب المراسلت والمناظرہ“ میں یہ تحریر شائع کر دی گئی، البتہ شبلی مرحوم اس سے اثر لیے بغیر نہ رہے۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی تحقیق کے مطابق:

> ”مولانا محمد اسحاق (کلکتہ) کے تعقب اور ان کے رد و تردید کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ حدیث مذکور سے متعلق تنقید کا وہ حصہ مولانا شبلی نے اپنے دیباچے سے خارج کر دیا۔“

(مولانا شبلی بہ حیثیت سیرت نگار، شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۱)

حضرت علامہ شبلی نے اس بحث، جس پر نقد کیا گیا تھا، کو دیباچے سے ضرور خارج کر دیا لیکن ان کی رائے نہ بدلی تھی۔ اس لیے کتاب میں جہاں یہ بحث آئی تھی وہاں نہ صرف یہ کہ وہ اپنی رائے پر مصر رہے، بلکہ مزید دلائل سے اور مستحکم کر دیا۔ محترم صدیقی صاحب فرماتے ہیں:

> ”اصل کتاب (سیرۃ النبیؐ) میں جہاں اس روایت کے مندرجات انھوں نے تفصیل کے ساتھ ذکر کیے ہیں، وہیں اس سے متعلق اپنے شبہات کا ذکر بھی پیرایۂ زبان بدل کر کر دیا ہے۔ پھر آخر میں اس روایت کی سند پر کلام کرتے ہوئے اسے ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے۔“ (ایضاً: ص ۴۳-۱۴۱)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ہمارے لیے اپنے اس بیان ہی کو کافی نہیں سمجھا بلکہ سیرۃ النبیؐ (حصہ اول، اشاعت چہارم، ص ۵-۲۰۳) سے پوری بحث بھی نقل کر دی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دیباچے کا الہلال میں پہنچنا کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوا۔ الہلال کی طرف صرف دو حضرات متوجہ ہوئے حالاں کہ اس سے کہیں زیادہ کی توقع تھی۔ ایک صاحب کو صرف اشکال تھا اور دوسرے صاحب ایک ضمنی مسئلے پر معترض تھے، مخالف نہ تھے۔ اس سے بھی منصوبے کو کسی نقصان کے پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن حضرت سید صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ مخالفت کے لیے اس انتظار میں تھے کہ شبلی کی کوئی تحریر ہاتھ لگے، انھیں اچھا موقع ہاتھ آیا۔ ان میں مولانا عبدالشکور لکھنوی کا نام سید صاحب نے خاص طور پر لیا ہے۔ ”ایک

"فتنہ" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> "مولانا ابوالکلام کی تحریک تھی کہ سیرت خوشنما ٹائپ میں چھپے۔ مولانا شبلی نے نمونے کے طور پر چھاپنے کے لیے اس کے مقدمے کو ان کے پاس الہلال پریس کلکتہ بھیج دیا۔ مولانا ابوالکلام نے اس مقدمے کو الہلال میں بھی چھاپ دیا تا کہ اہل نظر دیکھ سکیں کہ کتاب کس تحقیق و تدقیق سے لکھی گئی ہے۔ لیکن بعض مخالفین جن کو دل سے یہ بات پسند نہ تھی کہ سرکار عالیہ کی سرپرستی میں جو سیرۃ نبوی ﷺ لکھی جائے وہ مولانا شبلی کے قلم سے ہو، اس کے منتظر تھے کہ سیرۃ کا کوئی صفحہ منظر عام پر آئے اور وہ اعتراضوں کی بوچھار کریں۔
>
> یہ مقدمہ نکلا تو مولوی عبدالشکور صاحب ایڈیٹر النجم نے اپنے نقطۂ نظر سے اس مقدمے پر نہایت سخت تنقید لکھی۔ مخالفین نے جن میں "دیوبند" کے کچھ لوگ بھی تھے، اس تنقید کو دستاویز بنا لیا۔ اس کو چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیا اور بعض ذرائع سے وہ سرکار عالیہ تک پہنچائی گئی..." (حیات شبلی، ص ۵۱۷)

الہلال میں دیباچے یا مقدمے کے جو صفحات چھپوائے گئے تھے اس کے نتیجے پر سر عبدالقادر کے نام ایک خط میں علامہ شبلی نے بھی اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "الہلال میں بھی جو صفحہ نمونے کے لیے چھپوایا لیکن عام لوگ متفق نہیں۔"

(مکتوبات شبلی: خط مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۲۴۳)

اس سلسلے میں ایک یہ سوال پیدا ہوا کہ سیرۃ نبوی کا مسودہ کسی مستند اور صاحب نظر عالم دین کو دکھایا جائے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ شبلی جیسے صاحب قلم اور مصنف کتب کثیرہ، جس کی پوری زندگی قلم و قرطاس کی صحبت میں گزری تھی اور مختلف علوم و فنون میں بیسیوں تصانیف اور پچاسوں مقالات ان کے صاحب علم و فن ہونے کا ثبوت تھے، ان کا مضمون کس کو دکھایا جائے اور اس پر شبلی کیسے آمادہ ہوں گے؟ لیکن شبلی حضرت مولانا محمود حسن شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی نظر و رائے پر آمادہ ہو گئے لیکن حضرت (شیخ الہند) کو ان کے ارد گرد کے لوگوں نے اس کام پر آمادہ ہی نہ ہونے دیا۔ لیکن اگر بھوپال کے حکمراں کو کوئی شک کتاب کے معیار اور تحریر کے بارے میں ہو بھی گیا تھا تو وہ جلد دور ہو گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت شبلی اس پر آمادہ ہو گئے تھے کہ بھوپال کی امداد

سے دست بردار ہو جائیں گے۔

سیرت نبوی کا اگلا مرحلہ اس کی کتابت اور طباعت کا تھا۔ حضرت علامہ شبلی کے حلقے میں کتابت و طباعت میں جو تجربہ مولانا ابوالکلام آزاد کو تھا وہ معلوم ہے۔ ابوالکلام کے ذوق و معلومات پر سبھی اعتماد کرتے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے انھی سے مشورہ کیا۔ مولانا آزاد ہاتھ کی کتابت کے بجائے ٹائپ کے حروف کو پسند کرتے تھے کہ حالات و وقت کے تقاضوں کا ٹائپ ہی ساتھ دے سکتا تھا۔ انھوں نے الہلال اسی لیے ٹائپ میں نکالا تھا اور اسی کے استعمال کے محرک تھے۔ ۱۹۱۴ء کے شروع میں جب یہ مرحلہ پیش آیا اور حضرت شبلی مرحوم نے اس امر کا فیصلہ کرکے یکسو ہو جانا چاہا تو مولانا نے ان کی خواہش پر ٹائپ، عمدہ کاغذ اور طباعت کے نمونے حضرت مرحوم کی خدمت میں بھیج دیے۔ ۵ / مارچ ۱۹۱۴ء کے مکتوب میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ”نمونۂ طبع پہنچا۔ سبحان اللہ! ٹائپ اس سے بہتر کیا ہوگا؟ لیکن آپ نے لکھا ہے کہ کئی کاغذ کے نمونے بھیجوں گا۔ یہ تو صرف ہلکا ہے۔ چکنا اور آب دار کاغذ زیادہ نمونہ طلب تھا۔“

اس خط کو ختم کر چکے تو ایک اور بات یاد آئی۔ چنانچہ پس تحریر لکھتے ہیں:

> ”آپ نے لکھا ہے ہارٹ پریس میں دے کر حروف زیادہ روشن ہو جاتے ہیں، تو تیار کرا کر بھیجیے! غرض یہ کہ کوئی حالت منتظرہ نہ رہے۔ البتہ تخمینۂ طبع بھی بھیجیے۔ یعنی فی عنصر (دو روپیہ) کتنے اجزا پڑیں گے؟“

(خطوط شبلی بنام آزاد، خط مورخہ ۵ / مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۱۹۲ و ۱۹۳)

کسی بیان یا خط سے یہ روشنی نہیں پڑتی کہ مولانا آزاد نے اس فرمائش کا کیا جواب دیا اور اس مسئلے کا فیصلہ کیا ہوا۔ جب تک مرحوم شبلی صحت مند رہے ان کی اپنی گوناگوں مصروفیات تھیں، پھر بیمار پڑے تو سارا کارخانہ معطل ہو گیا۔ ممکن ہے مشورہ و غور و فکر کے بعد مرحوم شبلی کسی نتیجے تک پہنچ گئے ہوں۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس کا فیصلہ ۱۹۱۵ء تک نہ ہو سکا تھا۔

سیرۃ نبوی کی تالیف و تدوین اور کتابت و طباعت وغیرہ مسائل میں حضرت علامہ کو مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حمید الدین فراہی کے علاوہ جس شخص کے علم و رائے اور اخلاص پر سب سے زیادہ اعتماد تھا، وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذات گرامی تھی۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ آخری

وقت میں مذکورۃ الصدر انھیں تین مخلصین کو انھوں نے تار دیے تھے کہ اعظم گڑھ پہنچیں اور سیرۃ نبوی کی ذمہ داری سے انھیں اطمینان دلائیں۔ مولانا آزاد کے نام حضرت مرحوم کا تار مولانا سیّد سلیمان ندوی نے شبلی کے خطوط بنام ابوالکلام آزاد میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ خطوط معارف (اعظم گڑھ) میں شائع ہو چکے ہیں۔ میرے سامنے مکاتیب شبلی مرتبہ مولانا سیّد سلیمان ندوی، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء ہے۔ اس میں شبلی کے تار کا مضمون یہ ہے:

> ”اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا۔ ورنہ سب کارروائی بیکار ہو جائے گی۔ سیّد سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔“

یہ محض اتفاق تھا کہ حضرت سیّد صاحب اسی روز پہنچ گئے تھے۔ ۱۸ر نومبر کو حضرت شبلی نے اعلیٰ علیین کا سفر اختیار کیا۔ یہ حضرت شبلی کا مولانا ابوالکلام اور دیگر دونوں مخلصین کے ذوق علم و رائے اور ان کے اخلاص کا بہت بڑا اعتراف اور شہادتِ حق ہے۔

(۸)

علامہ شبلی کی رحلت اور مولانا ابوالکلام آزاد

(۱۹۱۴ء)

۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو حضرت مولانا شبلی نعمانی کا انتقال ہو گیا اور مولانا ابوالکلام سے چودہ سالہ تعلقات کی تاریخ کا ورق پلٹ گیا۔ آخری دس برسوں میں دونوں کے تعلقات بہت قریبی ہو گئے تھے۔ مولانا آزاد تو انھیں اپنا بزرگ دوست سمجھتے ہی تھے، مولانا شبلی بھی ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ندوۃ العلما اور علامہ شبلی کے دفاع میں ابوالکلام نے جو تاریخی کردار ادا کیا تھا وہ ان کی بہت بڑی علمی خدمت تھی۔ اس سے حضرت شبلی کی نظروں میں ان کا وقار بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن ابوالکلام اس سے بالکل بے نیاز اور بے پروا تھے۔ وہ مولانا شبلی کے مخلص اور ان کے قدر داں تھے۔ ابوالکلام ان کی علمی شخصیت سے متاثر اور علوم و فنون میں ان کی جامعیت کے بہت قائل تھے اور تاریخ و سوانح اور ادب و تنقید میں ان کے کمالات و خدمات کے معترف تھے۔ علامہ شبلی کا تار متعلق انتظام سیرۃ نبوی پہنچا تو وہ الہلال دور اول کا آخری شمارہ ترتیب دے رہے تھے۔ حکومت نے اس کی پچھلی ضمانت ضبط کر لی تھی۔ اس کا ایک مضمون اور ایک تصویر قابل اعتراض قرار پائی تھی اور دس ہزار روپے کی نئی ضمانت طلب کی تھی۔ لیکن معلوم تھا کہ حکومت الہلال کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دے گی۔ اس لیے نئی ضمانت جمع نہ کرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مولانا ابھی ان الجھنوں سے فارغ نہ ہوئے تھے اور ضمانت جمع کرانے کی مدت کے اندر الہلال کا آخری شمارہ چھاپ کر فارغ ہو جانا چاہتے تھے کہ حضرت علامہ شبلی کے انتقال کی اطلاع ملی۔ مولانا نے اسی شمارے میں حضرت شبلی کی وہ تاریخی تصویر، جو رحمن فیضی نے بنائی تھی، ایک سیاہ چوکھٹے میں سجائی اور اپنے رنج و غم کے اظہار میں ایک تحریر کے ساتھ شائع کر دی۔ جن حالات میں پہلے شبلی کا تار پہنچا تھا، پھر ان کے انتقال کی خبر ملی تھی اور جن حالات میں الہلال کے دور اول کا یہ آخری شمارہ شائع کیا جا رہا تھا اور اظہار رنج و

غم کے ساتھ رسم تعزیت بھی ادا کر لی تھی۔ اس میں ان کی پریشاں خیالی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

تصویر پر جو تعزیتی نوٹ ہے، اس میں ایک سطر یہ بھی ہے:

> ''اس وقت تو یہ رونا ہے کہ ہم دل کھول کر اس شہید علم کا ماتم بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنی خوں نا بفشانیوں کو دوسری فرصت کے لیے ملتوی رکھتے ہیں۔''

حضرت علامہ شبلی کے حادثۂ انتقال کو مولانا آزاد نے ایک شخص کی موت کے بجائے ''علم کی موت'' اور ''حادثۂ فاجعۂ علمیہ'' قرار دیا ہے اور موت العالم موت العالم کے مشہور اور رٹے پٹے جملے کو دہرانے کے بجائے عربی کا وہ شعر بہ تصرف استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قیس کی موت تنہا ایک فرد کی موت نہیں، اس کا مرنا تو پورے قبیلے کا مر جانا ہے کہ

وما کان شبلی هلکه هلک واحد
ولکنه بنیان علم تهدما!

> ''شبلی کی وفات کسی شخص واحد کے وفات پا جانے کا حادثہ نہیں، بلکہ ان کے حادثۂ انتقال سے علم کی بنیاد ہل گئی ہے۔''

یہ شبلی کی علمی فضیلت کو بہت بڑا خراج ہے جو انھیں پیش کیا گیا تھا۔

یہ جملے اور شعر تو تصویر کے سرنامے کی زینت ہے۔ تصویر کے نیچے تعارفی جملہ: ''فقید اعظم مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ'' ہے اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:

> ''نہایت رنج و افسوس کے ساتھ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے حادثۂ وفات کی خبر درج کی جاتی ہے۔ اس ماتم کے لیے صرف یہ مرقع رنج و غم کافی نہیں۔ اس کے لیے تو الہلال کا ایک پورا نمبر بھی کافی نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت تو یہ رونا ہے کہ ہم دل کھول کر اس شہید علم کا ماتم بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے اپنی خوں نا بفشانیوں کو دوسری فرصت کے لیے ملتوی رکھتے ہیں۔ دردرسیدوں کے ماتم کے لیے کوئی وقت محدود نہیں ہے۔ آبلۂ دل ہر وقت پھوٹ بہنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ نشترِ غم کی کھٹک چاہیے اور وہ اس حادثۂ فاجعۂ علمیہ کی بدولت دل میں ہر وقت موجود رہے گی۔''(۱)

(الہلال، کلکتہ، ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء، ص ۱۷)

مولانا آزاد نے صفحۂ تعزیت پر جس تصویر کو چھاپا ہے وہ مشہور آرٹسٹ رحیمن فیضی کے برش قلم کا شاہکار ہے۔ یہ اس نے ۱۹۱۳ء میں بنائی تھی۔ علامہ شبلی سے اپنے ایک خط بنام آزاد مورخہ ۲۰ ر اگست ۱۹۱۳ء میں مولانا سے وعدہ کیا تھا: ''میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا۔'' الہلال میں مولانا نے اس تصویر کو دو مرتبہ شائع کیا تھا۔ پہلی بار ''سیرۃ نبوی'' کے دیباچے کی پہلی قسط کے ساتھ! اور دوسری مرتبہ اب مولانا شبلی کی وفات کے سانحے کے موقع پر!

اس زمانے میں مولانا ابوالکلام نے مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال، کلکتہ میں ایک جلسے سے خطاب کیا۔ یہ جلسہ جسٹس سید حسن امام کے زیر صدارت شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا: ''حضرت علامہ شبلی نعمانی کی حیات علمی۔'' مولانا آزاد کے ایک عزیز و مخلص مولوی محمد یعقوب نے اپنے طور پر مولانا کی تقریر کے نوٹ لے لیے تھے اور پھر اس خیال سے کہ تالیف مطالب میں کوئی غلطی نہ رہ جائے، مولانا کی خدمت میں پیش کیے کہ وہ اس پر اصلاح کی نظر ڈال لیں۔ مولانا نے یہ نوٹ لے کر رکھ لیے، لیکن پھر یہ بات ان کے ذہن سے نکل گئی۔ مولانا محمد یعقوب نے بھی مولانا کو یاد نہ دلایا۔ اس واقعے پر ایک سال گزر گیا۔ ایک روز وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے تھے کہ اچانک یہ مسودہ ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس وقت البلاغ کا اجرا عمل میں آ چکا تھا۔ مولانا نے ایک نوٹ کے ساتھ اسے البلاغ میں اشاعت کے لیے دے دیا۔ مولانا کی یہ تقریر شمارہ: ۴، ۵ مورخہ ۱۷ ر و ۲۴ ر دسمبر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوگئی۔ ابتدائی نوٹ میں مولانا فرماتے ہیں:

> ''آج ایک سال کے بعد ایک ضرورت سے کاغذ کو دیکھنے لگا تو یہ پورا مضمون نکل آیا۔ مضمون نے سال گذشتہ کا وہ زمانہ یاد دلایا، جب میں نے ان کاغذات کو حوالۂ نسیاں کیا تھا۔ اور اس یاد کے ساتھ ہی مولانا شبلی مرحوم اور ان کی نا قابل فراموش علمی اور ادبی صحبتیں یاد آگئیں۔''

جرت الریاح علی مکان دیارہم
فکانہم کانوا علی میعاد!

اگرچہ یہ ایک محض زبانی اور سرسری تقریر تھی اور پھر اس کے بھی نامکمل و متفرق نوٹ ہیں، تاہم خیال آیا کہ گذشتہ کی ہر یاد اور رفتہ کا ہر تذکرہ بجائے خود دل چسپی

ضرور رکھتا ہے، اسے شائع کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے سرسری اشارات سے کوئی مفید بات کسی کو معلوم ہو جائے اور پھر تذکرۂ غم وارباب علم بہ ہر حال عدم تذکرہ سے بہتر ہے۔"

(البلاغ کلکتہ: ۱۷ و ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۵ء، ص ۱۱۳)

بلاشبہ اس تقریر میں بہت سی مفید باتیں، شبلی کی حیات علمی کے خصائص، فکر انگیز نکات اور ایسے اشارات ہیں جو ہمیں زندگی کے حقائق سے آشنا کرتے ہیں۔ قارئین کرام کے لیے مولانا آزاد کی اس تقریر کا مطالعہ، اگرچہ یہ مکمل اور مربوط اور کلیتاً مولانا کے الفاظ میں نہیں، افادیت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

"آپ اعلان پڑھ چکے ہیں کہ میرا موضوع "مولانا شبلی مرحوم کی حیات علمی و ادبی" ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ ڈیڑھ گھنٹے کی صحبت کے اندر ایک چہل سالہ علمی زندگی کے متعلق آپ کو کیا بتلا سکتا ہوں۔ اس قسم کے علمی موضوعوں کے لیے بہت کافی وقت کی ضرورت ہے۔

ہمارے سامنے ایک ایسی زندگی ہے جو یک سر تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی اور جس کی تصنیف و تالیف کا میدان نہایت وسیع تھا۔ اگر صرف ایک فن ہی کا تذکرہ ہوتا تو اس کے لیے بھی ایک مختصر صحبت کافی نہ تھی۔ یہاں تو مختلف علوم کی تصنیفات و مباحث کے مسائل درپیش ہیں اور جن میں بعض ایسے علوم بھی ہیں جن کا ذوق باہم متضاد و مختلف ہے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں اور ایک ہی وقت کے اندر تاریخ، سیرت، کلام، حدیث اور ادب و شعر کے متعلق تصنیفات مرتب کی ہیں۔"

اس کے بعد مولانا نے شبلی مرحوم کے مختلف فضائل علمی پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہمارے فقید ملت کی ایک خصوصیت "جامعیت ذوق" بھی تھی اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

"ایک ہی وقت میں مختلف علوم کا مطالعہ اور علی الخصوص ایسی چیزوں کا ایک ہی وقت میں ذوق صحیح پیدا کرنا جو باہم متضاد سمجھی جاتی ہوں، عجائبات سے ہے۔ ایک دماغ ایک ہی وقت میں فلسفہ اور شاعری کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور بہت مشکل ہے

> کہ ایک شخص تاریخ کے ساتھ ادب اور کلام کا بھی مطالعہ جاری رکھے۔ قدمائے اہلِ اسلام میں بھی جامعیت کی مثالیں زیادہ نہیں ملیں گی۔"

اس کے بعد مولانا آزاد نے امام غزالی، امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ دہلوی کی مثالیں دے کر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور اسے ثابت کیا ہے۔ آخر میں فرمایا:

> "...... لیکن مولانا شبلی مرحوم کو اگر ہم ایک ہی وقت کے اندر مختلف علوم کے مطالعے میں منہمک پاتے ہیں تو اس کی قدرشناسی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں مختلف زندگیوں کے کام انجام دیے۔ ان کی تصنیفات ان کے تعددِ مذاق و تنوعِ مطالعہ کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں مورخِ خلفاء، مورخِ ملوک، مورخِ علوم اور پھر ادیب، انشاپرداز اور شاعر تھے۔ بارہا تم نے دیکھا ہوگا کہ تاریخ و کلام کی علمی صحبتوں سے اٹھ کر حسن و عشق کی شاعرانہ بزموں میں نغمہ طراز ہیں اور ادب و شعر کی مجلسیں ان کی دقیقہ سنجیوں سے رونق پا رہی ہیں۔"

(الہلال: کلکتہ، مورخہ ۱۷ و ۲۳ دسمبر ۱۹۱۰ء، ص ۱۱۵)

حواشی

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت علامہ شبلی کے انتقال پر الہلال کے ایک صفحے میں مولانا مرحوم کی تصویر کو عبارات مختلفہ متعددہ کے ساتھ سیاہ چوکھٹے میں جس طرح سجایا ہے ٹھیک اسی طرح انھیں عبارات اور تصویر سے زیرِ نظر کتاب کا ایک صفحہ مزین کیا ہے۔ اس عنایت کے لیے ہم اپنے نہایت کرم فرما محترم احمد حسین صدیقی امروہوی (کراچی) کے بہت شکر گزار ہیں۔ (ا۔س۔ش)

(۹)

مرحوم علامہ شبلی نعمانی

حیات علمی و ادبی پر ایک سرسری نظر

تمہیدی نوٹ:

’’گذشتہ سال ایک یادگار جلسہ مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں زیر صدارت جسٹس سید حسن امام منعقد ہوا تھا، اس غرض سے کہ یہ عاجز شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی حیات علمی و ادبی کے متعلق لیکچر دے۔

کسی کثیر التصانیف مصنف کی علمی زندگی کے متعلق، علی الخصوص جب کہ وہ مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہو، ایک دو گھنٹے کی صحبت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ تاہم ایک تقریر کی گئی اور چوں کہ مجمع ہر طرح کا تھا، اس لیے کوشش کی گئی کہ خالص علمی مباحث کا خشک مذاکرہ ہی نہ ہو، بلکہ زیادہ تر انھی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے جو عام طور پر بھی کوئی ادبی و علمی بصیرت سامعین کے لیے رکھتے ہیں۔

میرے ایک عزیز و مخلص مولوی محمد یعقوب صاحب نے اس تقریر کے نوٹ بطور خود لے لیے تھے۔ وہ ان کو مرتب کر کے اس غرض سے میرے پاس لائے کہ کسی بیان میں غلطی تو نہیں رہ گئی ہے۔ چناں چہ وہ کاغذ لے کر میں نے رکھ لیا۔ لیکن اس کے بعد نہ تو مجھے اس کی یاد آئی اور نہ مولوی صاحب نے یاد دہانی کی ضرورت سمجھی۔ آج ایک سال کے بعد ایک ضرورت سے کاغذات کو دیکھنے لگا تو یہ پورا مضمون نکل آیا۔ مضمون نے پچھلے سال گذشتہ کا وہ زمانہ یاد دلایا جب میں نے ان کاغذات کو حوالۂ نسیاں کیا تھا۔ اور اس یاد کے ساتھ ہی مولانا شبلی مرحوم اور ان کی ناقابل فراموش علمی اور ادبی صحبتیں یاد آ گئیں۔

جرت الریاح علی مکان دیارہم
فکانہم کانوا علی میعاد!

اگرچہ یہ ایک محض زبانی اور سرسری تقریر تھی اور پھر اس کے بھی یہ نامکمل و متفرق نوٹ ہیں، تاہم خیال آیا کہ گذشتہ کی ہر یاد اور رفتہ کا ہر تذکرہ کچھ نہ کچھ دل چسپی ضرور رکھتا ہے، اسے شائع کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے سرسری اشارات سے کوئی مفید بات کسی کو معلوم ہو جائے اور پھر تذکرہ علم و ارباب علم، بہرحال عدم تذکرہ سے بہتر ہے۔" (آزاد)

تقریر:

"میں اس موثر اور عظیم الشان اجتماع پر اس ہال کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ انسانوں کا ایک بہت بڑا مجمع مجھے اپنے اردگرد نظر آتا ہے کیوں کہ مجامع ہمیشہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ ہوں گے۔ اس لیے نہیں کہ شوق اور محویت کا ایک غیر معمولی اجتماع میرے سامنے ہے۔ کیوں کہ میں نے اس سے بھی وسیع تر حلقہ ہائے محویت و ذوق دیکھے ہیں اور اس لیے بھی نہیں کہ ایک منتخب اور تعلیم یافتہ صحبت یہاں منعقد ہوگئی ہے، کیوں کہ ایسا بارہا ہوا ہے اور یہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں، مگر حضرات! صرف اس لیے کہ آج کا اجتماع ان تمام موجبات تبریک سے بھی بڑھ کر ایک خصوصیت اپنے اندر رکھتا ہے اور وہ کسی متمدن اور زندہ اجتماع کے لیے سب سے بڑی عظمت ہے جو دنیا میں حاصل ہو سکتی ہے۔ ہمارا آج کا اجتماع طاقت کے ماتم میں نہیں ہے، جس کا ماتم ہمیشہ کیا جاتا ہے۔ ہمارا ماتم دولت کے لٹنے کا نہیں ہے، جس کے لیے غلام دولت مجمعوں نے ہمیشہ ماتم کیا ہے، ہمارا ماتم دنیوی عزتوں کے لیے نہیں ہے، جس پر حلقہ بگوشان دنیا نے ہمیشہ سینہ کوبی کی ہے۔ ہم کو کسی دنیوی عز و جاہ کی کشش کھینچ کر یہاں نہیں لائی ہے، جس کی طاقتور زنجیروں نے ہمیشہ بندۂ ہوس انسانوں کو مقید کیا ہے۔ بلکہ آج ہم صرف علم اور فن کے ماتم کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں، جس کی تقدیس سب سے بالاتر اور جس کی عظمت کے آگے دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی ہیچ ہے۔ (چیرز)

ہم ایک ایسے انسان کے غم میں اشک بار ہیں، جو ایک فقیر بے نوا تھا، جس کو کسی طرح دنیوی عزت حاصل نہ تھی، جو نہ کبھی بڑے بڑے ایوانوں میں رہا اور نہ چاندی سونے کے خزانے اپنے وارثوں کے لیے جمع کیے، (چیرز) البتہ اس نے دنیوی شہنشاہوں کی جگہ چالیس سال تک سلطان علم کی خدمت گذاری۔ (چیرز) پس مبارک ہے وہ اجتماع جو علم اور ارباب علم کے لیے ہو!

اور مبارک ہو تم کہ آج طاقت، حکومت، عزت اور دولت کی جگہ صرف علم اور اہل علم کی عظمت کے لیے جمع ہوئے ہو!'' (چیرز)

اس کے بعد مقرر نے اصل موضوع پر توجہ کی اور اپنی مشکلات کو ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا:

'' آپ اعلان میں پڑھ چکے ہیں کہ میرا موضوع ''مولانا شبلی مرحوم کی حیاتِ علمی و ادبی'' ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی صحبت کے اندر ایک چہل سالہ علمی زندگی کے متعلق آپ کو کیا بتا سکتا ہوں۔ اس قسم کے علمی موضوعوں کے لیے بہت کافی وقت کی ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے ایک ایسی زندگی ہے جو یک سر تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی اور جس کی تصنیف و تالیف کا میدان نہایت وسیع تھا۔ اگر صرف ایک ہی فن کا تذکرہ ہوتا تو اس کے لیے بھی ایک مختصر صحبت کافی نہ ہوتی۔ یہاں تو مختلف علوم کی تصنیفات و مباحث کے مسائل درپیش ہیں اور جن میں بعض ایسے علوم بھی ہیں، جن کا ذوق باہم متضاد و مختلف ہے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں ایک ہی وقت کے اندر تاریخ، سیرت، کلام، حدیث اور ادب و شعر کے متعلق تصنیفات مرتب کی ہیں، اور اس لیے ہمیں بھی ایک ہی وقت کے اندر علوم دینیہ کے خشک اور مقدس مباحث کے ساتھ عالم حسن و عشق اور ادب و شعر کی گلیوں میں بھی سراغ رسانی کرنی ہے اور پھر اس سے بھی مشکل تر یہ ہے کہ کسی مصنف کی زندگی پر نقد و بحث کرنے کے لیے خالص علمی بحث کی ضرورت ہے۔ انھوں نے جن مواضیع پر اپنی مصنفات یادگار چھوڑی ہیں، ان کے مقاصد اور اطراف و متعلقات کو واضح کرنا چاہیے۔ پھر ان مقاصد کے لیے جو ذخیرہ متقدمین کا موجود ہے، اس کی حالت کو بہ کثرت مثالیں دے کر اور اقتباسات پیش کر کے ذہن نشین کرنا چاہیے۔ اس کے بعد دیکھنا چاہیے کہ ایک ایسے متفرق، غیر مرتب، غیر منظم، اور پریشاں سامان سے کیوں کر ایک کامل و جامع اور مرتب و منظم عمارت تعمیر کی گئی؟ اور اجتہادِ فکر، دقتِ نظر، وسعتِ مطالعہ اور حسنِ اخذ و استدلال نے کس طرح ان تمام نقصوں کو پورا کر دیا جو قلتِ مواد اور تساہل مصنفین سے پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن علاوہ قلتِ وقت کے یہ ایک ایسی بحث ہوگی جو شاید بعض طبائع پر شاق گزرے۔

پھر اس سے بھی مقدم تر امر فنِ تصنیف و تالیف کا تذکرہ ہے اور اس کے بغیر میری بحث کامل نہیں ہو سکتی۔ تصنیف کی مختلف قسمیں ہیں اور مجھے بتانا چاہیے کہ ان کے فرائض و مقاصد کیا کیا ہیں؟ نیز یہ کہ ایک مصنف کے لیے استعداد دماغی، حسن مطالعہ اور وسعت معلومات کیوں کر بہم

ہو سکتے ہیں اور ہمارے قدیم علم و فن کا ان ضروری ارکان ثلاثۂ تصنیف میں کیا حال تھا؟

ایسی حالت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس موضوع کو قلت وقت نے کس قدر مشکل کر دیا ہے! تاہم مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہے اور اسی موضوع پر کہنا ہے۔ میں مختصر اشارات سے کام لوں گا اور کوشش کروں گا کہ اس علمی زندگی میں جو عبرتیں اور بصیرتیں خواستگاران علم و بزرگی کے لیے پوشیدہ ہیں، انھیں اپنے سفر بیان کے ہر قدم پر نمایاں کروں۔ کیوں کہ ان تمام مذاکرات و بیانات کا مقصد اصلی یہی ہے۔ "لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب"

اس کے بعد انھوں نے مختصر طور پر تصنیفات کی بہ لحاظ موضوع و مقاصد چند قسمیں بیان کیں اور سب سے پہلے مولانا مرحوم کی تاریخی تصنیفات کو بحث کے لیے منتخب کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے سب سے پہلے اسلام کے تاریخی ذخیرے کی ایک مختصر تاریخ بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ:

''اگرچہ اسلام کی تدوین تاریخ کے مختلف دور ہیں مگر میں تسہیل بیان و اختصار مطلب کی غرض سے انھیں صرف دو بڑی قسموں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ پہلے قدما مؤرخین کا دور جو سنہ ۱۰۰ھ سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ بہ روایت ابن الندیم بعض روایات تحریرات قلم بند کی گئیں اور متاخرین مؤرخین کا دور جنھوں نے چوتھی صدی کے بعد نئی ترتیبات و مقاصد سے تاریخیں مدون کیں۔''

اس کے بعد انھوں نے قدما کی خصوصیات تحریر و تدوین کو بیان کیا اور دیر تک اس کی تفصیل مثالوں کو پیش کر کے ذہن نشین کرتے رہے۔ مثلاً انھوں نے کہا:

''سادگی بیان، سلسلۂ روایت، صحت نقل، عدم تاثر مؤثرات سیاسیہ و دینیہ اور تمام اجزائے ضروریہ واقعہ نگاری کے لحاظ سے ہمارا اصلی ذخیرہ (مثل تمام علوم اسلامیہ کے) صرف متقدمین ہی کا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہی دولت اصلی ضائع ہو چکی ہے اور مستشرقین یورپ علی الخصوص خم پرستان جرمنی کی بہ دولت جو چند کتابیں میسر آ گئی ہیں، وہ ہماری ضرورتوں کے لیے کافی نہیں ہیں۔ سب سے قدیم تر کتاب طبقات ابن سعد ہے، جو صحابۂ کرام کا تذکرہ ہے اور گذشتہ آٹھ سال کے اندر مستشرقین جرمنی کی مساعی حسنہ سے شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد ابن قتیبہ، ابوحنیفہ، طبری، ابن الندیم، بلاذری، یعقوبی اور ابن ہشام ہیں اور تمام متاخرین تقریباً انھی کتابوں سے مواد اخذ کرتے ہیں۔'' پھر انھوں نے متاخرین کا ذکر کیا ہے اور کہا:

"مواد تاریخ کے لیے تقریباً یہ تمام ذخیرہ بیکار ہے۔ کیوں کہ اول تو کوئی ثقہ شہادت نہیں، پھر ترتیب و تنظیم اور جزئیات تاریخ کے لحاظ سے بھی کچھ مفید نہیں۔"

انھوں نے ابن خلدون کے مقدمہ، مقریزی کی تاریخ مصر اور اندلس کے مؤرخین کو اس عام تنزل تاریخی سے مستثنیٰ کر دیا اور محی الدین مراکشی، ابن وزیر غرناطی اور مقری کی بہت تعریف کی "جنھوں نے قرون مدینہ اندلس کے متعلق بہترین مواد تاریخی جمع کیا اور مذاق تصنیف کے تنزل اور تدوین علوم کی اس بدمذاقی سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہوئے جو تمام مشرق پر طاری تھا۔"

سلسلۂ بیان میں انھوں نے تاریخ مصنفات اسلامیہ و عربیہ کے متعلق جا بجا نہایت مفید اور دقیق اشارات کیے جو افسوس ہے کہ اردو مختصر نویسی کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے قلم بند نہیں کیے جا سکتے۔ مثلاً انھوں نے طرز تصنیف، طریق ترتیب، تنظیم مطالب، تقسیم ابواب و فصول، تبویب عناوین و مواضیع اور حسن ضبط و تسلسل بیان کے لحاظ سے بھی قدما مصنفین کو متاخرین پر ترجیح دی اور کہا کہ

"تمام دنیا میں علوم و تمدن کی ترویج و ترقی کے ساتھ اقوام متمدنہ کے علمی ذخیرے میں بھی نئی نئی خوبیاں پیدا ہوئی ہیں۔ مگر تاریخ اسلام کا حال اس لحاظ سے نہایت عجیب اور بالکل برعکس ہے۔ یہاں مذہب، علم، اخلاق اور سیاست سب کی خوبیاں قدما کے حصے میں آئیں اور جس قدر زمانہ گزرتا گیا ترقی کی جگہ ہر شے میں انحطاط ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ آج کل کے ترقی یافتہ فن تصنیف کے لحاظ سے بھی تمام خوبیاں قدمائے اہل اسلام ہی کے یہاں مل سکتی ہیں۔"

اسی سلسلے میں انھوں نے ایک ایسی بات کہی جس پر ممکن ہے کہ عام طور پر تعجب کیا جائے۔ جب وہ سلسلۂ بیان میں فن تدوین علوم کے متعلق قدما کے حالات بیان کرنے لگے تو انھوں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ:

"نہ صرف عظمت موضوع و تقدس مضمون کے لحاظ سے بلکہ طرز تصنیف و ترتیب، ضبط مطالب اور حسن تقسیم و تنظیم کے لحاظ سے بھی تمام تاریخ اسلام میں بہترین کتاب "صحیح بخاری" لکھی گئی ہے اور کوئی اسلامی تصنیف اس تک نہیں پہنچ سکی۔ امام بخاری کے بعد بقیہ اصحاب صحاح و جامعین سنن، معاجم و مسانید نے نئے نئے اسلوب مطالب پیدا کیے مگر کوئی کتاب صحیح بخاری تک

پہنچ سکی اور یہ میں محض فن حدیث کی قدیم خوش اعتقادیوں کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یقین کیجیے کہ اس فن تصنیف کو پیش نظر رکھ کے، جو ترقی یافتہ علمی زبانوں میں آج پایا جاتا ہے، جس نے علی وجہ البصیرت یہ رائے قائم کی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے مثالیں دے کر واضح کیا کہ۔ اس تمام ذخیرے کا کیا حال ہے؟

متقدمین کی تصنیفات ناپید اور متاخرین کا ذخیرہ غیر مفید!

"پھر یہ حال بھی صرف مواد تاریخ و واقعات کے لحاظ سے ہے۔ طرز تصنیف و ترتیب و تفحص جزئیات و طلب کی راہیں تو تقریباً بالکل مسدود ہیں۔ آج کل کے مصنف کے فرائض پچھلے مصنفین سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں، اور اس کا کام بہت مشکل ہے۔ اب محض سلسلۂ سنین و اعصار سے واقعات غیر مربوط و غیر معلل کو جمع کر دینا کسی مکمل تاریخ کا نام حاصل نہیں کر سکتا۔ فلسفۂ تاریخ کی وہ راہ جسے ابن خلدون نے پیدا کیا، مگر ہمیں اس پر نہ چل سکا اور جسے اب یورپ نے اپنا طریقہ کار قرار دیا ہے، ہمارے سامنے ہے اور ہمیں اسی پر چلنا چاہیے۔ غور کیجیے کہ اس لحاظ سے موجودہ زمانے کے ایک مورخ کے کیا فرائض ہیں؟"

اس کے بعد انھوں نے ان فرائض کی تشریح کی اور پھر مثالیں دے کر بتلایا کہ:

"قدما کے غیر مکمل اور متاخرین کے غیر مفید ذخیرے سے ایک نئی تاریخ کا مرتب کرنا کس قدر مشکل کام ہو گیا ہے۔ آج کل کی تاریخوں اور سیرتوں کے جو ضروری ابواب ہیں، ان میں سے ایک باب کے لیے بھی ہمیں مکمل ذخیرہ نہیں مل سکتا۔ یہ کمی اب صرف اجتہاد فکر، سلامتی ذوق، اعتدال رائے، قوت استدلال و استنباط اور بہت زیادہ وسعت مطالعہ و نظر ہی سے دور ہو سکتی ہے۔ ہماری بہت سی قیمتی معلومات ہیں جن کو کوئی باقاعدہ جگہ نہیں ملی ہے۔ مگر وہ کہیں نہ کہیں پریشان اور آوارہ گرد ضرور موجود ہیں۔ اس قدر وسیع نظر ہونی چاہیے کہ صدہا غیر متعلق کتابوں سے آپ اپنے موضوع کا مواد حاصل کر سکیں۔ بہت ممکن ہے کہ جو تاریخی واقعہ تاریخ ابن اثیر میں آپ کو ملنا چاہیے تھا، وہ خوارزمی کے کسی خط میں آپ کو مل جائے۔ اگرچہ وہ ادب کی کتاب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کسی اہم واقعے کی تفصیل کے لیے تمام تاریخوں کی ورق گردانی کر چکے ہوں اور ناکام رہے ہوں، لیکن وہ ایک کتاب حدیث کی شرح میں مل جائے، جہاں ضمناً اس کا کچھ تذکرہ آ گیا ہے!

آپ ایک عمارت بنا رہے ہیں، مگر اس کا مصالحہ صدہا میلوں کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور ایسے ایسے گوشوں میں پوشیدہ ہے جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ پس بہت ہی وسیع تلاش و تفحص کی ضرورت ہے اور صرف ایک فن ہی کی نہیں بلکہ واقفیت عامہ کی بھی! ارباب کار سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کس قدر مشکل کام ہے؟''

اسی سلسلے میں مطالعے کا ذکر آ گیا اور طالبانِ علم کے لیے نہایت مفید نکات انھوں نے بیان کیے۔ مثلاً انھوں نے کہا:

''محض کثرتِ مطالعہ ہی مفید نہیں ہے بلکہ اصلی چیز ''حسنِ مطالعہ'' اور ''قوتِ اخذ و نظر'' ہے۔ بہت سی کتابوں کو پڑھ کر بھی ایک شخص جاہل رہ سکتا ہے۔ جب اخذِ مطالب و تجسسِ نوادر کی قوت دماغ میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہر کتاب کو اوّل سے لے کر آخر تک پڑھا جائے اور اس کے تمام کار آمد مطالب کے نوٹس لکھے جائیں۔ بڑے مصنفین نے کبھی بھی باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا۔ وہ ایک بڑی سے بڑی کتاب کو اٹھا لیتے ہیں اور محض ایک سرسری نظر ڈال کے اور اِدھر اُدھر سے دیکھ کے بہترین معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی نظروں کو کام کی باتوں سے کچھ ایسی مقناطیسیت ہو جاتی ہے کہ وہ جب صفحوں پر پڑتی ہیں تو صرف کام کی باتوں ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے بیکار اطراف کو اس طرح چھوڑ دیتی ہیں گویا ان کے غیر مفید ہونے کی نسبت وہ پہلے سے فیصلہ کر چکی ہیں۔ اس حقیقت کی صرف وہی لوگ تصدیق کر سکتے ہیں جن پر یہ فیضانِ علم کھل چکا ہے۔ کیوں کہ یہ بحث و استدلال کا مسئلہ نہیں ہے، زیادہ تر ذوق و کیفیت کا سوال ہے۔''

درمیان میں لیکچرر نے اور بہت سے نکاتِ مطالعہ اور فنِ تصنیف تالیف کے متعلق بیان کیے۔ پھر مولانا شبلی مرحوم کی بعض تصنیفات کو مثال کے لیے چن کر اپنے تمام گذشتہ بیانات کو منطبق کیا اور دکھلایا کہ انھوں نے اسلامی تاریخ کی تدوین و تہذیب کے ان مشکل ترین مراحل کو کہاں تک کامیابی کے ساتھ طے کیا اور پرانے مصالحے سے کیسی باقاعدہ اور منتظم عمارتیں کھڑی کیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے طریقِ استدلال، تحلیلِ واقعات، توجیہِ امور اور ترتیب و انطباقِ حوادث پر بھی بحث کی۔ پھر فرمایا کہ:

''مختلف فنون کے مطالعے کا ذکر آ گیا ہے اور میں بتلانا چاہتا ہوں کہ ہمارے فقیدِ ملت کی ایک خصوصیت ''جامعیتِ ذوق'' بھی تھی۔''

انھوں نے کہا کہ:

’’اس تعلیم یافتہ مجمع میں جو میرے سامنے ہے، یہ کہنا مزید تفصیل کا محتاج نہ ہوگا کہ ایک ہی وقت میں مختلف علوم کا مطالعہ اور ذوق پیدا کرنا ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہمیشہ اور ہر علمی عہد میں کمیاب رہی ہے۔ علی الخصوص ایسی چیزوں کا ایک ہی وقت میں ذوق صحیح پیدا کرنا جو باہم متضاد سمجھی جاتی ہوں۔ ایک دماغ ایک ہی وقت میں فلسفے اور شاعری کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور بہت مشکل ہے کہ ایک شخص تاریخ کے ساتھ ادب اور کلام کا بھی مطالعہ جاری رکھے۔ قدمائے اہل اسلام میں بھی جامعیت کی مثالیں زیادہ نہیں ملیں گی۔ حضرت امام غزالی کی احیائے علوم الدین جس درجے کی کتاب ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تصوف و اخلاق، معارف شریعت اور علوم اسرار الدین میں حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ دہلوی) کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد اور کوئی کتاب اس کے سامنے نہیں لائی جا سکتی۔ مگر ساتھ ہی فن حدیث کے متعلق اس قدر بے احتیاط کتاب ہے کہ اکثر صوفیوں اور حکمائے الٰہیین کے اقوال کو حدیث قرار دے دیا ہے اور اسرائیلیات سے تو اس کے متعدد ابواب مملو ہیں۔ چناں چہ امام حجۃ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کو کہنا پڑا کہ ’’کلامہ فی الاحیاء غالبہ جید، لاکن فیہ اربع مواد فاسدۃ، مادہ فلسفیہ ومادہ کلامیہ ومادۃ الاحادیث الموضوعۃ‘‘..... الخ لیکن اس سے امام غزالی کے جلالت مرتبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ وہ متکلم، حکیم، فقیہ اور صوفی تھے نہ کہ محدث و ناقد حدیث و لکل فن رجال!

لیکن مولانا شبلی مرحوم کو اگر ہم ایک ہی وقت کے اندر مختلف علوم کے مطالعے میں منہمک پاتے ہیں تو اس کی قدر شناسی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے ایک ہی زندگی میں متعدد زندگیوں کے کام انجام دیے۔ ان کی تصنیفات ان کے تعدد مذاق و تنوع مطالعہ کی شہادت دیتی ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں مؤرخ خلفا، مؤرخ ملوک، مؤرخ علوم اور بحر ادیب، انشا پرداز اور شاعر تھے۔ بارہا تم نے دیکھا ہوگا کہ تاریخ و کلام کی علمی صحبتوں سے اٹھ کر حسن و عشق کی شاعرانہ بزموں میں نغمہ طراز ہیں اور ادب و شعر کی مجلسیں ان کی دقیقہ سنجیوں سے رونق پا رہی ہیں!‘‘ (باقی آئندہ)

(البلاغ کلکتہ: شمارہ ۴ و ۵، مورخہ ۱۷ر و ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۵ء، ص ۱۵_۱۳)

نوٹ:

افسوس کہ اس لیکچر کی دوسری قسط شائع نہیں ہوئی۔

(۱۰)

ابوالکلام اور علامہ شبلی

آخری دور

مولانا ابوالکلام آزاد کو حضرت علامہ شبلی سے عقیدت و نیاز کا جو تعلق تھا وہ ان کے علمی فضائل، ذہنی کمالات، خصائلِ طبع، فکری رجحانات، بلند افکار، ناقابلِ فراموش علمی، ادبی اور تاریخی کارناموں، ملت کی دردمندی، اخلاصِ خدمت اور پیشِ نظر اعلیٰ مقاصد ملی و سیاسی کے مشاہدہ و علم اور تجربات کی بنا پر تھا۔ قومی، سیاسی اور تعلیمی مسائل میں دونوں کا انداز فکر یکساں تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال تو یہ ہے کہ ابوالکلام نے قومی و سیاسی مسائل میں جو راہ اختیار کی تھی وہ حضرت شبلی کی صحبت کا فیضان تھا۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

> "۱۹۱۲ء میں انھوں نے الہلال نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں۔ لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمراہی جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے۔" (حیاتِ شبلی ص ۴۳۵)

شبلی ابوالکلام کے تعلقات اور ان کے قرب و صحبت کے اثر و فیضان کے بارے میں حضرت سید صاحب کی رائے کی جو اہمیت ہے، اگر اس سے بالکل اسی طرح اتفاق نہ کیا جائے تب بھی اس بات سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علامہ شبلی کی صحبت نے ابوالکلام کے خیالات کو پختہ ضرور کر دیا تھا۔ اس لیے کہ ان کے اس انداز فکر اور کانگریس کی طرف ان کے رجحان کے اشارے الندوہ کے دور اور علامہ شبلی کی صحبتوں سے پہلے لسان الصدق کے زمانے میں ملتے ہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوالکلام نے حضرت شبلی کی صحبتوں سے بہت فیض اٹھایا تھا۔ لیکن اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں مولانا آزاد کا جو رجحان تھا وہ ان کا اپنا مستقل فکر اور رجحان تھا اور ان

کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ تھا۔ ان کا یہ فکر و رجحان کسی سے مستعار تھا اور نہ محض کسی کی صحبت کا فیضان تھا۔ جس طرح حضرت علامہ شبلی نے غور و فکر کے بعد ایک صحیح فکر کا سراغ پا لیا تھا، اسی طرح ابوالکلام نے اپنی ذہانت اور مطالعہ و نظر کے بعد اس فکر تک رسائی پالی تھی۔ اگر وہ اپنے گھر کی رسمی و روایتی زندگی اور مقلدانہ عقاید و ایمان سے اپنے صحیح طرز فکر اور مطالعہ و تحقیق کے بعد بغاوت کر سکتے تھے تو کیا اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں وہ اپنی خداداد ذہانت اور مطالعہ و نظر سے صراط مستقیم معلوم نہیں کر سکتے تھے؟

اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا بیان زیادہ واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”مولانا (آزاد) کی تحریر اور تحریک پر کوئی اور اثر ہے تو وہ شبلی ہی کا ہے۔ شبلی اور مولانا دونوں لیگ کے مخالف اور اپنے وقت کی اصطلاح میں نیشنلسٹ تھے۔ دونوں اسلام، ہیروز آف اسلام اور عالم اسلام اور اسلامیان عالم کا کلمہ جپتے تھے۔ دونوں فارسی، اور عربی ادب کا یکساں بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، دونوں شاعر تھے، دونوں آرٹ کے دل دادہ تھے، موسیقی پر دم دیتے تھے اور جمالیات کا نکھرا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ پھر کوئی تعجب نہیں اگر شبلی سے کسی قدر قریب رہنے کے بعد، خاص کر الندوہ کی ادارت کے زمانے میں وہ شبلی کے طرز فکر اور طرز نگارش سے متاثر ہوئے ہوں۔“

(مولانا ابوالکلام آزاد: رام پور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۱)

اجمال و تفصیل کے علاوہ دونوں بیانوں میں فرق صرف یہ ہے کہ حضرت سید صاحب حتمی فیصلہ سناتے ہیں، جب کہ ڈاکٹر بیدار صاحب امکان سے بعید نہیں سمجھتے۔ ان کے اس جملے نے کہ ”پھر کوئی تعجب نہیں اگر شبلی سے“ ان کی رائے کو قابل قبول بنا دیا ہے۔ میں اپنی بات میں اتنا اور اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ۱۹۰۵ء میں الندوہ میں شبلی کی صحبت و رفاقت سے پہلے شبلی اور ابوالکلام...... دونوں کے فکر کے نشو و نما اور رائے کی تہذیب و تربیت کے ماحول الگ الگ تھے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ابوالکلام کا طرز فکر اور خیالات شبلی کی ملاقات سے پہلے یہ نہیں تھے تو یہ انقلاب فکر پانچ چھ ماہ کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں کا نتیجہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر شبلی کی صحبت کا فیضان ہو تو ان سے زیادہ مدت تک شبلی کے قرب و صحبت سے فیض اٹھانے والے اور ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے

والے تو ''مولانا ابوالکلام'' سے زیادہ بڑے ابوالکلام بن جاتے۔ ابوالکلام نے ان صحبتوں سے یقیناً فیض اٹھایا ہوگا لیکن ان کی فضیلتیں خداداد تھیں۔

حضرت علامہ شبلی سے ابوالکلام کی عقیدت کسی وقتی اثر یا الندوہ کے دور کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں ہی کا نتیجہ نہ تھی۔ اسی نے ان کی عقیدت اور نیازمندی میں استقرار ہے۔ انھوں نے الندوہ کی مجلس برخاست ہو جانے کے بعد بھی الندوہ سے تعلق رکھا اور ندوۃ العلماء کے مقاصد اور اس کے دارالعلوم کا مفاد بھی عزیز رکھا اور حضرت شبلی کے انتقال کے بعد بھی ان کی عقیدت ختم نہیں ہوگئی۔ ان کے علمی تذکروں سے اپنی مجالس علمی کو گرمایا اور پرسوز بنایا اور جب ان کی یاد آئی، حسرت و یاس کی اداسی دل پر اپنے داغ چھوڑ گئی۔ ابوالکلام نے اپنی زندگی کے ہر دور میں اور طرح طرح سے ان کی یاد اور ان کے ذکر کو دراز کیا۔

شبلی سے ابوالکلام کے تعارف کی داستان اور ۱۹۰۳-۵ء میں شبلی سے ملاقات کی کہانی تو اس سلسلے کے پہلے مضمون ہی میں بیان کر دی تھی۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۵ء تک الندوہ، ندوۃ العلماء، الہلال اور ندوہ کے بعض حوادث کے سلسلۂ بیان میں دونوں بزرگوں کے تعلقات کے استحکام کی تفصیلات لکھی گئیں۔ بعد کے دیگر معاملات اور ندوہ کے اصاغر و اکابر سے مولانا کی دلچسپیاں اور تعلقات کا تذکرہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے افادات میں بسط آیا ہے۔

مناسب ہوگا کہ ۱۹۱۵ء کے بعد کے حالات میں بھی علامہ شبلی کے تذکار پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۸-۱۹۱۷ء میں جب مولانا رانچی میں نظربند تھے اور ''تذکرہ'' زیر تصنیف تھا تو ایک بار نہیں کئی بار ''تذکرہ'' میں علامہ شبلی کی سیرت و افکار کا ذکر آیا ہے۔ ایک بار ''قرآن اور سیرت محمدیہ'' کے سلسلۂ بحث میں ان کا ذکر آیا ہے کہ وہ کس طرح کسی معاملے کی ابتدا شک اور تردد سے کرتے تھے اور پھر وہ جب تک یقین کے لیے مجبور نہ ہو جائیں، یقین نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر ندوہ ہی کے معاملات کا حوالہ دیا ہے کہ

> ''ندوہ کے معاملات میں جو الجھاؤ لوگوں نے ڈالے، وہ ان کے اسی ضعف یقین و عدم جزم و صلابت ارادہ کا نتیجہ تھا۔ ورنہ ان سے مخالفت کرنے والوں میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو ان کو ان کی جگہ سے ہٹا سکتا۔۔۔''

(تذکرہ دہلی، ۱۹۶۸ء، (پہلی بار)، ص۔۲۰۳)

تذکرہ میں مولانا نے ۱۹۱۱ء کی کلکتہ کی ایک مجلس کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے ساتھ وقف علی الاولاد کے ایک وفد میں شریک علما کی ایک جماعت موجود تھی۔ ان میں سے ایک عالم نے بقول مولانا آزاد کے:

> ''اسی لب و لہجے میں، جو ان بزرگوں کے لیے مخصوص ہے، آج کل کے انگریزی خواں تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب سے بے خبری اور الحاد و بے قیدی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا:
>
> یہ شکایت کم از کم آپ لوگوں کی زبان تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ میرے خیال میں تو آپ اور وہ، دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب و مسلک کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی قدامت و روایت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو آپ کا چھوٹا بھائی کہا جائے! آپ یونانیوں کے حلقہ بگوش، وہ یورپ کے پرستار! قرآن و سنت سے آپ بھی دور و مہجور، وہ بھی بے خبر و نفور:
>
> محتسب داند کہ حافظ مے خورد
> واصف ملک سلیمان نیز ہم!''

(ایضاً، ص ۲۳۲)

یہ ایک دلچسپ بحث ہے جو مزید ایک صفحے تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ تذکرہ ہی میں ایک مقام پر مفروضہ و غیر وقوع حوادث کے بارے میں فتویٰ نویسی میں اسلاف کرام کے رویے کی بحث میں علامہ شبلی کا نہایت لطیف انداز میں ایراد بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قاعدہ تھا جب کبھی کسی مسئلے کی نسبت سوال کیا جاتا تو دریافت فرماتے، کیا یہ صورت پیش آئی ہے؟ اگر سائل کہتا، ہاں! تو جواب دیتے، نہیں تو خاموش رہتے۔ حضرت شیخ اکبر نے ''فتوحات'' میں کیا خوب فرمایا ہے، فان فیہ تلمیح الی ان من افتی فی الحوادث الفرضیہ قبل وقوعھا فلا دین ولا علم اور یہی وجہ ہے کہ یہ صورت صحبت واقعہ مناظرہ درمیان امام ابو حنیفہ وقتادہ مصری رضی اللہ عنہما منقولہ عقود الجمان وخطیب۔) جب حضرت امام نے زوج مفقود الخبر

> کے متعلق سوال کیا تو قتادہ نے پوچھا، کیا یہ صورت پیش آئی ہے؟ اگر نہیں آئی ہے تو فرضی صورتوں میں سوال و جواب بدعت ہے! اسی طرح مباحثہ حضرت قاضی ابو یوسف و قاضی یحییٰ بن سعید انصاری نسبت غلام مشترک میں قاضی یحییٰ نے فرضی صورتوں میں بحث و تعمق سے انکار کر دیا۔ ان بزرگوں کا انکار ان کے کمال علم و حکمت و فہم اسرار شریعت و غوامض ہدایت امم و اجتماع کا نتیجہ تھا۔ ظاہر پرستانہ بے خبری و بے عقلی یا بہ الفاظ صریح بے وقوفی نہ تھی جیسا کہ بہت سے لوگوں نے سمجھا! اور جیسا کہ مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے "سیرۃ النعمان" میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔"

(ایضاً، ص ۲۳۲)

یہ دلائل و امثال سے مرتب اور لطف بیان و اسلوب تحریر سے مزین ایک دل چسپ بحث ہے جو کئی صفحات پیچھے چھڑی تھی اور آگے تک دراز ہوتی چلی گئی ہے۔

یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام کو رانچی کی نظر بندی سے رہائی ملی۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریک خلافت کا آغاز ہو چکا تھا اور ترک موالات کا چولھا دہکنا شروع ہوا تھا۔ آیندہ کے دو سال مولانا کو خود اپنے سر پیر کی خبر نہ تھی۔ اس زمانے میں وہ ایک دن کے لیے بہ اطمینان سے بیٹھ سکے نہ تصنیف و تالیف کا کوئی سر و سامان ہوا تھا۔ تا آں کہ وہ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار ہو گئے اور پورے ایک سال ستائیس دن کے لیے کلکتہ کی پریسیڈنسی جیل علی پور میں محبوس کر دیے گئے۔ علی پور جیل کی یادگار "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" بہ روایت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہے، یا وہ چند تحریرات "جو ذکر آزاد" مؤلفہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی میں شامل ہیں۔ "آزاد کی کہانی......" شبلی مرحوم سے مولانا آزاد کے تعارف اور ابتدائی تعلقات کی تاریخ و تفصیل کا بڑا ماخذ ہے جس کا ذکر سلسلے کے پہلے ہی مضمون میں گزر چکا ہے۔ قیام ربط اور خلا کو پر کرنے کے لیے صرف ایک حوالہ دینا چاہوں گا۔ اتفاق سے یہ مکمل حوالہ ابتدائی مضمون میں درج ہونے سے رہ بھی گیا ہے۔

مولانا شبلی سے عقیدت:

۱۹۲۲ء میں جب مولانا آزاد کلکتہ کی پریسیڈنسی جیل علی پور میں قید تھے تو لکھنؤ میں حضرت علامہ شبلی کے ساتھ گزری ہوئی صحبتوں کو بڑی حسرت سے یاد کیا اور اعتراف کیا کہ انھیں ان صحبتوں سے بہت فایدہ پہنچا۔ ”مولانا شبلی سے عقیدت“ کے زیر عنوان فرماتے ہیں:

> ”ہر وقت مولانا مرحوم سے یک جائی رہتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے سے اٹھنے کے عادی اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر! جاڑے کا موسم تھا، صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ اسی وقت چائے کا دور چلتا۔ طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ اکثر فارسی اشعار کا اپنے خاص ٹون میں ترنم کرتے، ان اشعار کے متعلق تذکرے رہتے، شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی و ادبی تذکروں میں بسر ہوتا۔ حقیقتاً وہ ایسی صحبتیں تھیں جن کا لطف و کیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی۔ مجھے ان صحبتوں سے بہت فایدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ مدفون ہوگئے، وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پر لطف صحبت تھی جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ ان کا علمی ذوق جو وسیع اور ہر وادی میں تھا، ایک ساتھ ہی مدفون ہو چکا ہے۔“

(آزاد کی کہانی ۔ ۔ ص ۳۱۴_۱۵)

مولانا شبلی کا ذوق لطیف:

علی پور جیل کی یادوں ہی کے سلسلے میں مولانا ملیح آبادی نے علامہ شبلی مرحوم سے متعلق مولانا آزاد کا ایک بیان ”ذکر آزاد“ میں نقل کیا ہے، جس سے حضرت شبلی کے ذوق لطیف اور سرود و نغمے سے ان کی دل چسپی کا پتا چلتا ہے۔ ملیح آبادی لکھتے ہیں:

> ”جیل میں ایک دن مولانا نے مرحوم علامہ شبلی نعمانی کے متعلق ایک دل چسپ لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے، مولانا شبلی نہایت زندہ دل، صاحب ذوق آدمی

تھے۔ حسن پرست بھی تھے اور موسیقی وغیرہ فنونِ لطیفہ سے گہری دل چسپی رکھتے تھے، مگر مولوی تھے، عام رائے سے ڈرتے تھے اور بڑی احتیاط سے اپنا ذوق پورا کرتے تھے۔

ایک دفعہ موصوف دہلی میں حکیم اجمل خاں مرحوم کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے کہ خواجہ حسن نظامی ملنے آئے اور کہنے لگے، "آج میرے ہاں قوالی ہے۔ دہلی کی مشہور طوائف ..... (میں نام بھول گیا ہوں) گائے گی۔ محفل بالکل خاص ہے۔ میرے اور آپ کے سوا وہاں کوئی نہ ہوگا۔

مولانا شبلی نے دعوت قبول کر لی۔ کشمیری شال اوڑھی، وضع بدلی، بند گاڑی میں بیٹھے اور خواجہ صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ واقعی کوئی تیسرا آدمی مدعو نہ تھا۔ قوالی شروع ہوئی اور مولانا نے اپنے آپ کو محتسبوں سے محفوظ پا کر ضرورت سے زیادہ آزادی سے کام لیا۔ دل کھول کے گانے کی اور گانے والی کی تعریف کی۔ طوائف سے ہنستے بھی رہے اور اسے چھیڑتے بھی رہے۔

طوائف کا طبلچی ایک کیم شحیم سن رسیدہ آدمی تھا۔ سر پہ پٹے تھے اور منہ پر چوکور بڑی سی ڈاڑھی تھی۔ پٹے اور ڈاڑھی خضاب سے بھونرا ہو رہے تھے۔ محفل جب برخواست ہونے لگی تو دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے مولانا کی طرف لپکا اور بڑے جوش سے مولانا کے ہاتھ پکڑ لیے، چومے، آنکھوں سے لگائے اور جوش سے کہنے لگا، کس منہ سے خدا کا شکر ادا کروں کہ عمر بھر کی آرزو آج پوری ہوگئی۔ مولانا سبحان اللہ، ماشاءاللہ! آپ نے الفاروق لکھ کر وہ کام کیا ہے جو نہ کسی سے ہوا ہے، نہ ہو سکے گا۔ بخدا آپ نے قلم توڑ دیا ہے! بندے کی کتنی تمنا تھی کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہو، تو آج بائی جی اور خواجہ صاحب کی بدولت یہ سعادت اس گناہ گار کو نصیب ہوگئی!"

مولانا نے فرمایا:

"علامہ شبلی بڑے ذکی الحس تھے۔ اس غیر متوقع واقعے نے ان کی ساری خوشی کرکری کر دی۔ شرم سے عرق عرق ہوگئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ طبلچی کو کیا

جواب دیں، کس طرح محفل سے غائب ہو جائیں؟ بے جان بت کی طرح بیٹھے رہ گئے۔ خواجہ صاحب نے موقعے کی نزاکت محسوس کی اور علامہ کو فوراً رخصت کر دیا۔ مگر علامہ کو سخت ذہنی صدمہ پہنچ چکا تھا۔ ہفتوں شگفتہ نہ ہو سکے۔"

مولانا نے فرمایا:

"یہ واقعہ خود علامہ شبلی نے ان سے بیان کیا تھا۔ بیان کرتے وقت بھی متاثر تھے اور بار بار کہتے تھے، کاش! "الفاروق" میرے قلم سے نہ نکلی ہوتی اور نکلی تھی تو اسے پڑھنے والا جلیلی اس قوالی سے پہلے ہی ناپید ہو چکا ہوتا۔ یہ نہیں تو مجھے موت آ گئی ہوتی کہ اس ذلت سے بچ جاتا۔" (ذکرِ آزاد: کلکتہ ۱۹۶۰ء، ص۱۹_۲۱۷)

جزیے کی نہایت قیمتی تحقیقات:

۳۶ـ۱۹۳۵ء میں جب ترجمان القرآن کی دوسری جلد مولانا کے زیرِ قلم تھی تو تفسیر سورۂ کہف میں "جزیہ" کی بحث میں انھوں نے علامہ شبلی کی اسلامی تحقیق کی تحسین کی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

خود "جزیہ" کا لفظ بھی ایران کی پیداوار ہے، یعنی لفظ گزیت سے معرب ہوا ہے۔ اس بارے میں مولانا شبلی نعمانی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ زمانہ حال کی نہایت قیمتی اسلامی تحقیقات میں سے ہے۔"

(ترجمان القرآن (جلد سوم): دہلی، ۱۹۷۷ء، ص۸۹۳)

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی:

ندوۃ العلماء کے بزرگوں میں سب سے آخر میں حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رہ گئے تھے، جن سے گزشتہ صحبتوں کی یادیں تازہ تھیں۔ حضرت صدر یار جنگ سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات الندوہ سے ادارتی تعلق کے زمانے میں ہوئی تھی۔ حضرت شروانی اور علامہ شبلی الندوہ کے مدیر تھے اور مولانا آزاد ان کے نائب مدیر بنائے گئے تھے۔ چھ ماہ گزرے تھے کہ مولانا نے وکیل امرتسر کی ادارت قبول کر لی، لیکن الندوہ سے ترکِ تعلق کا اثر ان دونوں بزرگوں سے روابط پر نہیں پڑا۔ تعلقات نہ صرف قائم رہے بلکہ اور زیادہ پختہ ہو گئے۔

حضرت شروانی سے رفتہ رفتہ تعلقات اتنے قریبی ہو گئے کہ بعض حضرات کو، جو ان سے اسی وقت سے دوستی کا رشتہ رکھتے تھے، رشک پیدا ہو گیا اور یہ جذبہ دل ہی میں پنہاں نہ رہا بلکہ زبان قلم پر آیا اور صفحۂ کاغذ پر اپنا ادبی نقش چھوڑ گیا۔

حضرت صدر یار جنگ کا ادبی و شعری ذوق بہت پختہ اور علمی پایہ بہت بلند تھا۔ وہ اُردو اور فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے۔ علامہ شبلی ان کی فارسی شاعری کے دل دادہ اور ابوالکلام پرستار تھے۔ وہ خصائص علم و تہذیب کی ایک جامع شخصیت، محامد اخلاق اور محاسن سیرت سے مزین، پروقار اور متدین بزرگ تھے۔ ادب و تہذیب میں وہ اپنے دور میں مثال تھے۔ کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ وہ مروت کا پیکر اور وضع داری کا مجسمہ تھے۔ سیاست سے انھوں نے کبھی تعلق نہ رکھا تھا لیکن ملی خدمات میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ بیسیوں دینی و ملی ادارے ان کے ایثار کے رہین منت تھے۔ علی گڑھ کالج اور یونی ورسٹی تو گویا ان کا اپنا ادارہ تھا۔ ندوۃ العلماء کے سرپرست اور دارالعلوم دیو بند کی امداد میں ہمیشہ کشادہ دست رہے۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے اولین مددگاروں میں تھے۔

ابوالکلام آزاد سے ان کا پہلا برتاؤ شفقت کا تھا۔ بعد میں وہ ان کے ہم نشیں، دوست اور قابل فخر صدیق مکرم بن گئے۔ دونوں میں مشرقی تہذیب، وضع داری اور ذوق علمی و ادبی قدر مشترک تھا۔ تعلقات کا آغاز ۱۹۰۵ء میں ہو گیا تھا۔ لیکن مراسلت کے سلسلے کا پتا تقریباً ۱۹۳۰ء سے ملتا ہے۔ یہ مراسلت اُردو ادب کا یادگار سرمایہ ہے۔ آیئے کہ اس یادگار اور قیمتی سرمایے کے مطالعے سے گذشتہ صحبتوں کی یاد تازہ کریں۔ علامہ شبلی مرحوم ان یادوں کی جان ہیں۔ صدیق مکرم حضرت نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۴ر ستمبر ۱۹۳۰ء میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ''آج الماریوں میں ایک کتاب ڈھونڈھ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک مجلد پر نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو ارشاد الکلام وغیرہ ندوہ کے بعض رسائل کا مجموعہ تھا۔ اس مجموعے کو دیکھتے ہی ذہن ندوے کی صحبتوں کی طرف منتقل ہوا اور پھر اچانک آپ یاد آ گئے۔

قاصدے کو کہ فرستم بہ تو پیغامے چند

بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملاقات ہوتی، افکار زمانہ اور کاوشہائے روزگار سے الگ ہو کر دو گھڑی بیٹھتے اور پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرتے، جام و مینا کا دور نہ سہی، چائے کے پیالہ ہائے پیہم کیا کم ہیں:

زخیل دردکشاں غیر ما نماند کسے
بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

مڑ کے دیکھتا ہوں تو گزری ہوئی صحبتیں ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں اور کچھ دیر کے لیے ایک بالکل دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔ آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی، جب ندوہ کی ایڈیٹری کے سلسلے میں وہاں مقیم تھا۔ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ پورے پینتیس برس ہو گئے۔ اس وقت یاد آ رہا ہے کہ آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے۔ اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی۔ دہلی کا جلسۂ ندوہ آپ کو یاد ہے؟ غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہو گی۔ (۱) مرحوم مولانا شبلی، آپ اور میں، مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے تھے اور شب و روز صحبتیں رہتی تھیں۔ امین آباد لکھنؤ میں مولانا مرحوم کا بالاخانہ اور لیگ کے جلسے کے موقع پر وہاں قیام، یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے۔ اٹھائیس برس ہو گئے۔ اس وقت سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ لبثنا یوماً او بعض یوم (سورۃ الکہف:۱۹) لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحٰھا (سورۃ النازعات:۴۶) کا شاید یہی مطلب ہے۔ ۱۹۱۳ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرا تھا۔ آپ بھی دہلی آئے اور پانی پت کا باتفاق سفر کیا۔ اس سفر کی صحبتوں کی ایک ایک بات اس وقت صفحۂ دماغ پر ابھر رہی ہے۔''

اس کے بعد کس حسرت افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں:

''افسوس جتنے ہم نفس تھے، ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ وہ صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں، اب برسوں گزر جاتے ہیں، ایک متنفس بھی میسر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق طبیعت کی چار باتیں کر لوں، اب نہ زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمل ہے، نہ ہم زمانے کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں:

كان لم يكن بين الحجون الى الصفاء
انيس و لم يسمر بمكة سامرا

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، چائے پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں:

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم
بعد منزل نہ بود در سفر روحانی!"

اور اس درازنفسی کا مقصد بھی یہ بتاتے ہیں:

"یہ ساری درازنفسی اس لیے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آپ یاد آ گئے، ملاقات میسر نہیں ہے تو دل کی آرزومندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں:

در ہیچ نسخہ معنی لفظ امید نیست
فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم"

(کاروانِ خیال: بجنور ص ۶۲۔۵۹)

اس کے بعد ۲۹ را کتوبر ۱۹۳۰ء کے خط میں پھر شبلی کا ذکر نکل آیا۔ لکھتے ہیں:

"آپ کی غزل پر علامہ شبلی کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہے(۲) جو اس عہد میں مل سکتی تھی۔ یہ شعر کتنا رواں اور ڈھلا ہوا نکلا ہے:

حدیثِ دوست بگوشم رسد ز پردۂ دل
حکایتِ نے و صوتِ رباب را چہ کنم

اور نقاب کے قافیے میں تو واقعی ردیف چمک اٹھی ہے:

اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

علامہ مرحوم کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا:

ولیس لله بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

خواجہ حالی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں!

(کاروانِ خیال، ص۹۲)

یہ بات تو انھوں نے حضرت علامہ شبلی کے حوالے سے شروع کی تھی۔ اس کے بعد وہ براہِ راست مولانا شبلی کے تذکرے پر آ گئے۔ فرماتے ہیں:

> ”فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، سرتاسر مغز بے پوست تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینہ ایسا گزرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بہ دل نہ ہوتی ہو۔ وہ کیا گئے علم و فن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہو گیا۔“

درمیان میں ان کی سحر خیزی کی یاد آ گئی۔ چونکہ وہ خود بھی بچپن سے اس کے عادی تھے، اس لیے ہم ذوقی کے ذکر میں ان کے لیے دوگونہ لذت تھی۔ اس کے ساتھ ہی علامہ شبلی کے ذوق و مزاج اور ذہن و طبع کی بعض خوبیوں کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔ والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔ اس اشتراکِ عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا کر دیا تھا۔ جب کبھی یک جائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف و کیفیت کا وقت ہوتا۔ چائے کا دور چلتا اور علم و فن اور شعر و ادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے۔ اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طلب علم کے ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکیِ طبع، جو اس راہ کے مہالک و آفات میں سے ہے، انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔“

(کاروانِ خیال، ص۹۲)

یہ ذکر ختم ہوا تھا کہ ان کی شاعری کی طرف ذہن پلٹ گیا۔ اور شبلی کی شاعری پر اتنا عمدہ تبصرہ ہو گیا کہ کیا کسی نے کیا ہو گا! مطالب کی معنویت اپنی جگہ، خود تبصرے کی زبان کی سلاست اور روانی اور بیان کی شگفتگی اور دل آویزی الگ ہے۔ یہ ایک شاعر کے کلام پر تبصرہ نہیں، برِاعظم ہند و پاکستان کے ایک فارسی شاعری کی دریافت ہے، غزل کے آخری فارسی شاعر کی دریافت! مولانا فرماتے ہیں:

"شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان کے حصے میں آیا تھا اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہوئی۔ کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے تو ان کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ ہے تغزل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے، لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیل کے نئے نئے میدان پیدا کیے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں۔ خصوصاً حیدرآباد والی نظم! اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوبِ شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔

اس معاملے کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں جن کی ترتیب و اشاعت میں غریب براؤن نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں، خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔

غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرجوشی و کیفیت ہے اور حقایق و واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے۔ مولانا کا ایک شعر سیکڑوں مرتبہ دہرا چکا ہوں، لیکن پھر بے اختیار دل کی گہرائیوں میں سے ابھر آتا ہے۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے است سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے، کیوں کہ اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے، جب تک وہ طاری نہ ہو، اس طرح کی صدا اٹھ نہیں سکتی۔ خواجہ حالی مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس شعر پر گھنٹوں مجھے خود فراموشی رہی۔"

(ایضاً: ص ۹۴۔۹۵)

اس داستانِ حسن و عشق کا اختتام بھی کتنا حسرت انگیز اور افسردہ کر دینے والا ہے۔

ابوالکلام لکھتے ہیں:

”افسوس! اب وہ وقت آگیا کہ ان تذکروں کے لیے بھی کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ کہاں جائیے اور کس سے باتیں کیجیے، جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہو گئے۔ ہاں الحمد للہ ایک آپ کی ذات گرامی باقی ہے، لیکن یک جائی میسر نہیں:

سراغ یک نگاہِ آشنا در کس نمی یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور می ماند

بدایونی نے ایک رباعی لکھی ہے، معلوم نہیں کس کی ہے! اکثر زبان پر جاری ہو جاتی ہے:

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند
در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر
یک لحظہ زما پیشترک مست شدند

اب تھک گیا ہوں اور تکیے پر سر رکھتا ہوں۔“ (کاروانِ خیال، ص۹۶۔۹۰)

حضرت نواب صاحب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (ولادت ۵/جنوری ۱۸۶۷ء) اس دور میں جب کہ ان کی عمر ۷۳ برس سے زیادہ ہو چکی تھی، ایک حد تک گوشہ نشین ہو چکے تھے، زندگی کا کوئی شوق باقی نہ رہا تھا۔ زندگی کے معمولات عبادات، اور وظائف اور مطالعۂ کتب تک محدود ہو گئے تھے، مجلس آرائیاں اور علمی صحبتیں معدوم تھیں، کوئی ہم ذوق و آشنا نہ تھا۔ پچھلی صحبتوں کو یاد کرتے اور ہر دم دم سرد بھرتے تھے کہ ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے، لیکن کوئی حاتم نہ ملتا تھا کہ گزرے ہوئے دنوں اور ان کی صحبتوں میں لے جائے اور کوئی ہم ذوق و آشنا ایسا نہ تھا جس کے ساتھ دو گھڑی بیٹھ کر ایامِ گذشتہ کی یاد تازہ کر لی جائے۔ عبادات اور اوراد و وظائف سے جو وقت ملتا تھا، وہ مطالعۂ کتب میں گزرتا تھا۔

ابوالکلام سے ہم ذوقی و مزاج آشنائی کا رشتہ تھا۔ وہ کبھی کوئی تذکرہ چھیڑ دیتے تو پھر اسی محبت زار ذوق و تہذیب میں پہنچ جاتے جو کبھی مایۂ تسکین جاں اور موجب راحت قلب تھا۔ گزری ہوئی صحبتوں کی یاد میں وقت کے کچھ لمحے گزر جاتے۔ کبھی وہ خود بھی ابوالکلام کو مخاطب کر کے گزری ہوئی صحبتوں کا کوئی ذکر چھیڑ دیتے۔ وہ خود بھی اسی ذوق سے سرشار تھے۔ اسی ذوق و

تہذیب کے دل دادہ، شبلی کے کمال آشنا، ان کی فضیلتوں کے معترف، ان کے قدر داں، ان کے ہم ذوق، ان کی محبت کے اسیر، ان کے ساتھ گزری صحبتوں کو یاد کرنے والے اور انھی کی یاد میں قلب کا سکون ڈھونڈنے والے تھے۔ بعض اوقات ان تذکار کا سامان خود ہی فراہم کرتے تھے۔ ان میں کسی نہ کسی پہلو سے حضرت شبلی کا ذکر آ ہی جاتا تھا۔ کاروانِ خیال (مجموعۂ خطوط حضرت شروانی و آزاد) میں حضرت شروانی مرحوم کے جو مکاتیب سامی شامل ہیں ان میں اسی ذوق کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور اکثر وہی گذشتہ صحبتوں کے تذکار کا موجب ہوئے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں ایک مکتوب گرامی کا حوالہ آ چکا ہے۔ حضرت مرحوم کی ایک اور تحریر کے لطف مطالعہ میں قارئین کرام کو شریک کرلینا چاہتا ہوں۔ یہ مکتوب سامی ابوالکلام کے ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۰ء کے خط کے جواب میں ہے۔ حضرت مکتوب نگار کے قلم زریں رقم سے اس پر تاریخ کا داغ نظر نہیں آیا۔ اس لیے کہ یہ حکایتِ لطیف اپنے بیان کے لطف و اثر کے لیے کسی خاص موسم یا ''فصلِ گل و لالہ'' کی محتاج نہیں۔ حضرت شروانی فرماتے ہیں:

> ''آپ نے جتنے واقعے یاد کیے ہیں، یاد دلائے ہیں، سب کی مدت دہائیوں سے زیادہ ہے۔ مگر خط پڑھنے میں دل ان کی گرمی اس طرح محسوس کرتا ہے، گویا اسی صحبت میں ہے۔ بات میں بات دلی کے جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یاد شوق میں تازہ ہے۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ، گویا دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں، حال آں کہ تیس برس گزر گئے۔ (۳) سید رشید رضا کی تقریر کا اردو ترجمہ آپ سنا رہے ہیں، کان سن رہے ہیں۔ اسی مثال سے متاثر ہو کر میں نے اسٹریچی ہال میں (ان کی) عربی کی اردو کر دی تھی۔ (۴)
>
> مولانا شبلی پر خدا کی رحمت! اب ان کی یاد جان آفریں ہے۔ دار المصنفین میں تو گویا تجدید بیعت ہو جاتی تھی:
>
> دماغ دل دریں جا گاہ گاہے چاق می گردد
> خدا آباد تر سازد خراباتِ محبت را!
>
> جس زمانے میں آگرہ میں پڑھتا تھا، نصف صدی گزر چکی ہے۔ فیضی کی ایک غزل پڑھی تھی۔ اس کا ایک شعر اب تک وردِ دل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی بار

اور کتنے موقعوں پر تسلی بخش ہوا ہے:

اے ہم نفسانِ صحبتِ ما
رفتید و لے نہ از دلِ ما!

مجلس احباب دل میں گرم ہے۔ وطن میں اس کی گرمی ہے۔

ز چشمِ تو مستم شراب را چہ کنم
ز تابِ حسنِ تو سوزم کباب را چہ کنم!

دیکھیے اس ہفتے میں مولانا (شبلی) کی یاد کس کس طرح تازہ ہوئی: آپ کے الطاف نامے سے، مولوی سید سلیمان کے خط سے، ایک جلد سوانح شبلی کی ختم ہوئی۔ ایک نادر نسخہ رباعیات سحابی نجفی کا ہاتھ آیا، مولانا (شبلی) کا نسخہ یاد آیا۔ ندوہ سے اس کی بابت خط و کتابت کی۔"

(کاروانِ خیال، ترتیب و تنقید عبد الشاہد خاں شروانی، بجنور، مدینہ پریس، ۱۹۴۶ء، ص ۶۶، ۶۷)

اب غبارِ خاطر کا صرف ایک حوالہ درج کرنے سے رہ گیا۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ غبارِ خاطر میں حضرت علامہ شبلی کا کوئی ذکر یا ان کے کسی شعر کا حوالہ نہیں آیا۔ لیکن سوچا کہ ایک نظر ڈال لینے میں کیا حرج ہے؟ تلاش کیا تو پتا چلا کہ مکتوب نگار نے علامہ مرحوم کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ یہ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۲ء کا خط ہے۔ اس میں شکر کے مسئلے نے سر اٹھایا ہے۔ اسی خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کے شکر کھانے کے شوق اور مولانا آزاد کے استعمال میں آنے والی قند کی لذت سے عدم آشنائی کا ذکر آیا ہے۔ یہ مولانا کا بہت دلچسپ خط ہے۔ مختلف اقوام و ممالک میں چائے بنانے کی تراکیب، چائے میں دودھ کے استعمال کی بدذوقی اور شکر کی غلظت اور مصری کی نظافت و لذت کا ذکر بھی آیا ہے۔ اسی سلسلے میں مولانا کے شیرینی کے عدم ذوق کا تذکرہ بھی ہے اور اصحاب قصص و مواعظ کی ایک خانہ ساز روایت پر بحث میں ایک عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کسی حدیث کے تذکرے نے (۵) یارانِ قصص و مواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاد دلا دی کہ **الایمان حلو و المومن یحب الحلوی** (۶) لیکن اگر مدارج ایمانی کے حصول اور مراتب ایمانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا تو نہیں معلوم، ان تہی دستانِ نقدِ حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے، جن کی محبت حلاوت کی ساری پونجی

چائے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی، اور ان میں بھی کم شکر پڑی ہوئی اور پھر اس کم شکر پر بھی تاسف کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ ہا! مولانا شبلی مرحوم کا بہترین شعر یاد آ گیا:

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم!

(غبار خاطر: دہلی، ۱۹۶۷ء (تیسری بار)، ص ۱۵۶)

حواشی

۱۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا۔ (ا۔س۔ش)

۲۔ حضرت نواب صاحب نے اپنے پچھلے مکتوب میں اپنی ایک غزل کا ذکر لطیف فرمایا تھا جو انھوں نے خواجہ آصفی کی ایک غزل کی طرح میں کہی تھی اور علامہ شبلی کے ملاحظے میں بھیجی تھی۔ حضرت شبلی نے خدا کو گواہ کر کے کہا کہ غزل کی غزل مرصع ہے اور اس شعر کے بارے میں تو فرمایا کہ دل میں رکھ لینے کا ہے:

ندیدہ صورت شوخ و باختم دل و دیں
اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

یہ اظہار حضرت نواب صاحب نے مولانا ابوالکلام کے نام اپنے مکتوب میں کیا تھا اور اس غزل کے چند شعر بھی نقل کیے تھے۔ مولانا ابوالکلام نے بھی اس کی تعریف کی کہ کلام کے حسن اور خیال کی بلندی اور زبان کی لطافت کا تقاضا تھا۔ مولانا کا اشارہ اسی طرف ہے۔ حضرت نواب صاحب نے مکتوب بنام ابوالکلام میں تحریر فرمایا تھا:

> ''آپ کی دعا کی صراحی اور شب نوشی کی بات یاد آئی۔ مجھ کو خود اپنی طبیعت کی صراحی اور مطالعہ نے بے تاب کر دیا۔ کیا کہوں کیا عالم تھا اور کس کے اثر سے تھا؟ اجمالاً اس عالم کی شرح نگار ایک غزل ہے جو اسی کیفیت میں موزوں ہوئی تھی:
>
> ز جام لعل تو مستم شراب را چہ کنم
> خوشم بہ سوز دل خود کباب را چہ کنم
>
> یہ مطلع خواجہ آصفی کا ہے۔ اسی طرح پہ میں نے غزل عرض کی تھی:

ز چشم مست تو مستم شراب را چہ کنم
ز تاب حسن تو سوزم کباب را چہ کنم
حدیث دوست بہ گوشم رسد ز پردۂ دل
حکایت نے و صوت رباب را چہ کنم
نہ کردہ جلوہ بت شوخ و باختم دل و دیں
اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

حسب عادت غزل علامہ شبلی مرحوم کے ملاحظے میں پیش کی گئی۔ حیدرآباد سے ۱۹؍ دسمبر ۱۹۰۱ء کو تحریر فرمایا: خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے: "اگر برافگند از رخ" دیکھیے ۳۲ اور ۴۰ برس کے گزرے ہوئے دو واقعے کس طرح متحد ہو گئے! یہ خلوص ذوقی کا کرشمہ ہے۔

آپ کو بہت سے اہل کمال یاد آئے تھے، مجھ کو ایک علامہ کی یاد نے محو ذوق بنا دیا

ولیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

"رحمت باد بر شبلی و نعمت بر آزاد"

(کاروانِ خیال: مکتوب بنام آزاد، مورخہ ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۴۰ء، ص ۸۵_۸۳)

۳۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوے کا سالانہ جلسہ دہلی میں تھا۔ اس کی روداد ابوالکلام کے قلم سے یادگار ہے جو الندوہ، اپریل ۱۹۱۰ء میں چھپی ہے۔ اس میں انھوں نے دوسروں کی تقریروں اور ان کے خیالات کا حوالہ دیا ہے، اپنی تقریر کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت شروانی کے حافظے میں اس کی یاد تھی۔ انھوں نے ایک تاریخی واقعہ ہی یاد نہیں دلایا، اس کی پوری منظر کشی کر دی۔ حضرت سید صاحب نے بھی مولانا کی پُر زور تقریر کی یاد دلائی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام نے بھی اس اجلاس میں بہت پُر زور تقریر کی تھی، جس کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب تک ہے۔" (حیاتِ شبلی، ص ۴۹۹)

۴۔ ۱۹۱۲ء میں علامہ رشید رضا مصری ندوے کے سالانہ جلسہ لکھنؤ کے صدر تھے۔ ابوالکلام نے ان کی تقریر کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ اسی سفر کے موقع پر علامہ رشید رضا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ تشریف لائے تھے اور آپ نے اساتذہ و طلبہ سے خطاب کیا تھا۔ اس خطاب کا اردو ترجمہ کر کے حضرت شروانی نے علامہ موصوف کی عزت افزائی کی تھی۔

۵۔ اخی یوسف اصبح و انا املح منہ کی طرف اشارہ ہے۔ راقم کی تحقیق کے مطابق یہ حدیث کسی معتبر مجموعۂ حدیث میں نہیں ملی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے "الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ اس موضوع کا یہ ترجمہ غبار خاطر کے حاشیے میں ہے: یعنی ایمان مٹھاس ہے اور جو مومن ہے وہ مٹھاس کو محبوب رکھے گا۔

النّدوہ

نمبر [illegible] | ماه ذی الحجہ [illegible] ھ مطابق ماه فروری [illegible] ع | جلد [illegible]

مجلس ندوۃ العلما کا ماہوار علمی رسالہ

جس کا مقصد

علوم اسلامیہ کا احیا اور تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہے

مرتبہ

شمس العلما مولوی شبلی نعمانی و مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible] مولوی عبدالحق صاحب [illegible]

آسی پریس لکھنؤ میں بکمال حسن و خوبی طبع ہو کر

دفتر ندوۃ العلما لکھنؤ سے شائع ہوا

دستور العمل

۱۔ یہ رسالہ ہر عربی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع کیا جائے گا۔

۲۔ اس رسالہ کی ضخامت معمولاً [illegible] صفحے ہوگی۔

۳۔ اس رسالہ کا مقصد عموماً مذاق علمی کا پھیلانا، علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ ہوگا۔ اسکے ساتھ حسب ذیل مضامین بھی ہونگے۔

۱۔ عربی زبان کی نادر الوجود کتابوں پر تقریظ و تنقید۔

۲۔ ممالک اسلامیہ میں آجکل جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں ان پر تقریظ۔

۳۔ اکابر سلف کی سوانح عمریاں۔ جس میں زیادہ تر انکے اجتہادات سے بحث ہوگی۔

۴۔ نصاب تعلیم موجودہ پر بحث۔

۵۔ ندوۃ العلما کے متعلق حالات۔

۶۔ علمی خبریں۔

۴۔ چونکہ دقیق مضامین سے عام لوگوں کو دلچسپی نہیں ہو سکتی اسلیے ہر پرچہ میں ایک دو ادبی مضامین و رباعی یا نظم بھی درج ہوں گے۔

۵۔ اس رسالہ کی قیمت مع محصول دو روپیہ سالانہ ہوگی۔ نمونہ کا پرچہ [illegible] وصول ہونے پر روانہ کیا جائے گا۔

۶۔ کل خط و کتابت بنام منیجر رسالہ الندوہ دفتر ندوۃ العلما لکھنؤ کے پتے کی جائے روپیہ بھی اسی پتہ سے بھیجا جائے۔

۷۔ جن صاحبوں کے پاس کسی مہینے میں رسالہ نہ پہنچے تو اسی مہینے میں اطلاع دینی چاہیے۔ ورنہ انھیں نہ مل سکے گا۔

۸۔ جو صاحب خط لکھیں یا مضامین وغیرہ خوشخط میں لکھیں اور رسید کا نمبر بھی ضرور درج کریں۔

سید عبد الحی

منیجر رسالہ

مضامین الندوہ

(۱۹۰۵ـ۱۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

مضامین الندوہ (۱۹۰۵ـ۱۰ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

۱۔ المرأۃ المسلمہ (۱) ۱۵۱
المرأۃ المسلمہ (۲) ۱۶۹
المرأۃ المسلمہ (۳) ۱۹۱
۲۔ علمی خبریں (۱) ۲۱۳
علمی خبریں (۲) ۲۱۸
علمی خبریں (۳) ۲۲۳
۳۔ ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت ۲۲۵
۴۔ القضاء فی الاسلام ۲۳۱
۵۔ یورپ میں گونگوں کی تعلیم ۲۴۱
۶۔ مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم و فنون اور یورپ کی سرپرستی ۲۵۳
۷۔ ندوۃ العلماء کا اجلاسِ دہلی اور قوم کی شاہراہِ مقصود ۲۶۵

اَلمراۃُ المُسلمَہ (۱)

(۱)

تعلیم اور خیالات کے اختلاف نے آج کل ہندوستان میں دو گروہ پیدا کر دیے ہیں۔ قدیم تعلیم کی یادگار اور نئی تعلیم کا تربیت یافتہ! تقریباً جو حال مصر کا ہے۔ نئے اور پرانے گروہ میں جو حد فاصل یہاں نظر آتی ہے وہاں بھی قائم ہے! لیکن اس مماثلت کے ساتھ بڑا فرق یہ ہے کہ یہاں نئی تعلیم نے ذریعہ ملازمت ہونے کے ساتھ اور کوئی فائدہ قوم اور لٹریچر کو نہیں پہنچایا، لیکن مصر میں نئی تعلیم نے ذریعۂ ملازمت ہونے کے ساتھ نسبتاً عمدہ نتائج پیدا کیے ہیں، نئے گروہ میں علمی مذاق پیدا ہو چلا ہے، جو تصنیفات آج عربی لٹریچر کا مایۂ ناز سمجھی جاتی ہیں تقریباً تمام تر نئے گروہ کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ گروہ اگرچہ ضروریاتِ زمانہ سے باخبر ہے اور یورپ کے قدم بہ قدم چلنا چاہتا ہے مگر چونکہ اپنی حالت کی بے خبری اور تعلیم کے نقص نے امتیازِ صحیح کا مادہ سلب کر لیا ہے، اس لیے اس امر کی قدرت نہیں رکھتا کہ حسن و قبح میں تمیز کر سکے۔ برخلاف اس کے مصر کا نیا گروہ یورپ کی ہر ادا کو شیفتگی کے ساتھ دیکھتا ہے مگر نقادانہ نظر (۲) بھی ڈالتا ہے، جو نئے مباحث یورپ کی تقلید نے پیدا کر دیے ہیں، وہ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پیش ہوتے رہتے ہیں، مگر موافقانہ یا مخالفانہ جو کچھ اس پر لکھا جاتا ہے وہ یہاں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مدلل ہوتا ہے۔

نئے مباحث میں ایک بڑی بحث عورتوں کی آزادی یا پردے کی ہے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی پچھلے دنوں یہ بحث چھڑ گئی۔ مصر کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے ایک ذی اثر ممبر مسٹر قاسم امین بک ہیں، جو کسی زمانے میں پردے کے بڑے مؤید تھے اور یورپ کی موجودہ آزادی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ فرنچ میں ایک رسالہ بھی پردۂ اسلامی کی تائید پر لکھا تھا، جس نے فرانس

میں کچھ دنوں کے لیے مل چل مچا دی تھی۔ لیکن پچھلے دنوں یکا یک ان کی رائے میں انقلاب ہوا اور یورپ کی آزادی کی جگہ پردے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ چوں کہ گذشتہ غلطی کا کفارہ ضروری تھا، اس لیے پردے کی مخالفت اور آزادیٔ نسواں کی ضرورت پر یکے بعد دیگرے دو رسالے لکھ کر شائع کیے، جن میں سے پہلے رسالے کا نام تحریر امرأۃ اور دوسرے کا نام امرأۃ الجدیدہ (۴) ہے۔ ان دو رسالوں نے اہل مصر کو نئے سرے سے اس مسئلے پر متوجہ کر دیا۔ قاسم امین بک کی تردید میں معمولی مضامین کے علاوہ پانچ رسالے علی الترتیب لکھے گئے، جن میں سے ایک رسالہ بیروت کے کسی عالم کی تصنیف ہے اور چار رسالے مصر کے تعلیم یافتہ اشخاص کے قلموں سے نکلے ہیں، انھی (۵) رسالوں میں ایک رسالہ المرأۃ المسلمہ بھی ہے جو مصر کے مشہور مصنف فرید وجدی کی تصنیف ہے، اس مضمون کے ذریعے اردو خواں پبلک کو اس کے قابل قدر مباحث سے واقف کرنا چاہتے ہیں، جس سے ایک طرف تو آزادیٔ نسواں کے مسئلے پر مفید روشنی پڑے گی اور دوسری طرف اس امر کا بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مصر کا نیا علمی مذاق، ہندوستان کے موجودہ مذاق (۶) سے کس درجے مختلف ہے؟ (۷)......

ہندوستان میں تقریباً بیس برس سے اس مسئلے پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے اور ایک خاص لٹریچر اسی موضوع پر تیار (۸) ہو گیا ہے، لیکن اس تمام دفتر کا یہ حال ہے کہ نئے گروہ نے جس قدر پردہ اور تقلید کی خرابیاں دکھلائی ہیں وہ خود نہیں دکھلائی ہیں بلکہ یورپ کے اثر میں محیط ہو کر دکھلائی ہیں۔ یورپ کے رعب نے اس طرح انھیں دم بخود کر دیا ہے کہ ایک لفظ بھی اس کی مخالفت میں نہیں کہہ سکتے، اس لیے وہ یورپ ہی کی آواز ہے جو ہیٹ کی جگہ طربوش سے چھپے ہوئے سروں سے نکلتی ہے۔ جن لوگوں نے پردے کی تائید میں رسالے لکھے ہیں، ان میں بڑی جماعت قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے۔ چوں کہ ان لوگوں کی نظروں سے یورپ کا حال پوشیدہ ہے، اس لیے جو کچھ لکھتے ہیں، مذہب کے بل پر لکھتے ہیں اور مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا جادو نئے گروہ پر کارگر نہیں ہو سکتا۔

فرید وجدی چوں کہ یورپ کی متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے اور خود تعلیم یافتہ سوسائٹی (۹) کا ایک فاضل ممبر ہے، اس لیے اس نے جو کچھ لکھا ہے محض یورپ کے اقوال و حالات کو پیش نظر رکھ کے لکھا ہے۔ اسی بنا پر ظاہر ہے کہ المرأۃ المسلمہ جس قدر نئے گروہ پر اثر ڈال سکتی

ہے ہمارے یہاں کی مذہبی تحریروں سے اس قدر توقع نہیں ہو سکتی؟

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ درحقیقت ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ یورپ کا طرز عمل اگرچہ اس کی تائید میں ہے، لیکن جمہور کی آواز نہایت سختی سے اس کی مخالف ہے۔ ایک بڑی باریک بیں جماعت موجود ہے جو اس آزادی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس خطرناک زمانے کی یقین کے ساتھ منتظر ہے جب اس آزادی کا لازمی نتیجہ تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل کر دے گا۔ ہمارے یہاں کے مخالفین پردہ، یورپ کے طرز عمل کو تو شوق کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں لیکن چوں کہ نظریں کوتاہ اور معلومات محدود ہیں اس لیے مخالف جماعت کی رایوں سے واقفیت نہیں رکھتے۔ پردے کے مویدین یورپ کی زبانوں اور حالات سے محض بے خبر ہیں، اس لیے ان کی رائے بھی اس میدان میں سبقت نہیں لے جا سکتی۔ فرید وجدی چوں کہ یورپ کے اقوال وحالات پر وسیع نظر رکھتا ہے، اس لیے اس نے اول ان تمام لوگوں کی رائیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ (۱۰) کر جمع کی ہیں اور دکھلایا ہے کہ جس ملک کے طرز عمل پر فریفتہ ہو کر مصلحت اور تمدنی فواید سے چشم پوشی کرتے ہو، خود اس ملک کے اہل الرائے اور موجودہ مدنیت کے مجدد اس طرز عمل کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ پھر مشاہیر علماے یورپ کے خیالات پیش کر کے ہمدردانہ لہجے میں نصیحت کی ہے کہ محض ظاہری آزادی کے کرشمے پر بے خود نہ ہو جاؤ، کیوں کہ جن نتائج کی بنا پر آزادی کا شور مچاتے ہو، وہ خیر سے یورپ میں بھی مفقود ہیں۔

(۱).....

اس سرسری رائے کے بعد اب ہم المرأۃ المسلمہ کے اہم مباحث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

عورتوں کی آزادی کی حمایت میں اس وقت تک جس قدر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے، اس میں اہم اور قابل بحث صرف تین مسئلے ہیں، ان کے علاوہ اور جتنی باتیں پیش کی جاتی ہیں وہ دراصل انھی تین مسئلوں کی شرح وتفسیر میں داخل ہیں۔

۱۔ الف۔ انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس فطری آزادی میں کوئی خصوصیت ثابت نہیں ہوتی۔ پھر وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر انسانوں کا ایک گروہ اس آزادی سے فایدہ اٹھائے اور دوسرا گروہ محروم رکھا جائے؟

ب۔ جب انسانی قویٰ کی عقلی نشو ونما تمدنی اور شایستہ زندگی کے لیے ضروری ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عورتیں اس عقلی نشو ونما سے محروم رکھی جائیں؟ مردوں نے علوم وفنون، انتظام سیاست اور دنیا کے تمدنی مشاغل اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں اور عورتیں اس دنیا سے بالکل الگ رکھی جاتی ہیں۔ اول تو انھیں تعلیم دی ہی نہیں جاتی اور اگر کسی کا نرم دل زنان (۱۴) کے مظلومانہ حال پر متاسف ہوتا بھی ہے تو صرف معمولی تعلیم ان کے لیے کافی خیال کی جاتی ہے۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں، کیا ان میں دماغی قوتیں موجود نہیں ہیں؟! اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا یہ صریح ظلم نہیں ہے کہ علمی دنیا کے شایستہ مشاغل سے انھیں یک لخت محروم کر دیا جائے؟

۲۔ اس وقت تک عورتیں علمی نعمت سے محض نا آشنا ہیں اور یہ تمام تمدنی میدان کل کا کل مردوں کے قبضے میں رہا۔ اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں مردوں کی طرح دماغی ترقی کی صلاحیت نہیں ہے کیوں کہ اس وقت تک انھیں ترقی کا موقع ہی کب دیا گیا؟ یورپ نے (۱۳) آج علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات سے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت دماغی قوتوں میں بالکل برابر ہیں اور ثبوت کے ساتھ انھیں عام آزادی بھی دے دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جسے مردوں کی طرح مغربی عورتیں انجام نہ دیتی ہوں۔ ڈاکٹر عورتیں ہیں، پروفیسر عورتیں ہیں، مصنف عورتیں ہیں (۱۴) اور لیکچرار عورتیں ہیں، غرض کہ ہر میدان میں مردوں کے برابر ترقی کر رہی ہیں۔ یہ نظیر بھی بتا رہی ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کے تسلط سے نجات ملے اور اعلیٰ تعلیم سے مردوں کی طرح فائدہ اٹھائیں تو وہ کسی چیز میں مردوں سے کم رتبہ ثابت نہیں ہو سکتیں۔

۳۔ مشرق نے جو ظالمانہ رائے عورتوں کے متعلق قرونِ جاہلیت (۱۵) میں قائم کی تھی، اس وقت تک اسی پر قائم ہے۔ مسلمان عام طور پر عورتوں کو ناقص العقل والدین اور فتنہ وفساد کی جڑ سمجھتے ہیں، برخلاف اس کے یورپ عورتوں کی غیر معمولی عزت اور احترام کرتا ہے اور مردوں سے کسی امر میں کم نہیں سمجھتا۔

یہ تین باتیں وہ ہیں جو آج مصر وہندوستان میں پردے کا ہر مخالف زور وشور سے پیش کرتا ہے اور ان کی تشریح وتفسیر میں عجیب عجیب نکتہ آفرینیاں کی جاتی ہیں۔ اس لیے فرید وجدی نے المرأۃ المسلمہ میں انھی (۱۶) تین مسئلوں کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کے متعدد ٹکڑے کر کے تیرہ

فصلوں میں الگ الگ بحث کی ہے۔ ان فصلوں میں اہم مباحث یہ ہیں:

۱۔ عورت کیا ہے؟

۲۔ عورت کا طبعی وظیفہ کیا ہے؟ (۱۷)

۳۔ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟

۴۔ کیا عورتیں عملی دنیا میں مردوں کے ساتھ شریک ہو سکتی ہیں؟

۵۔ کیا عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہیے؟

۶۔ کیا پردہ عورتوں کے لیے غلامی کی علامت ہے؟ اور کیا آزادی کا منافی ہے؟

۷۔ کیا پردہ عورتوں کی ترقی وکمال کا مانع ہے؟

۸۔ کیا پردے کا عام اثر زنا ہی ہو سکتا ہے؟

۹۔ کیا موجودہ مادی مدنیت کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟ (۱۸)

آخر میں بحث کی ہے کہ تعلیم نسواں کا بہترین طریقہ کیا ہے، لیکن یہ مسئلہ ہماری بحث کے دائرے سے باہر ہے، اس لیے اس کو کسی دوسرے مضمون کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اب ہم فرداً فرداً ان چاروں مسئلوں پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ المراۃ المسلمۃ نے ان پر کس طرح بحث کی ہے، کیا کیا دلائل پیش کیے ہیں، کن کن لوگوں کی رایوں سے استشہاد کیا ہے اور اپنے حریف کے مقابلے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟ (۱۹)

پہلا مسئلہ (۲۰)

قدرت نے مخلوقات کو مختلف جنسوں اور مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر گروہ کے خاص خاص فرائض اور خاص خاص وظائف قرار دیے ہیں۔ ان تمام فرائض کی بجا آوری کے لیے چوں کہ ایک ہی قسم کی جسمانی حالت اور دماغی قابلیت کافی نہ تھی، اس لیے جس گروہ کے متعلق جو کام کیا گیا اسی کے موافق اس کو دماغی اور جسمانی قابلیت عطا کی گئی۔ فرائض کے اختلاف کے ساتھ ضروریات زندگی کا بھی مختلف ہونا ضروری تھا، اس لیے ہر گروہ کو اسی قسم کے داخلی اور خارجی اعضا دیے گئے، جس قسم کی ضرورتیں اس کو پیش آتی ہیں۔ عام حیوانات پر نظر ڈالو! اونٹ کی غذا جنگل کی خودرو گھانس (۲۱) ہے اس لیے اس کو ویسی ہی زبان اور اسی قسم کے دانت بخشے گئے، جو

ان تیز و سخت شاخوں کو آسانی سے چبا سکتے ہیں اور ان کی سختی کے متحمل ہونے کی طاقت رکھتے ہیں۔ شیر کی غذا دوسرے زندہ حیوان ہیں، اس لیے اس کے پنجے نہایت تیز، سخت اور ایسے خاردار بنائے گئے، جن کا ایک ہی وار بھیڑ اور بکری کی ہلاکت کا باعث ہو سکتا ہے۔ انھی فرایض کی انجام دہی کا مجموعی نام تمدن یا نظام عالم ہے۔ جب کوئی گروہ اپنے طبعی فرایض کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے تو فوراً نظام تمدن (۲۲) کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔

(۲۳)......

بے شک انسان فطرتاً آزاد ہے اور یہ آزادی اس کے ہر ارادی اور غیر ارادی فعل سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ انسان کا اپنے حقیقی فرایض کو ادا کرنا نظام تمدن کا اصلی عنصر ہے۔ انسان ان مختلف قوتوں کے مجموعے کا نام ہے، جن میں بعض قوتیں اگر صفات حسنہ کی طرف آمادہ کرتی ہیں تو بعض قوتیں برائیوں کے لیے ترغیب دیتی ہیں، اس میں سیکڑوں خواہشیں (۲۴) اس قسم کی موجود ہیں جن کے اثرات میں محیط ہو کر وہ عقل و تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ تعلیم اور سوسایٹی کا خارجی اثر بسا اوقات ان طبعی قوتوں کے اثرات کو قوی اور تیز کر کے اس طرح اس پر اپنا تسلط قایم کر لیتا ہے کہ جمادات و نباتات کی طرح مجبور محض ہو کر انھی کے اشاروں پر چلتا ہے اور انھی کی تحریک پر ہر کام کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نہ اسے اپنے فرایض یاد رہتے ہیں، نہ دوسرے کے فرایض کی کچھ پروا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تسلط سے نکلنے کے لیے نہ علم و فضل کام آ سکتا ہے، نہ فلسفہ و عقلیات کی تعلیم کچھ مدد کر سکتی ہے، اس لیے تمدن اور مذہب نے انسان کی فطری آزادی کو ایک خاص حد تک مقید کر دیا ہے۔ ہر گروہ کے طبعی فرایض تشخیص کیے ہیں، اور انھی فرایض کے میدان میں اسے محدود کر دیا ہے۔ ان فرایض کے لحاظ سے جس درجے تک (۲۵) آزادی حاصل کرنے کا وہ مستحق ہے، اسے بخشی ہے اور جو آزادی اس کے فرایض میں خلل انداز ہوتی ہے، اسے قطعی جرم قرار دیا ہے۔ اب اس اصول کو ذہن نشین کر کے عورتوں کی حالت پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ ان کے طبعی فرایض کیا ہیں؟ ان فرایض کے لحاظ سے وہ کس آزادی کی مستحق ہیں؟ اور کون سی آزادی ان کو فرایض منصبی سے باز رکھ سکتی ہے؟

فرید وجدی نے اس اصول کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ اس نے سب سے پہلے عورتوں کے طبعی فرایض پر بحث کی ہے اور نہایت دل نشین عبارت میں ان کی مکمل تصویر پیش کر کے مخالفین

سے سوال کیا ہے کہ کیا عورتوں کے یہ طبعی فرائض اس امر کے مقتضی ہیں کہ ان کو دنیا کی علمی اور تمدنی کشمکش میں شریک کیا جائے یا اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس دنیا سے (انھیں) الگ رکھ کر اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں منہمک رہیں؟ (۲۶)

وہ لکھتا ہے کہ:

> ”عورت کو قدرت نے دنیا میں جس غرض سے تخلیق کیا ہے وہ غرض نوع انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت و تربیت ہے۔ پس اس حیثیت سے اس کا طبعی فرض یہ ہے کہ اس اہم فرض کی انجام دہی کی ہمیشہ کوشش کرتی رہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لیے جن اعضا اور اعضا میں جس تناسب کی ضرورت تھی، قدرت نے اس سے اسے ممتاز کیا ہے۔ (۲۷) جس طرح مردوں کی طاقت سے یہ بات (۲۸) بالکل باہر ہے کہ وہ عورت کے طبعی فرائض میں حصہ لیں، اسی طرح عورت کی طاقت سے (بھی) یہ امر باہر ہے کہ وہ مردوں کے علمی و تمدنی مشاغل میں شریک ہو۔“ (۲۹)

پھر دوسری فصل میں عورتوں کے طبعی وظیفے پر تفصیلی بحث کی ہے۔ چناں چہ وہ لکھتا ہے: (۳۰)

> ”نوع انسانی کی تکثیر اور حفاظت کے لیے (جو عورت کا طبعی وظیفہ ہے) (۳۱) قدرت نے مسلسل چار دور قرار دیے ہیں: حمل، وضع، رضاعت، تربیت۔ ان میں سے ہر ایک دور کا زمانہ عورت کی زندگی کا نہایت اہم اور دشوار زمانہ ہوتا ہے اس کی حفاظت اور صحت کے لیے خاص خاص احتیاطوں اور علاجوں کی ضرورت پڑتی ہے جن میں اگر کسی قسم کی کمی کی جائے تو سخت خطروں اور شدید بیماریوں میں مبتلا ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ عالموں کی کچھ خصوصیت نہیں، جاہل (۳۲) سے جاہل شخص بھی اس امر کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، بشرطے کہ وہ متاہل اور صاحب اولاد ہو کہ ان چار زمانوں اور بالخصوص ابتدائی تین زمانوں میں عورت کی زندگی کو کن کن خوف ناک خطروں کا سامنا ہوتا ہے، کس طرح وہ بعض وقت اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتی ہے اور کس طرح ان مصیبتوں سے سخت مشکلوں کے بعد نجات

> پاتی ہے۔ علم طب کا بہت بڑا حصہ ان چار دوروں کے لوازم احتیاط اور قوانین صحت کے متعلق مختلف مباحث سے تعلق رکھتا ہے۔ قدیم و جدید زمانے کے سیکڑوں عالموں اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے اپنی عمریں صرف کر کے اس مسئلے کی مشکلات اور مصائب دور کرنے کے لیے کتابیں تصنیف کی ہیں، جن کے مطالعے سے ان چاروں دوروں کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی جہالت کا اصلی مبدا انھیں زمانوں کی بے احتیاطی ہے اور انسانی خوبیوں کا حقیقی سرچشمہ بھی انھیں زمانوں کی حفاظت ہے۔“

پھر فرداً فرداً چاروں دوروں پر بحث کی ہے اور حمل، وضع، رضاعت اور تربیت کی مشکلات دکھلائیں ہیں۔ چناں چہ لکھتا ہے: (۳۳)

> ”زمانۂ حمل جس کی مدت عام طور پر نو ماہ قرار دی گئی ہے، عورت کے لیے ایک ایسا نازک زمانہ ہوتا ہے جس میں وہ فرائض منزلی (۳۴) کے ادا کرنے کے بھی قابل نہیں ہوتی۔ اس کی ہر معمولی سے معمولی حرکت کا اثر نہ صرف خود (۳۵) اس کی ذات تک محدود رہتا ہے بلکہ اس میں وہ نازک اور ضعیف وجود بھی شامل ہوتا ہے جس کی حفاظت اور تربیت قدرت نے اس کے سپرد کی ہے۔ اس نو مہینے کے زمانے میں جنین پر مختلف دور طاری ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دور کے خاص آثار اور علامات ہیں اور ہر علامت کے زمانے میں خاص خاص احتیاطیں اور حفاظتیں ضروری ہیں۔
>
> زمانۂ حمل میں ان کی ہر حالت سے جنین اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے ضعف و قوت یا زندگی اور موت کا دارومدار محض ان کی احتیاط اور حفاظت پر ہوتا ہے۔
>
> اطبائے جدید و قدیم کا قول ہے کہ زمانۂ حمل میں عورت کو نہایت شدت کے ساتھ اپنے خیالات، مزاج اور افعال کی نگہ داشت کرنی چاہیے۔ ورنہ جس قسم کے حالات اس کو پیش آئیں گے جنین کی جسمانی اور دماغی حالت بھی اسی قسم کی ہوگی۔“

یورپ کے سیکڑوں تجربوں نے بھی اس قول کی تصدیق کی ہے۔ مختلف بچوں کے عادات و

اطوار، اور جسمانی قوت کے مبدا کا جب سراغ لگایا گیا تو زمانۂ حمل کے حالات ثابت ہوئے۔ فرانس میں خوبصورت والدین کا بچہ جب سیاہ رنگ اور حبشیوں کی سی صورت پر پیدا ہوا تو ڈاکٹروں کو اس اختلاف پر سخت حیرت ہوئی جو تحقیق سے ثابت ہوا کہ زمانۂ حمل میں ماں کی نشست کے سامنے میز پر ایک حبشی کا اسٹیچو رہا کرتا تھا، جس کی مشابہت اور رنگ کا اثر نگاہوں کے ذریعے دماغ میں پہنچا (۳۶) اور ذہن کو اس طرف غیر معمولی توجہ ہوگئی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ بچے کو والدین کی صورت سے کوئی تعلق نہیں (۳۷)، اسی حبشی کے ڈیل ڈول پر پیدا ہوا۔ (۳۸)

(۳۹) ..

> ”وضع حمل کا وقت، زمانۂ حمل سے زیادہ سخت اور صعب ہوتا ہے، جس میں عورت کی زندگی موت سے نہایت قریب ہو جاتی ہے، وضع کے بعد عورت نہایت سخت بیماری اور حقیقی ضعف میں مبتلا ہو جاتی ہے، جس کا اثر مدت تک زائل نہیں ہوتا اور صحت کے بعد عورت کی زندگی از سرِ نو شروع ہوتی ہے، اطبا نے نہایت ضخیم ضخیم کتابیں اس وقت کے قواعدِ صحت اور قوانینِ احتیاط پر تصنیف کی ہیں اور وہ علاج بتلائے ہیں جن سے ان مختلف اقسام کے بخاروں سے حفاظت ہو سکتی ہے جو بسا اوقات عورتوں کے لیے باعثِ موت ہو جاتے ہیں۔“

یہ وقت عورت کے لیے جس قدر نازک اور سخت ہے اس کا ہر مقابل شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ ہر سال دنیا میں ہزاروں جانیں صرف اس لیے ضائع ہو جاتی ہیں کہ قوانینِ طبیہ کے مطابق وضع حمل کے موقع پر احتیاط اور حفاظت نہیں کی گئی۔ (۴۰)

..... تیسرا دور ارضاع کا زمانہ (۴۱) ہے۔ یہ زمانہ اگرچہ ماں کے لیے اس درجہ سخت اور دشوار نہیں ہے جس قدر ابتدائی دو (۴۲) دور ہوتے ہیں، لیکن بچے کے لیے سب سے زیادہ خطرناک اور غیر معمولی توجہ کا محتاج ہوتا ہے، اس زمانے کی حفاظت کے لیے خاص قواعد و قوانین ہیں، جن کی تعمیل میں اگر کسی قسم کی کوتاہی ہوتی ہے تو بچہ کی جان یا تو خطرے میں پڑ جاتی ہے یا ہمیشہ کے لیے کوئی جسمانی اور دماغی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ ایام رضاعت میں ان کی احتیاط اور قواعد طبی پر عمل اس لیے ضروری ہے کہ جس قسم کی غذا اس کے استعمال میں آتی ہے اسی قسم کا اثر بچہ پر مرتب ہوتا ہے، اگر ماں گرم غذا (اعتدال اور قاعدے سے) زیادہ استعمال کرتی ہے تو اس کا مضر اثر جس

طرح خود ماں پر پڑتا ہے اسی طرح بچہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض بچے نہایت سخت بیماریوں میں اس لیے مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ایام رضاعت میں ماں بے احتیاطی سے بعض مولد امراض چیزوں کا استعمال کر لیتی ہے۔ ان کا مضر اثر دودھ کے ذریعے سے بچے تک پہنچتا ہے۔ اور مختلف امراض کا باعث ہوتا ہے۔

علاوہ اس کے بچے کی جسمانی شگفتگی اور دماغی صحت اس امر پر موقوف ہے کہ یوم ولادت سے آخر ایام رضاعت تک غذا میں، لباس میں اور حفاظت میں کسی قسم کی بے احتیاطی نہ کی جائے اور ایک لحظہ بھی بچے پر ایسا نہ گزرے کہ ماں اس کی حالت سے غافل ہو۔ ہمارے ملکوں میں ہزاروں بچے نشوونما پانے سے پہلے اس لیے دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں کہ ان کی مائیں ان ضروری قواعد سے ناواقف اور بے خبر ہوتی ہیں۔ (۴۳)

(۴۴)......

چوتھا دور، زمانہ تربیت ہے اور در حقیقت بہ لحاظ اہمیت کے اور بلحاظ ان اثرات کے جن پر انسانی زندگی کی تمام آیندہ خوبیاں اور برائیاں (۴۵) منحصر ہیں، پچھلے تینوں دوروں سے زیادہ نازک (۴۶) اور بہت زیادہ قابل توجہ ہے۔

بچہ جب عالم غیب سے یکا یک دنیا میں قدم رکھتا ہے تو ایک ایسے آئینہ کی طرح ہوتا ہے جس کی سطح بالکل صاف اور ہر قسم کے اثرات قبول کرنے پر آمادہ ہوتی ہے، نہ کسی کا عکس اس میں نظر آتا ہے اور نہ کسی کی تصویر اس پر منقش ہوتی ہے، ایسی حالت میں جس قسم کا عکس اس پر ڈالا جاتا ہے، ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔ اگر خوش نما نقش ونگار سے اس کی سطح مزین کی گئی تو ہمیشہ کے لیے وہ آئینہ خوبصورت ہو گیا، اگر بدقسمتی سے کسی ناواقف اور جاہل نے ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچ دیں تو ہمیشہ کے لیے بدنما ہو گیا۔ اس کی صاف اور شفاف سطح، سیاہ وسفید سے محض بے خبر ہوتی ہے اس لیے اس کو کسی رنگ کا قبول کرنے میں انکار نہیں ہوتا اور جس مصور کے ہاتھ قدرت نے اسے سپرد کر دیا ہے اس کی ہر رائے کے آگے سر تسلیم جھکا دیتی ہے۔

یہی حال اس تازہ وارد مسافر کا ہوتا ہے جس کے لیے دنیا اور دنیا کی ہر بات بالکل نئی ہوتی ہے۔ اس کے کان جس طرح فضائل انسانی سے ناآشنا ہوتے ہیں، اسی طرح رذائل انسانی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ رحم کیا چیز ہے اور ظلم کس کو کہتے ہیں؟ نہ اس کو اس کی خبر ہوتی ہے

کہ صبر انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور تعصب تمام برائیوں کا مخزن ہے۔ (۴۷) اس کا سادہ ذہن آئینے کی طرح ہر قسم کے نقش و نگار سے خالی، (۴۸) مگر ہر اثر کے قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی شفیق ماں اس کی فطری مصور ہوتی ہے جس کی توجہ اور تربیت یا تو اخلاقِ محاسن کا نقش اس کے دماغ پر نقش کالحجر کر دیتی ہے یا تمام رذائلِ انسانی کا عادی بنا کر، نہ صرف اس کی، بلکہ سوسائٹی کے ہر فرد کی زندگی ہمیشہ کے لیے تلخ کر دیتی ہے۔ اسی زمانے کے وہ اثرات انسان کی طبیعتِ ثانیہ ہو جاتے ہیں جن کو نہ اعلیٰ تعلیم کا اثر زائل کر سکتا ہے، نہ ساری عمر کی ”جہد و کوشش“ (۴۹) محو کر سکتی ہے۔ قوموں کی ترقی کا بڑا راز تاریخ بتلاتی ہے کہ قومی افراد کی یہی ابتدائی تربیت ہے جو انسان اپنی زندگی کے ابتدائی حصے میں صرف ماں کی کوشش اور توجہ سے حاصل کر سکتا ہے۔

> ”اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کا طبعی وظیفہ نوعِ انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت ہے اور اس بنا پر اس کا اصلی کمال یہ ہے کہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے ہمیشہ کوشش کرتی رہے، کیوں کہ قدرت نے ایسے اہم کام اس کے متعلق کر دیے ہیں، جن میں بے شمار دقتیں اور بے حساب دشواریاں ہیں اور بغیر پوری معروفیت اور توجہ کے انجام نہیں پا سکتے۔ پس جو شخص عورت کو اس کے طبعی وظیفے سے باہر قدم نکالنے کی ترغیب دیتا ہے، وہ نہ صرف خود قوانینِ قدرت کا مجرم بنتا ہے، بلکہ ایک بڑے گروہ کو قدرت کی خلاف ورزی پر آمادہ کر کے اپنے جرم میں شریک کرنا چاہتا ہے۔“

اس کے بعد آزادی کے ہوا خواہوں کو مخاطب کر کے سوال کیا ہے کہ:

> ”جس گروہ کے قدرت نے ایسے اہم فرائض قرار دیے ہیں، کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ دنیا کے عام علمی و تمدنی مشاغل میں شریک ہو؟ (۵۰)

اب سوال یہ ہے کہ جس گروہ کا طبعی وظیفہ (۵۱) ایسے اہم اور دشوار مرحلوں کا طے کرنا ہے، کیا وہ دنیا کی تمدنی کشمکش میں شریک ہو سکتا ہے؟ اور کیا اس قسم کی شرکت اس کے طبعی وظیفے میں حارج نہیں نہ ہو گی؟ فرض کرو کہ ایک عورت علم و تدبر کے اعلیٰ درجے تک ترقی کر کے کسی پارلیمنٹ کی ممبر یا کسی سیاسی گروہ کی ایک

رکن ہوگئی ہے، لیکن ساتھ ہی تاہل اور معاشرت کے طبعی نتائج نے اس کو زمانہ حمل کے صعوبات میں بھی مبتلا کر دیا ہے تو ایسی حالت میں، وہ اپنی پارٹی کی حمایت اور سیاسی مناقشات کے فیصل کی تدابیر پر غور کرے گی اور شب و روز اسی فکر میں سرگرم رہے گی یا ان تدابیر صحت اور قوانین احتیاط پر عمل کرے گی، جن کی تعمیل میں ذرا سی کمی اس کی، اور جنین کی ہلاکت کا باعث ہو جاتی ہے؟ اس کا قدرتی فرض تو یہ ہے کہ اس دور کا تمام زمانہ ان افکار اور افعال میں گزار دے جن کا اثر جنین کی جسمانی و دماغی ساخت کے لیے مفید ہو لیکن سیاسی ضرورتیں اس کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ پریشان کن دماغ اور نہایت تلخ و ناگوار افکار میں مبتلا ہو کر سخت بے چینی اور بے اطمینانی میں یہ زمانہ صرف کر دے، تو کیا ایسی حالت میں یہ شرکت اس کے قدرتی فرض میں خلل انداز نہ ہوگی اور کیا اس کی صحت کے لیے مضر نہ ہوگی؟ اس مثال پر کچھ موقوف نہیں، فرض کرو کہ ایک عورت نے قانونی تعلیم کو بدرجۂ کمال حاصل کر کے ایک کامیاب بیرسٹر کی صورت میں خود کو پبلک پر ظاہر کیا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی گود میں ایک ننھا سا وجود بھی اس کی توجہ اور محبت کے انتظار میں، اس کی صورت کو تک رہا ہے، ایسی حالت میں اس کا دن بھر کسی سخت جرم کی مدافعت میں دوران قانونی پہلوؤں کی تلاش میں جو اس کے موکل کے لیے مفید ہوں، مصروف رہنا اور شب بھر سندوں اور حوالوں کی جستجو میں، قانون کی ضخیم ضخیم کتابوں کی ورق گردانی میں منہمک رہنا کہ صبح کو مقدمے کی پیشی ہونے والی ہے، کیا اس کو ایام رضاعت کے نازک فرائض سے باز نہ رکھے گا؟ اور کیا اپنی پوری توجہ اور قوت کو جرم کی مدافعت کی کامیابی کے لیے صرف کر دینا اور اسی کی فکر و کوشش میں رہنا، اس کو بچے کی نگہداشت اور تربیت سے غافل رہنے پر مجبور نہیں کرے گا؟ عورت کے طبعی وظیفے کی ہدایت تو یہ ہے کہ وہ یوم ولادت سے لے کر آخر ایام طفولیت تک بچے کی ہر حرکت اور ہر فعل کی نگہداشت کرے، عمدہ خصائل کا اسے عادی بنائے، بری عادتوں سے محفوظ رکھے، لیکن اس بدقسمت بچے کا کیا حال ہوگا؟ جب اس کی "بیرسٹر ماں" عدالت میں فریق مخالف

> پر جرح کر رہی ہوگی اور اس کا شیر خوار بچہ اس کی توجہ اور تربیت کا منتظر جھولے میں پڑا ہوگا؟ یا اس بدنصیب بچے کی صحت اور زندگی کس حالت میں ہوگی جب وہ صالح اور مفید دودھ کا محتاج ہوگا اور اس کی مدبر اور پارلیمنٹ کی ممبر ماں لبرل پارٹی کی حمایت کے خیال میں رات دن مستغرق اور مختلف جدوجہد میں منہمک ہوگی؟ اور ناکامی کے انفعال و افسوس نے دودھ میں فساد پیدا کر کے بچے کی طبعی غذا کو اس کے لیے مضر اور خطرناک بنا دیا ہوگا؟ کیا یہ اور اس قسم کی اور ظاہر مثالیں اس امر کے سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ قدرت نے عورت کو مردوں کے مشاغل سے مختص (۵۳) الگ رکھا ہے؟ اور اس کا طبعی وظیفہ اس قدر مصروفیت طلب اور محتاج توجہ ہے کہ عورت کا مردوں کے ساتھ شریک ہونا بغیر اس کے محال ہے کہ وہ طبعی وظیفے کی ادائیگی سے بے خبر یا دست بردار ہو جائے؟''

حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے دنیا کے کاموں کے خود ہی دو حصے کر دیے ہیں: نوع انسانی کی حفاظت اور تکثیر اور انسانی ضروریات کا انتظام؛ پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا گیا، اس لیے اس کو اسی قسم کے: عضو اور اسی قسم کی جسمانی قوت دی گئی جو اس فرض کی انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا گیا، اس لیے اسی کے مطابق جسمی اور دماغی قوت (۵۳) عطا کی گئی، ان دونوں گروہوں کا الگ الگ کام دنیا کا مجموعی تمدن قائم رکھتا ہے اور جب اس اختلاف کے اٹھانے کی کوشش ہوتی ہے یا کوئی گروہ اپنے فرائض سے باہر قدم نکالتا ہے تو تمدن اور معاشرت کے انتظام میں خلل پڑ کر سیکڑوں دقتیں اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے عورت کے طبعی فرائض کا اقتضا اس خیال کا بالکل مخالف ہے کہ ان کو مردوں کے فرائض میں شریک کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں جہاں اس خیال کی تائید کی گئی اور عورتوں کو مردوں کے میدان میں قدم رکھنے کی اجازت دی گئی، وہاں بالکل کامیابی نہیں ہوئی اور معاشرت میں ہزاروں خرابیاں (۵۳) پیدا ہو گئیں۔ کیوں کہ یہ قدرت کا قانون ہے اور کوئی انسانی کوشش اس کے خلاف کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

> ''بس ہمارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہمیشہ کوشش کرتے رہیں کہ عورت اپنے طبعی فرائض کے میدان میں محدود رہے اور ان فرائض کو قدرت کی ہدایت

کے مطابق انجام دے اور اگر ہم دیکھیں کہ عورت اپنے طبعی فرائض سے دور ہو رہی ہے تو اس کو ایک تمدنی مرض سمجھیں اور اس کے علاج کے لیے جد و جہد کریں۔ کیوں کہ عورت فلسفہ و علوم کے ہزار مرحلے طے کر لے، مگر اپنے طبعی وظیفے سے غافل رہے تو غیر ممکن ہے کہ وہ علم و فضل اس کے لیے یا سوسائٹی کے لیے مفید ہو سکے۔" (۵۵)

ابوالکلام آزاد دہلوی
دارالعلوم ندوہ، لکھنؤ (۵۶)

حواشی

نوٹ: حواشی میں جہاں کہیں لفظ "کتاب" آیا ہے، اس سے مراد "المرأۃ المسلمہ" کا کتابی ایڈیشن ہے۔

۱۔ کتاب (مسلمان عورت) میں "المرأۃ المسلمہ" اور قسط کے اشارے "نمبر (۱)" کی جگہ عنوان "مقدمہ" نے لے لی ہے اور آغازِ تحریر سے پہلے یہ شعر درج ہے:

"دَر رہِ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرمِ راز
ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد!"

۲۔ "تفاوتِ نظر" کی جگہ کتاب میں "تفاوتِ نگاہ" نے لے لی ہے۔

۳۔ "رائے میں انقلاب ہوا" کتاب میں یہ جملہ "رائے میں انقلاب پیدا ہوا" بن گیا ہے۔

۴۔ "تحریر المرأۃ" کا ترجمہ اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ ناظرین اگر اس کے ملاحظے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو اس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ پردے کی مخالفت اور آزادی کی حمایت میں جو طریقِ استدلال اور طرزِ تحریر مصری مخالف پارٹی نے اختیار کیا ہے، وہ بہ نسبت ہندوستان کے کس قدر شدید اور مدلل ہے! (ابوالکلام)

۵۔ اس قسم کے تمام جملوں اور پورے سلسلۂ مضمون میں لفظ "انھیں" استعمال ہوا ہے جسے کتاب میں جا بجا مولانا آزاد نے "انھی" سے بدل دیا ہے۔ اس لیے مناسب نہ ہوگا کہ اس قسم کے جملوں پر حاشیہ لکھ کر ہر جگہ املا کی تصحیح یا تبدیلی کی صراحت کی جائے۔

۶۔ "موجودہ مذاق" سے کتاب میں لفظ "موجودہ" حذف کر دیا گیا ہے۔

۷۔ کتاب میں اس مقام پر "اہم خصوصیتیں" ذیلی عنوان کا اضافہ ہو گیا ہے۔

۸۔ اس سلسلۂ مضمون میں "تیار" کا املا "ط" سے آیا ہے اور جہاں کہیں بھی آیا ہے، اسے "ت" سے بدل دیا گیا ہے۔ کتابی ایڈیشن میں مولانا نے خود بدل دیا تھا اور اس کے بعد "تذکرہ" اور دیگر تحریرات پر نظرِ ثانی میں مولانا نے یہی... املا اختیار کر لیا تھا۔

۹۔ یہاں لفظ "سوسیٹی" تھا جس کا املا کتاب میں ہر جگہ "سوسائٹی" کر دیا تھا۔ اس سلسلۂ مضمون میں اسی طرح کر دیا گیا ہے۔

۱۰۔ کتاب میں "ڈھونڈھ ڈھونڈھ" کی نہ صرف تکرار کو دور کر دیا ہے بلکہ "ھ" کو تخفیف کر کے "ڈھونڈ" بنا دیا گیا ہے۔ "ڈھونڈھ" میں تخفیف "ہ" کی تبدیلی چوں کہ کتاب میں ہر جگہ تھی، اس لیے یہی املا اس پورے سلسلۂ مضمون میں اختیار کر لیا ہے۔

۱۱۔ کتاب میں اس مقام پر "اہم مباحث" کے عنوان سے سب ہیڈنگ کا اضافہ ہے۔

۱۲۔ "ان کے مطلوبہ مدعا" اس جملے میں "ان" ضمیر غائب جمع کو ضمیر واحد غائب "اس" بنا دیا گیا ہے۔

۱۳۔ جملہ "یورپ نے" کتاب میں حذف کر دیا ہے

۱۴۔ کتاب میں جملہ "مصنف عورتیں ہیں" حذف کر دیا ہے۔

۱۵۔ کتاب میں "زمانۂ جہالت" کو "زمانۂ جاہلیت" سے بدل دیا ہے۔

۱۶۔ کتاب میں یہاں "انجمن" ہے اور چوں کہ یہ تبدیلی عام ہے، اس لیے ایسے مواقع پر اس سلسلۂ مضمون میں اس اصلاح کو اختیار کر لیا ہے۔

۱۷۔ کتاب میں یہ جملہ اس طرح ہے: "عورت کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟" چوں کہ کتاب میں مولانا نے ہر جگہ "وظیفہ" کو "فرائض" سے بدل دیا ہے اس لیے سلسلۂ مضمون میں یہ تبدیلی اختیار کر لیا ہے۔

۱۸۔ کتاب میں نمبر ۹ کے بعد نمبر ۱۰ بھی ہے جس کی عبارت یہ ہے: "(۱۰) مسلمان عورتوں کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟"

۱۹۔ کتاب میں یہ پورا پیراگراف (آخر میں بحث ... تا ... کامیابی حاصل کی ہے) حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۰۔ رسالہ "الندوۃ" کا یہ عنوان (پہلا مسئلہ) کتاب میں ایک مکمل وضاحتی جملے "عورت کے قدرتی فرائض" سے بدل دیا گیا ہے۔

۲۱۔ کتاب میں "محاسن" کے ن کی تخفیف کے ساتھ "محاس" ہے۔

۲۲۔ اس جملے سے لفظ "فوراً" کتاب میں نکال دیا گیا ہے۔

۲۳۔ اس مقام پر کتاب میں یہ عبارت اضافہ ہے:

... بنیادیں طے کی گئی ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف کلام الٰہی نے ارشاد کیا ہے۔

ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقه ثم هدیٰ: ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کا مکمل وجود عطا فرمایا، پھر اسے اپنے فرائض بجالانے کی ہدایت کی۔

انا کل شیٔ خلقناه بقدر: ہم نے ہر چیز کو ایک اندازۂ خاص پر پیدا کیا ہے۔

نیچرل فلاسفی کا یہ قول خلاق عالم کے انہی ارشادات کی تفسیر ہے کہ "طبیعت اپنی حد سے کبھی نہیں بڑھتی" (مسلمان عورت، ص ۱۷)

۲۴۔ کتاب میں "سینکڑوں" بیچ کے "ن" مابعد "یا" کے اضافے کے ساتھ ہے۔ یہ یقیناً کاتب کی عادی غلطی ہے، جو کاتبوں اور عوام میں عام پھیلی ہوئی ہے۔

۲۵۔ "جس درجے تک" یہ جملہ کتاب میں "جس حد تک" کی صورت میں بدل گیا ہے۔

۲۶۔ یہ پیراگراف (از فرید وجدی نے ... تا ... میں منہمک رہتی ہیں) کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۲۷۔ کتاب میں یہ جملہ اس طرح ہے: "قدرت نے اسے عطا کیے ہیں۔" (المرأۃ المسلمۃ، ص ۱۳)

۲۸۔ کتاب میں "یہ بات" "مبدل بہ" "یہ امر" ہوئی ہے۔

۲۹۔ المرأۃ المسلمۃ، ص ۲۲

۳۰۔ کتاب میں یہ پوری سطر حذف کر دی گئی ہے۔

۳۱۔ بین القوسین وضاحتی جملے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اس لیے حذف کر دیا ہے۔

۳۲۔ کتاب میں "سے جانیں" حذف کر دیا ہے۔ محاورتاً ہونا چاہیے تھا۔ یقین ہے یہ کاتب کا سہو ہے لیکن غلط یہ بھی نہیں۔

۳۳۔ کتاب میں ان دونوں سطروں کو حذف کر دیا ہے۔

۳۴۔ "فرائض منزلی" کے جملے کو کتاب میں "گھر کے فرائض" لکھا گیا ہے۔

۳۵۔ لفظ "خود" کتاب میں تخفیف کر دیا گیا ہے۔

۳۶۔ "پہونچا" سے بننے والے افعال کے املا میں یکسانیت نہ تھی، اس لیے "و" کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اب یہ املا کتاب کے مطابق بھی ہو گیا ہے۔

۳۷۔ کتاب میں لفظ "نہیں" کی بجائے لفظ "نہ رہا" ہو گیا ہے۔

۳۸۔ التوضیح فی اصول التشریع مطبوعہ بیروت

۳۹۔ کتاب میں اس مقام پر "وضع حمل" کے ذیلی عنوان کا اضافہ ہے۔

۴۰۔ جملے کا آخری لفظ "گئی" کتاب میں لفظ "جاتی" سے بدل گیا ہے۔

۴۱۔ اس سطر کے آغاز پر کتاب میں "رضاعت" ذیلی عنوان کا اضافہ ہے، اور اس جملے میں "ارضاع کا زمانہ" کی جگہ کتاب میں "رضاعت کا زمانہ" بنا دیا گیا ہے۔

۴۲۔ کتاب میں "وہ" کی صراحت کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اس لیے لفظ "وہ" کو حذف کر دیا۔

۴۳۔ المرأۃ المسلمہ میں ۳۶ سے ۴۷ تک۔

۴۴۔ اس مقام پر کتاب میں "تربیت" ذیلی عنوان کا اضافہ ہے۔

۴۵۔ کتاب میں "خوبیاں اور برائیاں" کی جگہ صرف ایک لفظ "خوبیاں" استعمال ہوا ہے۔

۴۶۔ لفظ "نازک" کو کتاب میں لفظ "خطرناک" سے بدل دیا گیا ہے۔

۴۷۔ ان جملوں میں لفظ "صبر" اور "تعصب" کو لفظ "علم" اور "جہل" سے بدل دیا گیا ہے کتاب میں یہ عبارت اس طرح ہو گئی ہے: "علم انسانی خوبیوں کا سرچشمہ ہے اور جہل تمام برائیوں کا مخزن ہے۔"

۴۸۔ کتاب میں یہ جملہ "خالی" کے ساتھ فعل کا اضافہ کر کے "خالی ہوتا ہے" مکمل کر دیا گیا ہے۔

۴۹۔ "جد و کوشش" کی بجائے کتاب میں "جد و جہد و کوشش" ہے۔

۵۰۔ اوپر کا پورا پیراگراف (از "اس تمام تفصیل کا خلاصہ...... تا ..... مشاغل میں شریک ہو") کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۵۱۔ کتاب میں "طبعی وظیفہ" کو "قدرتی فرض" سے بدل دیا گیا ہے۔ اس بحث میں اور بھی کئی بار "طبعی وظیفہ" اصطلاح استعمال ہوئی ہے جسے کتاب میں "طبعی فرض" سے بدل دیا گیا ہے۔

۵۲۔ کتاب میں لفظ "مخفی" حذف کر دیا ہے۔

۵۳۔ کتاب میں "دماغی قوت" کی جگہ "دماغی طاقت" استعمال ہوا ہے۔

۵۴۔ کتاب میں "خرابیں" کی جگہ "خرابیاں" استعمال ہوا ہے۔

۵۵۔ اس مقام پر فرید وجدی کی کتاب پر مولانا ابوالکلام کے تبصرے کی پہلی قسط ختم ہو جاتی ہے لیکن مضمون جاری اور بحث مسلسل ہے۔

۵۶۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ، بابت ماہ نومبر ۱۹۰۵ء، ص: ۱۵ تا ۲۹

اَلمراۃُ المُسلمَہ

(۲)

عورتوں کی آزادی کے متعلق پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ

"انسان فطرۃً آزاد ہے پھر وہ کون سا معیار ہے جس کی بنا پر عورتیں اس آزادی سے محروم رکھی جاتی ہیں۔"

اس اعتراض میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عورتیں آزادی سے محروم ہیں، لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ کیوں کر؟ تو جواب میں دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ عورتوں کو تعلیم نہیں دی جاتی، دنیا کے عام تمدنی اور سیاسی مشاغل میں شریک نہیں کیا جاتا؛

۲۔ ان کو پردے میں قید کے ساتھ رکھا جاتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مردوں کی طرح آزاد نہیں ہیں!

قاسم امین بک نے بھی انہی دو دلیلوں پر زور دیا ہے اور مختلف واقعات پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ پردے میں عورتوں کو مقید رکھنا اور مردوں کی طرح عام تمدنی مشاغل میں شریک نہ ہونا، عورتوں کی غلامی اور فطری آزادی سے محرومی کا بین ثبوت ہے۔ (۱)

فرید وجدی نے اس کے جواب میں دور از کار بحثوں سے چشم پوشی کر کے صرف عورتوں کا طبعی وظیفہ پیش کر دیا ہے۔ جس کو تم پہلے حصے (۲) میں پڑھ آئے ہو۔ اس پر ایک نظر ڈالو اور غور کرو کہ کیا اس سے بہتر جواب ممکن ہے؟

پہلی دلیل کا جواب ظاہر ہے کہ جس گروہ کے طبعی فرائض ایسے اہم اور دشوار ہوں کیا وہ مردوں کی طرح عام تعلیم حاصل کر کے دنیا کی تمدنی اور سیاسی مشاغل میں شریک ہو سکتا ہے؟

عورتوں کو مردوں کے جبر نے ان مشاغل سے دور نہیں رکھا بلکہ خود فطرت نے مردوں کی دنیا سے عورتوں کو الگ کر دیا ہے، اس لیے اعتراض قدرت پر ہونا چاہیے نہ کہ مردوں پر!

پردے کی بحث مختلف عنوانات سے آ گئی ہے لیکن عورتوں کے طبعی فرائض پر نظر کرتے ہوئے کیا اس امر کے تسلیم کرنے میں کسی کو عذر ہو سکتا ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں کو کسی قدر (۳) مقید رہنا چاہیے۔ قدرت نے ہر دو کے فرائض مقرر کر دیے ہیں اور اقتضائے فرائض کے لحاظ سے ایک خاص حد تک مقید بھی کر دیا ہے۔ مذہب اور تمدن کی دنیا میں یہی کام ہے۔ اس بنا پر اگر عورتوں کی آزادی کو کسی معتدل حد تک مقید کیا جائے تو طبعی فرائض کی انجام دہی میں کیا خرابیاں (۴) پیدا ہو جائیں۔

عورتوں اور مردوں میں صرف اختلاف صورت ہی نہیں ہے، بلکہ طبیعت، مزاج، اخلاق اور فرائض کے لحاظ سے بالکل دو مختلف گروہ ہیں (۵)۔ اس لیے ان دونوں کے میدان عمل کو الگ الگ کرنے کے لیے پردے کو حقیقت میں حد فاصل قرار دیا گیا ہے کہ ہر گروہ اپنے میدان عمل میں محدود رہے۔ اس حد فاصل کے اٹھانے کی جب کوشش کی جاتی ہے تو تمدن و معاشرت کی بنیادوں میں حرکت پیدا ہو رہی ہے جو ظاہر اور روشن ہے کہ عنقریب عمارت گرنے والی ہے۔ اس امر کے ثبوت کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، یورپ کی موجودہ حالت کافی ہے۔

قاسم امین بک نے آزادی کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

> ”آزادی سے ہماری غرض یہ ہے کہ مذہب اور تمدن نے جو حدود قائم کر دیے ہیں ان سے واقف ہونے کے بعد انسان اپنے خیالات، افعال اور ارادے میں مستقل بالذات ہو۔“ (۶)

جب مذہب اور تمدن کی قید ضروری اور مسلم ہے تو ناظرین اس امر کا فیصلہ آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں کہ:

> ”کیا عورتوں کا طبعی وظیفہ اس امر کا مقتضی ہے کہ ان کو مردوں کے تمدنی اور سیاسی مشاغل میں شریک کیا جائے؟ اور کیا مذہب اور تمدن کے مصالح اقتضائے فرائض کے خیال سے عورتوں کو ایک خاص حد تک مقید رکھنا ضروری نہیں قرار دیتے؟“

یورپ کے مشہور مصنفوں کے جو اقوال، دوسرے مسئلے کی بحث میں (۷) درج کیے جائیں گے، ان کے دیکھنے کے بعد تم خود اندازہ کر لو گے کہ یہ صرف فرید وجدی ہی کی تنہا رائے نہیں ہے (۸) بلکہ یورپ کے تمام چیدہ مصنفین اس مسئلے میں اس کے (۹) ہم زبان ہیں، ان کی متفقہ آواز پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

> "عورتوں کا طبعی فرض نوع انسان کی حفاظت اور تربیت ہے۔ اس دائرے سے عورت جب قدم باہر نکالتی ہے تو شایستہ عورت (۱۰) نہیں رہتی بلکہ عورت اور مرد کے علاوہ ایک تیسری جنس کا نمونہ بن جاتی ہے۔"

وہ یورپ کی عورتوں کو "عورت" تسلیم کرنے میں سخت تامل (۱۱) ظاہر کرتے ہیں اور آزادی اور آزادی کی خواہش کو ایک خالص خبط اور نری وحشت قرار دیتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ (۱۲)

(الف) عورتوں کو تعلیم دی ہی نہیں گئی، اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں علمی ترقی کی صلاحیت نہیں!

(ب) آج یورپ کی جدید تشریحی تحقیقات اور علم فزیالوجی نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت، ہر حیثیت سے برابر ہیں! (۱۳)

> قاسم امین بک نے المرأۃ الجدیدۃ میں جابجا اس امر پر زور دیا ہے کہ
>
> "یورپ نے غفلت کے اس قدیم پردے کو اپنی علمی تحقیقات سے چاک کر دیا ہے، جس نے اس وقت تک عورتوں کی اصلی حالت کو پوشیدہ رکھا تھا۔ علم تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات (۱۴) نے ثابت کر دیا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں کسی قسم کا جسمانی یا دماغی فرق نہیں ہے اور جو علمی کام ایک مرد کے قوائے ذہنی انجام دے سکتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح ایک عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔"

صرف قاسم امین بک ہی کا یہ دعویٰ نہیں ہے بلکہ عام طور پر جب آزادیٔ نسواں کی بحث پیش ہوتی ہے تو فریق مخالف کی طرف سے عموماً یہ دعوی پر زور لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس لیے فرید وجدی کا ایک اہم فرض یہ بھی تھا کہ اس دعوے کی صداقت یا عدم صداقت کا فیصلہ کردے۔ (۱۵)

قاسم امین بک نے اس دعوے کے ثبوت میں صرف تین قول پیش کیے ہیں (۱۶)۔ چناں چہ وہ لکھتا ہے: ''پروفیسر جیک لوربٹ (۱۷) علم فزیالوجی کا ایک مشہور عالم لکھتا ہے کہ:

> ''محض ان آثار ونتائج کی بنا پر جو اس وقت تک عورتوں سے صادر ہوئے ہیں ان کی طبیعت کے متعلق کوئی قطعی اور یقینی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اگر عورت بھی اپنی فطری آزادی سے اسی طرح متمتع ہو، جس طرح مرد اپنی آزادی کے مالک ہیں اور عورت کو بھی اپنے عقل وشعور کی ترقی کے لیے اتنی مدت دی جائے جتنی مدت مردوں نے اپنی عقلی نشوونما کے لیے صرف کی ہے تو اس وقت بے شک کسی قسم کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔''

پروفیسر فرش لو لکھتا ہے کہ:

> ''میں نے ایک عرصے تک علم ریاضی، اخلاق اور فلسفے کی تعلیم دی ہے۔ میرے شاگردوں میں ایک بڑی تعداد عورتوں کی بھی تھی، مگر مجھ پر ہمیشہ یہی ثابت ہوا کہ مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں''(۱۸)۔

ایک اور عالم سے تیجازو، جو فزیالوجی کا پروفیسر اور اٹلی کی اکاڈمی کا ممبر ہے، (۱۹) اپنی کتاب ''عورتوں کی فزیالوجی'' میں لکھتا ہے کہ:

> ''تشریحی تحقیقات کی رو سے عورت اور مرد میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' (۲۰)

پھر ان اقوال (۲۱) کی بنا پر یہ دعوی کیا ہے کہ:

> ''علم فزیالوجی (ترکیب اجسام حیوانی) کے وہ مشہور اور باعظمت علما، جو نہایت باریک نگاہ عورتوں کے مسائل پر رکھتے ہیں (۲۲) اس امر پر متفق ہیں کہ عورت تمام قوائے عقلیہ میں مرد کے برابر درجہ رکھتی ہے (۲۳)۔

ان اقوال (۲۴) کو دیکھ کر ہر شخص یہی رائے قائم کرے گا کہ یورپ کے مشاہیر علما عورتوں کو مردوں سے (۲۵) کسی بات میں کم نہیں سمجھتے اور قوائے عقلیہ کے لحاظ سے دونوں کو ایک درجے میں رکھتے ہیں۔ مگر درحقیقت یہی وہ دھوکا ہے جس میں ہندوستان کی تمام نئی

جماعت (۲۶) مبتلا ہے اور جس کی وجہ محض کوتاہ نظری اور معلومات کی کمی ہے۔ فرید وجدی نے ثابت کیا ہے کہ ان اقوال کے مقابلے میں یورپ کے مشاہیر علما کی رائے اگر دیکھی جائے تو معلوم ہو جائے کہ یورپ کا قابل ترین حصہ ہرگز اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس نے ان تین مصنفوں کے اقوال کے مقابلے میں بیسیوں اقوال پیش کیے ہیں اور ان لوگوں کے جو آج یورپ میں موجودہ مدنیت کے عمدہ، بہترین مصنف اور فلسفۂ حسی کے مشہور عالم تسلیم کیے جاتے ہیں (۲۷)۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

> "یہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ میں عورتیں اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مردوں کے تسلط سے نکل کر بالکل آزاد ہو جائیں اور خود کو جسماً اور عقلاً ان کے برابر ثابت کر دیں تو ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے اور یہ افسوس اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال مغربی تعلیم کے ذریعے مغرب سے مشرق کی طرف قدم بڑھا رہا ہے اور بعض نادان اور سادہ لوح اس کی ظاہری صورت پر فریفتہ ہو کر اس کے خیر مقدم کا سامان کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس فصل میں قطعی دلائل پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی مفروضہ آزادی کا خیال اور مردوں کے تسلط سے نکلنے کا خبط محالات کے اقسام میں سے ایک قسم ہے جس کا پورا ہونا ناممکن اور محض ناممکن ہے۔ اس خیال کی کامیابی کے لیے جو شخص کوشش کرتا ہے، اس کی مثال اس مجنون کی سی ہے، جس کے سر میں قوانین قدرت کے تغیر و تبدل کا سودا سما جائے اور اپنی جہد و کوشش اس عبث اور انہونی بات کے لیے صرف کر دے۔" (۲۸)

اس کے بعد مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی اختلاف پر بحث کی ہے اور آخر الذکر کے طبعی ضعف کو علمائے تشریح اور فزیالوجی کی تحقیقات سے ثابت کیا ہے۔ ہم ان تمام اقوال و آرا کا خلاصہ ترتیب وار یہاں درج کرتے ہیں (۲۹):

سب سے پہلے عورت کے جسمانی ضعف پر نظر ڈالو اور غور سے دیکھو کہ قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال لوگوں کا دعویٰ مساوات کہاں تک صحیح ہے؟

(۳۰)۔ ....

۱۔ علم تشریح کی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ مرد کی جسمانی حالت عورت کی نسبت بہت زیادہ قوی ہے۔ یہ جسمانی اختلاف محض قیاس اور ظن پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس یقینی درجے تک پہنچ چکا ہے، جس کو تسلیم نہ کرنا مشاہدات اور محسوسات کا انکار کرنا ہے۔ اسی جسمانی اختلاف کی بنا پر یورپ میں بعض علمائے تشریح عورت کو موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ مرد کا حقیقی مقابل تسلیم نہیں کرتے، ان کا خیال ہے کہ عورت اس قدیم دنیا کی یادگار ہے(۳۱) جب انسان ابتدائی حالت میں تھا(۳۲) اور اس کے قوائے جسمانی وعقلی اپنے اصلی درجے تک نہیں پہنچے تھے۔ انسان کی مزاحمت نے اس دنیا کو برباد کر دیا اور اس زمانے کی عورتوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ انھیں کی نسل سے یہ عورتیں ہیں۔ (۳۳)

(انسائیکلوپیڈیا لفظ ''عورت'' ص ۳۰)

۲۔ انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لفظ ''عورت'' پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''مرد اور عورت میں اعضائے تناسل کی ترکیب وصورت کا اختلاف اگرچہ ایک بڑا اختلاف نظر آتا ہے لیکن صرف یہی ایک اختلاف نہیں ہے۔ عورت کے اور تمام اعضا سر سے پیر تک مرد کے اعضا سے مختلف ہیں، یہاں تک کہ وہ اعضا بھی جو بظاہر آخر الذکر سے بے حد مشابہ نظر آتے ہیں۔''

پھر علم تشریح کی تحقیقات کے موافق عورتوں کے اعضا پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور تمام بحث کا آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

> ''درحقیقت عورت کی جسمانی ترکیب، قریب قریب بچے کی جسمانی ترکیب کے واقع ہوئی ہے۔ اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ بچے کی طرح عورت کا بھی دماغ ہر قسم کے اثر سے بہت جلد اور بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے، بچے کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی رنج اور افسوس کا واقعہ پیش آئے تو فوراً رونے لگتا ہے، اور اگر کوئی خوشی کی بات ہو تو بے اختیار ہو کر اچھلنے کودنے لگتا ہے، قریب یہی حال عورت کا ہے کہ بہ نسبت مرد کے بہت زیادہ اس قسم کے جذبات سے متاثر ہوتی ہے کیوں کہ یہ جذبات اس کے تصور پر اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ عقل کو ان سے لگاؤ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ان میں استقلال نہیں ہوتا اور اسی لیے سخت وخوف ناک موقعوں پر عورت

ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔"

۳۔ علمی تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کی عمر کا اوسط، مرد کی عمر کے اوسط سے بارہ سینٹی میٹر کم ہے۔ (۳۴) یہ فرق کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ جس طرح وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے اسی طرح متمدن ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔ (۳۵)

۴۔ جس طرح عمر کے اوسط میں اختلاف پایا جاتا ہے (۳۶) اسی طرح جسم کے وزن اور ثقل میں بھی اختلاف ہے۔ مرد کے جسم کا متوسط ثقل سینتالیس کیلو ہے۔ مگر عورت کے جسم کا متوسط ثقل بیالیس کیلو، اور نصف سے کسی حالت میں زیادہ نہیں ہوتا یعنی عورت کے جسم کا ثقل مرد کے ثقل سے پانچ کیلو کم ہوتا ہے۔

۵۔ عضلات کے حجم و قوت کے لحاظ سے بھی عورت مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر وجدی فرید اپنے انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ:

> "مجموعی حیثیت سے اگر دیکھا جائے تو عورت کے جسم کے عضلات، مرد کے عضلات سے اس درجہ مختلف ہیں اور حجم و قوت کے لحاظ سے اول الذکر کے عضلات اس قدر ضعیف ہیں کہ اگر ان کی طبعی قوت کے تین حصے کیے جائیں تو دو حصے قوت مرد کے حصے میں آئے گی اور صرف ایک حصہ قوت عورت میں ثابت ہوگی۔ عضلات کی حرکت کی سرعت اور ضبط کا بھی یہی حال ہے۔ مرد کے عضلات جسمی عورت کی نسبت حرکت میں زیادہ تیز اور اپنے فعل میں زیادہ قوی ہیں۔"

۶۔ قلب جو انسانی زندگی کا اصل مرکز ہے، اسی طرح اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ علمی تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت کا قلب مرد کے قلب سے ساٹھ ڈرام چھوٹا اور خفیف ہوتا ہے۔

۷۔ قوت تنفس کے لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں عظیم الشان اختلاف ہے۔ مرد ایک گھنٹے میں تقریباً گیارہ ڈرام کاربون ایسڈ صرف کرتا ہے اور عورت ایک گھنٹہ میں چھ ڈرام سے بھی کچھ کم صرف کر سکتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی طبعی حرارت مرد سے بدرجہا کم ہے۔"

(۳۷)

(۳۸)

یہ تمام تحقیقات اور اقوال عورت کے جسمانی ضعف کو کن قطعی دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں؟ قاسم امین بک کے دعویٰ مساوات پر کس قسم کا اثر ڈالتے ہیں؟ اس کا فیصلہ ناظرین کے طبع سلیم پر چھوڑ کر اب ہم اس مسئلے کے دوسرے پہلو پر متوجہ ہوتے ہیں اور عورت اور مرد کا معنوی اختلاف اور اول الذکر کا دماغی ضعف وضاحت کے ساتھ دکھلاتے ہیں:

۱۔ مشہور اشتراکی (۳۹) فلاسفر علامہ پرودن اپنی کتاب ابتکار النظام میں لکھتا ہے کہ:

> ''عورت کا وجدان، بہ مقابلہ مرد کے وجدان کے اسی قدر ضعیف ہے، جس قدر اس کی عقلی قوت مرد کی قوت عقلیہ کے مقابلے میں ضعیف نظر آتی ہے۔ اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے، اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے، وہ بہ نسبت مرد کی رائے کے عموماً ناقص ہوتی ہے (۴۰)۔ پس عورت اور مرد میں عدم مساوات کوئی عارضی امر نہیں ہے، بلکہ عورت کی طبعی خصوصیت پر مبنی ہے۔''

۲۔ حواس خمسہ، جس پر انسان کی عقلی اور دماغی نشوونما کا دارومدار ہے، اس میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ نیکولس اور علامہ ویلیہ (۴۱) نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس سے ضعیف ہیں۔ (۴۲)

الف۔ عورت کی قوت شامہ کی حالت سے یہ امر باہر ہے کہ وہ دور سے (۴۳) عطر لیموں کی خوشبو محسوس کر سکے۔ برخلاف مرد کے کہ اس کی قوت شامہ قوی ہے اور وہ نہایت آسانی سے محسوس کر سکتا ہے۔ (۴۴)

ب۔ اسی طرح تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ عورت براسک ایسڈ کی بو ۱/۲۰۰۰۰ کی نسبت سے اور مرد ۱/۱۰۰۰۰ سے محسوس کر سکتا ہے جو ضعف و قوت (۴۵) کی بیّن دلیل ہے۔

ج۔ ذوق اور سمع کا حاسہ بھی عورت سے مرد کا بہت زیادہ قوی ہے، اس کے لیے کسی تشریحی دلیل کی ضرورت نہیں، انسائیکلوپیڈیا نے تصریح کر دی ہے کہ:

> ''اسی ضعف کا نتیجہ ہے کہ طعام کی عمدگی اور بدمزگی کے پہچاننے والے آواز کے پرکھنے والے، اور پیانو کے راگوں کے نقاد کل کے کل مرد ہیں۔ ایک عورت نے

بھی خود کو ان باتوں میں باکمال ثابت نہیں کیا۔"

۲۔ قوت لامسہ کے متعلق علامہ لومبروزو اور سیرجی وغیرہ استادوں کی متفقہ تحقیق ہے کہ عورت میں یہ قوت مرد کی نسبت بہت ضعیف پائی جاتی ہے۔ ان کی تحقیقات و کمل یہ ہے کہ جن آلام اور تکالیف کی عورت متحمل ہوتی ہے، مرد اس قدر نہیں ہو سکتا۔ یہ ظاہر فرق بتلا رہا ہے کہ مرد کی نسبت عورت کی قوتِ احساس ضعیف بلکہ ضعیف تر ہے۔ علامہ لومبروزو کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

> "حمل اور وضع کی شدید تکالیف پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ عورت دنیا میں کیسے کیسے آلام اور مصائب کی متحمل ہوتی ہے۔ اگر مرد کی طرح اس کا احساس قوی ہوتا تو ان تمام سختیوں کی کیوں کر متحمل ہو سکتی؟" (۴۶)

۳۔ قوتِ ادراک کا اصلی مرکز انسان میں بھیجا ہے، اسی کی کمی اور زیادتی اور ضعف و قوت پر ادراک کی تیزی اور سستی کا دارومدار ہے، لیکن جب علم سائی کولوجیا (۴۷) کے تجارب کو پیش نظر رکھ کر ہم غور کرتے ہیں تو اس میں بھی عورت ضعیف تر ثابت ہوتی ہے۔ علم مذکور نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے بھیجے اور مرد کے بھیجے میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے۔ مرد کے بھیجے کا اوسط، عورت کے بھیجے سے سو گرام زیادہ ہے۔ (۴۸) اگر کوئی اس کے جواب میں کہے کہ یہ زیادتی عورت اور مرد کے جسمانی اختلاف پر مبنی ہے، تو یہ بھی غلط ہے۔ کیوں کہ یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اس کی جسمی حالت سے وہ نسبت رکھتی ہے جو چالیس کے عدد کو ایک سے ہوتی ہے۔ مگر عورت کا بھیجا اس کی جسمانی قوت سے چوالیس اور ایک کی نسبت رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کے بھیجے کی کمی جسمانی ضعف پر مبنی ہے تو متقابلتہً یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے؟

(۴۹) .....

اسی طرح بھیجے کے اس جوہر میں جو قوتِ ادراک کا نقشِ حقیقی ہے، محسوس اختلاف پایا جاتا ہے۔

قاسم امین بک

قاسم امین بک اس تشریحی اور فزیالوجی اختلاف سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے اگلی کے ایک

مصنف نے تجی زدہ کے قول سے استشہاد کرنے سے پہلے پیش بندی کر دی، وہ لکھتا ہے کہ:

> "اس میں شک نہیں کہ آج کل عورت مرد سے ہر حیثیت میں کم نظر آتی ہے۔ لیکن ہم کو اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ اس کا طبعی اور خلقی ضعف ہے، یا تربیت کی خرابی اور مدت کی غلامی نے اس کو اس ادنیٰ حالت پر (۴۹/الف) پہنچا دیا ہے؟" (۴۹/ب)

پھر تجی زدہ کی رائے نقل کی ہے کہ:

> "سب سے بڑا فرق جو مرد اور عورت کے دماغی قویٰ میں پایا جاتا ہے، اس کی وجہ وہ حالت غلامی ہے جس میں ایک زمانہ دراز سے عورت محیط ہے" (۵۰)۔

عام طبیعتیں ممکن ہے کہ اس اعتراض (۵۱) کے رعب میں آ جائیں، لیکن فرید وجدی پر اس کا جادو (۵۲) کارگر نہیں ہو سکتا۔ فزیالوجی اور "علم النفس والقویٰ" (۵۳) کے محققانہ اصول اس کے پیش نظر تھے۔ اس نے ایک سیدھی سی بات پیش کر کے ثابت کر دیا کہ یہ اعتراض بھی مدافعت کے لیے کافی نہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

> "ممکن ہے کہ ایک شخص ان تمام دلائل تشریح کو دیکھ کر یہ اعتراض کرے کہ جو دماغی اختلاف تم نے ثابت کیا ہے وہ نتیجہ ہے مردوں کے تسلط، جبر، ظلم اور بے رحمی کا، ایک زمانہ دراز سے عورتیں حالت غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور تہذیب و شائستگی تعلیم و تمدن سے، جو عقلی قوت کی نشو و نما کا باعث ہوتا ہے، قطعی محروم ہیں۔ اگر ان کو ایک طول طویل زمانے تک اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ مردوں کی طرح تعلیم و شائستگی حاصل کریں اور قوائے عقل کے زنگ کو دور کریں تو کیا عجب ہے کہ ان کے دماغی قویٰ ترقی کر کے مرد کے قویٰ کے مساوی ہو جائیں اور وہ ضعف جو ان دونوں جنسوں میں مابہ الامتیاز قرار دیا جاتا ہے مفقود ہو جائے، لیکن درحقیقت یہ اعتراض بھی پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکا۔" (۵۴)

اوّل تو وہ قومیں جو ایک زمانہ دراز سے حالت وحشت میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور جن کا بڑا حصہ دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہے، اس اعتراض کی غلطی پر شاہد ہیں۔ ان میں

اگر تعلیم اور تمدن نہیں ہے تو کسی ایک جنس ہی میں نہیں ہے، بلکہ مرد اور عورت دونوں میں نہیں ہے۔ اگر ان میں وحشت پائی جاتی ہے تو صرف عورتوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ مرد اور عورت دونوں میں پائی جاتی ہے۔ پھر اگر یہ اعتراض صحیح ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ جسمانی اور دماغی فرق متمدن ممالک کی طرح، ان میں بھی باہم پایا جاتا ہے؟ کیا افریقہ کی وحشی قوموں نے بھی عورتوں کو تعلیم اور شائستگی سے محروم کر رکھا ہے، کیا وحشت کے ساتھ ان میں بھی یہ امتیاز پایا جاتا ہے؟

دوم یہ کہ اگر یہ اختلاف مردوں کے تمدنی مشاغل میں عدم مشارکت کا نتیجہ ہے، اور اس امر پر مبنی ہے کہ مردوں کے تسلط سے عورتوں کو آزادی نصیب نہیں ہوئی، تو سوال یہ ہے کہ وحشی اقوام میں یہ فرق کس بنا پر پایا جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ممالک حارہ کے رہنے والے وحشی اقوام میں، مردوں کی طرح عورتیں بھی بالکل آزاد اور مستقل ہیں! یہاں تک کہ تمام خارجی کام بھی مثلاً زراعت اور آبپاشی وغیرہ کے عورتیں ہی کیا کرتی ہیں؟ پھر متمدن ممالک کی طرح، یہ دماغی اور جسمانی اختلاف ان اقوام میں کیوں پایا جاتا ہے؟(۵۵)

(۵۶)...

عجیب بات یہ ہے کہ ادھر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی گذشتہ وحشت نے ان کے جسمانی اور دماغی قویٰ کو ضعیف کر دیا اور ادھر یورپ کے بعض مصنفین (۵۷) کا یہ خیال ہے کہ تمدن کی ترقی عورت اور مرد کے طبعی اختلاف کو اور زیادہ کر رہی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے۔

''مرد اور عورت کا اختلاف تمدن کی ترقی سے اور زیادہ بڑھ رہا ہے۔''(۵۸)

حقیقت یہ ہے کہ مرد اور عورت کا جسمانی اور دماغی اختلاف، ایک طبعی اختلاف ہے، جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی، فرض کر لو کہ تشریح اور فزیالوجی کی یہ تمام دقیق بحث سر سے پیر تک غلط ہے، یہ بھی تسلیم کر لو کہ اگر اختلاف پایا بھی جاتا ہے تو صرف اسی حد تک، جس حد تک خارجی اثرات نے عورتوں کو ضعیف کر دیا ہے لیکن اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ حیوانات اور نباتات کی طبعی حالت بھی اس اختلاف کی صاف صاف شہادت دے رہی ہیں، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک کیمسٹری کی نئی تحقیقات اور تجارب نے پتا لگایا ہے، جمادات بھی اس اختلاف سے محفوظ نہیں،

عود، خرما اور کیلا کے درختوں میں جہاں نر اور مادہ کا امتیاز ثابت ہوا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ نر درخت کو مادہ درخت پر طبعی قوت کے لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ حیوانات میں نر کو جو تسلط اور غلبہ اپنی مادہ پر ہوتا ہے، اس کے لیے علمی دلایل کی ضرورت نہیں، روزانہ کا مشاہدہ کافی ہے۔ نر اپنی مادہ کی خبر گیری اور حفاظت کرتا ہے، حمل کے زمانے میں اس کو آرام سے رکھتا ہے، خود پر اس کو ترجیح دیتا ہے نسبتاً زیادہ محنت کرتا ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ مادہ سے نر کا قد و قامت بھی زیادہ ہوتا ہے۔ تشریح نے ثابت کر دیا ہے کہ نر کے جسمانی قویٰ، خارجی اور بعض اعضاء مادہ سے بہت زیادہ قوی ہوتے ہیں۔ طب کا محققانہ اصول ہے کہ مادہ کی نسبت نر کا گوشت زیادہ قوی اور زیادہ طاقت بخش ہوتا ہے، کیا یہ تمام باتیں اس امر کا بیّن ثبوت نہیں ہیں کہ مخلوقات میں جنس اناث اور رجال کا اختلاف خارجی اثرات کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ خود فطرت نے جسم و دماغ تقسیم کرتے ہوئے عورتوں کو مردوں سے کم حصہ بخشا ہے۔ فرید وجدی نے جس قدر دلایل پیش (۵۹) کیے ہیں اگر وہ ثبوت دعویٰ کے لیے کافی نہ سمجھے جائیں تو ابھی اور بیسیوں اختلاف دکھلائے جا سکتے ہیں۔

فزیالوجی کا یہ مسلم اصول ہے کہ انسان کی عقلی قوت و ضعف کا سرچشمہ دماغ ہے، احمقوں اور بے وقوفوں کا دماغ، مشاہیر عقلا کے دماغ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو لوگ زندگی میں احمق اور لا یعقل مشہور تھے، جب ان کے دماغ کو وزن کیا گیا تو چھیالیس اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا، لیکن جن لوگوں کی عقل کی تیزی، ذہن کی سرعت، خیال کی بلندی عام طور پر مسلّم تھی، ان کے دماغ تولے گئے تو ساٹھ اوقیہ سے بھی وزن میں متجاوز ثابت ہوئے۔ یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے، جس میں مرد کا پلہ عورت سے کئی درجہ (۶۰) بڑھا ہوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ۴۹۱/۲ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴۔ دو سو مختصر مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۳۴ اوقیہ ثابت ہوا۔ لیکن جب دو سو اکانوے دماغ عورتوں کے وزن کیے گئے تو سب سے زیادہ وزنی دماغ ۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا، کیا یہ اختلاف اس امر کا بہترین ثبوت نہیں ہے کہ عورت کے عقلی قوی مرد کے قویٰ سے بدرجہا ضعیف ہیں؟ (۶۱) دماغ جو قوائے عقلیہ کا اصلی مرکز ہے، جب اس کا یہ حال ہے تو پھر عورتوں کا یہ دل گردہ کہاں (۶۲) جو مردوں کی برابری کا دعویٰ کر سکیں؟ (۶۳)

لیکن آؤ، دل اور گردوں کا بھی امتحان کر لیں! فزیالوجسٹ جماعت کا اس تحقیق پر اتفاق ہے کہ مردوں کے دل کا وزن دس سے بارہ اوقیہ تک ہوتا ہے اور عورت کے دل کا وزن زیادہ سے زیادہ دس اوقیہ ورنہ عام اوسط آٹھ اوقیہ ہے۔ اس فرق کو جسمانی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ مرد کے دل کو اس کی جسمانی قوت سے ایک اور ایک سو انسٹھ کی نسبت ہے، مگر عورت کا دل تمام جسم سے وہ نسبت رکھتا ہے جو ایک کو ایک سو انتیس سے ہوتی ہے۔

گردوں کے وزن میں مرد اور عورت اس قدر مختلف ہیں کہ سخت حیرت ہوتی ہے۔ مرد کے گردوں کا وزن چھ اوقیہ سے ساڑھے چھ اوقیہ تک تحقیق ہوا ہے، مگر عورتوں کے گردوں کا وزن زیادہ سے زیادہ نصف اوقیہ اور عموماً نصف اوقیہ سے بھی کسی قدر کم! (۶۴)

جو لوگ یورپ کی معمولی سی معمولی آواز کو بھی وحی الٰہی سمجھتے ہیں ان کے لیے قاسم امین بک کا یورپ کے دو تین قولوں کو پیش کر دینا یہ حکم رکھتا ہے کہ اس کے آگے اطاعت کا سر فوراً جھکا دیں اس لیے ان تمام رایوں کے پیش کرنے کے بعد فرید وجدی نے ان کی بھی قلعی کھول دی (۶۶) اور بتلا دیا کہ ان بے شمار اقوال کے مقابلے میں، جو آزادی کی مخالفت کر رہے ہیں، یہ تجاویز و فرضی شخصی رائیں ہرگز وقعت کی نظر سے نہیں دیکھی جا سکتیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

> ''جو اقوال ہم نے (۶۶) پیش کیے ہیں وہ ان لوگوں کے ہیں جو آج یورپ میں مشاہیر فلاسفہ میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہم نے جا بجا انسائیکلوپیڈیا کے اقوال سے استشہاد کیا ہے اور انسائیکلوپیڈیا علوم عصریہ کا عطر، اور انیسویں صدی کے اعاظم اور کبار علما کی رایوں کا خلاصہ ہے، اس کے مقابلے میں یہ تجاویز وغیرہ کے اقوال وہ نسبت رکھتے ہیں جو قول احاد کو جمہوری رائے سے ہوتی ہے۔'' (۶۷)

عورت میں اس تمام تشریحی ضعف کے ساتھ انفعال اور ہیجان کی قوت مرد سے بہت زیادہ ہے (۶۸) اور یہی ایک ایسی چیز ہے جس میں عورت کا پلہ مرد سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس قوت سے بھی عورت کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ کیوں کہ ہیجان اور احساس کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت عقلی دائرے میں اور زیادہ ناکام ہوتی ہے۔ چنانچہ فرید وجدی نے انسائیکلوپیڈیا سے پروفیسر روفاریلی کا قول نقل کیا ہے (۶۹) کہ:

> ''یہ اختلاف، ان دونوں جنسوں کے ظاہری ممیزات سے بالکل مطابق ہے۔ مرد

میں ذکا وفہم، اور ادراک کا مادہ زیادہ ہے اور عورت میں انفعال اور ہیجان کا جذبہ بڑھا ہوا ہے۔" (۷۰)

ایک اور مشہور مصنف علامہ تروسیہ ہیجان کی زیادتی سے عورت کے طبعی ضعف پر استدلال کرتا ہے۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

> "عورت کے عصبی ضعف کا یہ نتیجہ ہے کہ تم اس کے مزاج میں مرد کی نسبت زیادہ ہیجان پاتے ہو اور اس کی توجہ اپنے طبعی وظیفہ (۷۱) حمل، وضع اور ارضاع کی طرف اس کو مختلف قسم کی تکلیفوں اور خطروں میں ڈال دیتی ہے۔"

ابوالکلام آزاد دہلوی
ندوہ۔ لکھنؤ (۷۲)

حواشی

۱۔ دیکھو "تحریر المرأۃ والمرأۃ الجدیدۃ"

۲۔ کتاب میں "پہلے نمبر" کی جگہ "پہلی فصل" نے لے لی ہے۔

۳۔ کتاب میں جملہ "کسی قدر" "ایک خاص حد تک" سے بدل گیا ہے۔

۴۔ "قباحتیں" کتاب میں بدل کر "خرابیاں" ہو گیا ہے

۵۔ عبارت "عورتوں اور مردوں گروہ ہیں" مختصر ہو کر کتاب میں: "عورتیں اور مرد دو مختلف گروہ ہیں" رہ گئی ہے۔

۶۔ المرأۃ الجدیدۃ، فصل دوم

۷۔ کتاب میں "دوسرے مسئلے کی بحث" کی جگہ "تیسری فصل" کے الفاظ ہیں۔

۸۔ کتاب میں "فرید وجدی" کے نام کی جگہ لفظ "ہماری" ہے۔

۹۔ "اس کے" کی جگہ کتاب میں لفظ "ہمارے" ہے۔

۱۰۔ شائستہ عورت کی جگہ کتاب میں صرف "عورت" ہے۔

۱۱۔ "صحت تامل" کی جگہ کتاب میں صرف "تامل" ہے۔

۱۲۔ "دوسرا مسئلہ" کے ذیل میں الف اور "ب" میں جو سوالات درج کیے ہیں، ان میں سے اس مقام پر دوسرے سوال سے بحث کی گئی ہے۔ علم تشریح کی تحقیقات کی روشنی میں عورت اور مرد کی صلاحیتوں اور خصوصیات پر الندوہ میں مضمون کی دوسری قسط کے ساتھ ساتھ یہ بحث ختم ہو جاتی ہے۔ مضمون کی تیسری قسط کا آغاز الف میں اٹھائے گئے سوال پر بحث سے ہوتا ہے۔

۱۳۔ کتاب میں "دوسرا مسئلہ" مع الف اور ب کے سوالات کے بعد دوسرے صفحے میں ایک تمہیدی بیان بھی ہے جس کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے۔ یہ تمہید عنوان ذیل کے ساتھ کتاب میں اس طرح ہے

"مرد اور عورت جسمانی اور دماغی قویٰ میں برابر ہیں؟

مرقعہ کرد تحقیق عیب منزلیست
مستانہ اش نقاب ز رخسارہ بر کشیم

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یورپ میں عورتیں اس کوشش میں مصروف ہیں کہ مردوں کے تسلط سے نکل کر بالکل آزاد ہو جائیں اور اپنے آپ کو جسماً اور عقلاً ان کے برابر ثابت کر دیں تو ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے اور یہ افسوس اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال مضر اور ناقص تعلیم کے ذریعے مغرب سے مشرق کی طرف قدم بڑھا رہا ہے اور بعض نادان اور سادہ لوح اس کی ظاہری صورت کی مصنوعی دل فریبی پر شیفتہ و فریفتہ ہو کر اس کے خیر مقدم کا سامان کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس فصل میں علمی دلائل پیش کر کے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی مفروضہ آزادی کا خیال اور مساوات کا خبط محالات کے اقسام میں سے ایک ایسی قسم ہے، جس کی طرف صرف اس شخص کا ذہن منتقل ہو سکتا ہے، جو حواس کی دولت برباد کر چکا ہو اور دیوانگی اور جنون کے دیو کا رعب اس کے دماغ کو معطل کر چکا ہو۔ ہم یورپ کے مشاہیر عقلا اور سر برآوردہ علما کی سائنٹفک رائیں نقل کر کے بتلانا چاہتے ہیں کہ جو شخص اس خیال کی کامیابی کے لیے کوشش کرتا ہے، اس کی مثال بعینہ اس مجنون کی سی ہے، جس کے سر میں قوانین قدرت کے تغیر و تبدل کا سودا سما جائے اور وہ اپنی تمامی جد و کوشش اس ان ہونی اور عبث بات کے لیے صرف کرے۔ (مسلمان عورت: ص ۳۱، ۳۲)

اس تمہید کے بعد ”قاسم امین بک نے . . .“ سے مضمون الندوہ اور کتاب کا یکساں ہو جاتا ہے۔

”اس مضمون میں بار بار یورپین مصنفوں کے نام آئیں گے اور ان کا لہجہ اور تلفظ متغیر ہوگا لیکن ہم مجبور ہیں، فرنچ اور جرمنی وغیرہ ناموں کی تصحیح آسانی سے نہیں ہو سکتی اور نہ ایک معمولی مضمون کے لیے تصحیح میں غیر معمولی اہتمام کیا جا سکتا ہے۔ عربی خراد پر چڑھ کر جو صورت ناموں نے اختیار کر لی ہے بغیر کسی تغیر و تبدل کے ہم درج کر دیتے ہیں، اصلی غرض محض مطلب سے ہے اور اس پر ناموں کی اس خفیف غلطی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

۴۔ کتاب میں یہ جملہ ”اور تجارب“ کے اضافے کے ساتھ اس طرح ہے ”فزیالوجی کی تحقیقات اور تجارب نے . . .“

۵۔ ان تین سطروں کی عبارت نے کئی تبدیلیوں اور اضافوں کے بعد کتاب میں یہ شکل اختیار کر لی ہے: ”بلکہ جب کبھی عورتوں کی آزادی کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو فریق مخالف کی طرف سے عموماً یہی دعویٰ پرزور لفظوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے ہمارا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ اس دعوے کی قطعی صداقت کا فیصلہ کر دیں۔“ (مسلمان عورت: ص ۳۲)

۶۔ کتاب میں صرف دو قول پیش کیے ہیں۔

۷۔ اس مقام پر مولانا آزاد نے پروفیسر جیک لوربٹ کا نام اور اس کی تحقیق کا حوالہ کتاب میں حذف کر دیا ہے۔

۱۸۔ پروفیسر فرش لو کے قول میں جملہ "مگر مجھ پر ... تا ... فرق نہیں۔" اس طرح بدل گیا ہے "مگر میں نے تعلیمی ترقی کے لحاظ سے عورتوں میں کسی قسم کا دماغی ضعف نہیں پایا اور مجھ پر ہمیشہ یہی ثابت ہوا کہ مرد اور عورت کے دماغی قوی میں ذرہ بھر فرق نہیں ہے۔" (مسلمان عورت: ص ۳۳)

۱۹۔ کتاب میں "ے مجازو" کے تعارف کے جملے حذف کر دیے ہیں۔

۲۰۔ اس اقتباس میں "کوئی فرق نہیں" کی جگہ "کسی قسم کا فرق ثابت نہیں ہوتا ہے۔" اس اقتباس کے نیچے یہ حوالہ ہے۔ "دیکھو: المرأة الجدیدہ: قاسم امین بک"

۲۱۔ کتاب میں "ان اقوال" کی جگہ "ان دونوں دعاوی" ہے۔

۲۲۔ کتاب میں یہ عبارت "عورتوں کے مسائل پر رکھتے ہیں" کی جگہ اس طرح ہے "عورتوں کی جسمانی اور دماغی حالت پر رکھتے ہیں۔"

۲۳۔ المرأة الجدیدہ

۲۴۔ کتاب میں "اقوال اور دعاوی" ہے۔

۲۵۔ کتاب میں "عورتوں کو مردوں سے" کی جگہ "عورت کو مرد سے" بنا دیا ہے۔

۲۶۔ کتاب میں "تمام نوعی جماعت" کو "ہرنی جماعت" سے بدل دیا گیا ہے۔

۲۷۔ کتاب کی اس عبارت: "فرید وجدی نے ... تک ... کیے جاتے ہیں۔" بڑی تبدیلی ہوگئی ہے۔ اب وہ اس طرح ہے: "اگر دونوں کے مقابلے میں یورپ کے محقق علما کی رائیں دیکھی جائیں تو معلوم ہوئے کہ یورپ کا فاضل ترین حصہ ہرگز اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا، بجز ان دو لوگوں کے مقابلے میں بیسیوں اقوال پیش کریں گے اور ان لوگوں کے جو آج یورپ میں موجودہ مدنیت کے مجدد و بہترین مصنف اور فلسفی کے جلیل القدر عالم تسلیم کیے جاتے ہیں۔"

۲۸۔ المرأة المسلمہ: فصل سوم ص ۳۰

۲۹۔ گزشتہ اقتباس سے پہلے جملہ "چنانچہ وہ لکھتا ہے" سے لے کر "یہاں درج کرتے ہیں" تک کی کل عبارت کتاب میں حذف کر دی گئی ہے۔

۳۰۔ اس مقام پر "(۱) علم تشریح کی ....." کے اوپر "عورت کا جسمانی ضعف" سب ہیڈنگ ہے۔

۳۱۔ عورت اس قدیم دنیا کی یادگار ہے۔" کتاب میں اس جملے کو "عورت اس قدیم مخلوق کی یادگار ہے" بنا دیا گیا ہے۔

۳۲۔ ''اس مقام پر یہ جملہ "جب انسان ابتدائی حالت میں تھا" حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ یہ جملہ اضافہ کیا گیا ہے: "جو بہ سبب جسمانی اور عقلی کمزوری میں اس کے مشابہ تھا۔"

۳۳۔ اس فقرہ کی عبارت: "انسان کی مزاحمت تا یہ عورتیں ہیں" کتاب میں اس طرح بدل گئی ہے: "انسان کی مزاحمت نے اس مخلوق کو فنا کر دیا اور اس کی عورتوں میں غلبہ حاصل کر لیا۔ اسی کی نسل سے موجودہ دور کی عورتیں پیدا ہوئیں۔" (مسلمان عورت، ص ۳۴)

۳۴۔ کتاب میں یہ امتیاز عورت کے قد کے بارے میں ہے، نہ کہ عمر کے بارے میں! کتاب میں یہ بیان اس طرح ہے: "علمی تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے قد کا اوسط طول مرد کے قد کی اوسط درازی سے بارہ سنٹی میٹر کم ہے۔" یہی درست بھی ہے۔ الندوہ میں کتابت کی غلطی ہوئی تھی۔ کتاب میں درست کر دیا گیا ہے۔

۳۵۔ اس مقام پر یعنی (۳) کے آخر میں کتاب میں یہ جملہ زیادہ ہے: "اور جوانوں کی طرح بچے بھی اس اختلاف کی شہادت دیتے ہیں۔"

۳۶۔ اوپر کے پیراگراف (۳) میں قد کی جگہ "عمر" درج ہو گیا ہے۔ اسی خیال کے مطابق پیراگراف (۴) میں بھی کاتب کے قلم سے "عمر" نکلا۔ حالاں کہ سیاق و سباق کا صاف اشارہ ہے کہ یہ "قد" کی مثال کا موقع ہے۔ یہ غلطی کتاب کے متن میں بھی درست ہونے سے رہ گئی۔

۳۷۔ اس بحث میں "قوتِ تنفس" اور "طبعی حرارت" کی جگہ کتاب میں "سرعتِ تنفس" اور "حرارتِ غریزی" کی جیسی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور پہلے جملے میں دعوے کے ثبوت میں کافی وضاحت اور استدلال سے کام لیا ہے۔ کتاب میں یہ مکمل بیان اس طرح ہے: "سرعتِ تنفس کے لحاظ سے بھی عورت اور مرد میں عظیم الشان اختلاف ہے۔ علمی تجربے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ سانس کے ذریعے سے کاربونک ایسڈ کے جو ذرات باہر آتے ہیں، وہ اندرونی حرارت کی گرمی سے بخارات بن کر سانس میں ملے ہوئے نکلتے ہیں۔ اس تجربے کی بنا پر تحقیق کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مرد ایک گھنٹے میں تقریباً گیارہ ڈرام کاربون کی مقدار جلا دیتا ہے، مگر عورت چھ ڈرام سے کچھ زیادہ جلاتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت کی حرارتِ غریزی بھی مرد کے مقابلے میں بہت کم یا نصف سے کچھ ہی زائد ہے۔"

۳۸۔ اس مقام پر قوتِ تنفس پیراگراف (۷) کی بحث کے بعد کے دماغی ضعف کی بحث کے شروع میں کتاب میں "عورت کا دماغی ضعف" کی ذیلی سرخی ہے۔

۳۹۔ کتاب میں "اشتراکی" کے لیے مولانا آزاد نے "مناسبت" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

۴۰۔ کتاب میں یہ جملہ ''وہ بہ نسبت : ناقص ہوتی ہے۔'' اس طرح ہے: ''وہ مردوں کی رائے سے مطابق نہیں ہوتی۔''

۴۱۔ کتاب میں اس [illegible] کا نام ''نیلی'' استعمال ہوا ہے۔

۴۲۔ کتاب میں جملہ ''ضعیف تر'' ہے۔

۴۳۔ کتاب میں ''دور سے'' کی بجائے ''ایک خاص فاصلے سے'' ہے۔

۴۴۔ الف کے تحت آخری جملہ کتاب میں اس طرح بن گیا ہے: '' . اس کی قوت شامہ اس قدر قوی ہے کہ وہ اس درجے کی خوشبو کو آسانی سے محسوس کر لیتا ہے، جس سے دو چند مقدار کی خوش بو سے عورت کو احساس ہو سکتا ہے۔''

۴۵۔ ''ب'' کی ضمنی عبارت کے آخری جملے میں ''ضعف وقوت'' سے کتاب میں ''وقوت'' حذف کر دیا گیا ہے۔

۴۶۔ اس اقتباس میں کتاب کی عبارت میں ذیل کی چند سطور زیادہ ہیں: ''درحقیقت نوع انسان کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے اس کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے۔ ورنہ نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی۔''

۴۷۔ سائیکولوجی کا عربی ترجمہ مصنف نے ''علم النفس والتجارب'' کیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس سے انسان کے نفس اور دماغ کی اصلی ہیئت معلوم ہوتی ہے۔'' (دیکھو: جیمز ڈکشنری ص ۳۰۵)

۴۸۔ مصنف نے دماغی اختلاف پر بحث کرتے ہوئے دماغ کے وزن اور مخیخ کے اختلاف پر قصداً یا سہواً بحث نہیں کی۔ حالانکہ عورتوں کے عقلی ضعف کی بنا اسی اختلاف پر ہے۔ دماغ کے وزن کا اختلاف ہم آگے چل کر دکھائیں گے لیکن بھیجے کی بحث میں مخیخ کے اختلاف کو جاننا بھی ضروری ہے۔ اصطلاح تشریح میں دماغ کے آخری حصے کو مخیخ کہتے ہیں۔ مرد کے دماغ میں بھیجے کے ساتھ مخیخ کی نسبت (۱) اور (۸ ۳/۷) کی ثابت ہوئی ہے مگر عورتوں کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ (۱) اور (۸ ۱/۲) کی نسبت ہوتی ہے۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مخیخ دماغ کے ان اجزا میں سے ہے جن کی مقدار کی زیادتی پر عقل اور فکر کی تیزی اور عمدگی کا دارومدار ہے۔ (دیکھو: التوشیح فی اصول التشریح، ص ۲۴۴)

۴۹۔ اس مقام پر کتاب میں یہ مضمون زیادہ ہے:

(۳) ''علاوہ اس کے عورت کے سر کے بھیجے میں خم و پیچ نہایت کم ہیں اور اس کے پردوں کا نظام

بھی ناقص ہے۔ علماے سائی کولوجی نے اس اختلاف کو ان دونوں جنسوں کے ممیزات میں ایک اہم امر قرار دیا ہے۔"

(۵) اسی طرح مرد اور عورت کے بھیجوں کے جوہر نخاعی میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ جوہر نخاعی قوت ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے۔ اس لیے یہ اختلاف کوئی معمولی اختلاف نہیں ہے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

ممکن ہے کہ ایک شخص ان تمام تشریحی دلائل کو دیکھ کر یہ اعتراض کرے کہ جو دماغی اختلاف تم نے ثابت کیا ہے، وہ نتیجہ ہے مردوں کے تسلط، جبر، ظلم اور بے دردی کا! ایک زمانۂ دراز سے عورتیں غلامی میں زندگی بسر کر رہی ہیں اور تہذیب و شائستگی تعلیم و تمدن سے (جو عقلی نشو و نما کا باعث ہوتے ہیں) قطعی محروم ہیں۔ اگر ان کو ایک طول طویل زمانے تک اس امر کا موقع دیا جائے کہ مردوں کی طرح تعلیم و شائستگی حاصل کریں اور قوائے عقلی سے زنگ کو دور کریں تو کیا عجب ہے کہ ان کے دماغی قویٰ ترقی کر کے مرد کے قویٰ کے مساوی ہو جائیں اور وہ ضعف جو ان دونوں جنسوں میں مابہ الامتیاز قرار دیا جاتا ہے، مفقود ہو جائے۔ (مسلمان عورت: ص۴۰، ۴۱)

۴۹/الف۔ "مہلت دی" کی جگہ کتاب میں "حاجت تک" ہے۔

۴۹/ب۔ اس مقام پر کتاب میں ذیل کی عبارت زیادہ ہے۔

"پھر یورپ کے دو مصنفوں کے اقوال سے استشہاد کیا ہے۔ چنانچہ ہاربرٹ پروفیسر فریاوچی لکھتا ہے: محض ان آثار و نتائج کی بنا پر، جو اس وقت تک عورت کے متعلق دریافت ہوئے ہیں، اس کی طبیعت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ اگر عورت بھی اپنی فطری آزادی سے اسی طرح متمتع ہو جس طرح مرد اپنی آزادی کے مالک ہیں، اور عورت کو بھی اپنے عقل و شعور کی ترقی کے لیے اتنی مدت دی جائے جتنی مدت مرد نے اپنی عقلی نشو و نما کے لیے صرف کی ہے تو اس وقت بے شک کسی قسم کا صحیح فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔"

۵۰۔ المرأۃ الجدیدہ: قاسم امین بک، فصل چہارم۔ کتاب میں "عورت محیط ہے" کی جگہ "عورت گرفتار ہے" بنا دیا گیا ہے۔

۵۱۔ کتاب میں "اس اعتراض" کی جگہ "ان اقوال" نے لے لی ہے۔

۵۲۔ "فرید وجدی پر اس کا جادو" کی جگہ "ہم پر ان کا جادو" کے جملے نے لے لی ہے۔

۵۳۔ "علم النفس والقویٰ" کی جگہ کتاب میں "سائی کالوجی" کی معروف اصطلاح نے لے لی ہے۔

۵۴۔ یہ پورا اقتباس "کافی نہیں" کے بعد سے "نہیں پہنچ سکا" تک کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۵۵۔ المرأۃ المسلمہ: فصل سوم ص ۳۴ و ۳۶

۵۶۔ اس مقام پر پروفیسر وو فارینی کی رائے کا مندرجہ ذیل حوالہ کتاب میں اضافہ ہے:

"انسائیکلوپیڈیا بھی اس رائے میں ہم سے متفق ہے۔ اس کا فاضل ایڈیٹر پروفیسر وو فارینی لکھتا ہے:

جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور ذہنی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے، بعینہٖ اسی طرح امریکہ کی وحشی ترین اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔"

۵۷۔ کتاب میں "مصنفین" کے ساتھ "عقلا" کا اضافہ بھی کر دیا ہے یعنی "مصنفین اور عقلا"

۵۸۔ کتاب میں انسائیکلوپیڈیا کا یہ حوالہ زیادہ مفصل اور اس طرح ہے:

"پروفیسر وو فارینی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے:

تمدن کے بڑھنے کے ساتھ ہی قدرتی اختلاف کی وضاحت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ چناں چہ گوری رنگت کے مردوں اور عورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے، وہ سیاہ فام رنگت کے وحشی مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاف سے کئی درجہ بڑھا ہوا ہے۔" (فصل سوم ص ۳۷)

۵۹۔ "فرید وجدی نے جس قدر دلائل ..." کی جگہ کتاب میں جملہ اس طرح ہے: "گذشتہ صفحات میں جو دلائل ...."

۶۰۔ "کئی درجے" کی جگہ کتاب میں "بدرجہا" ہے۔

۶۱۔ اس جملے میں "عورت" اور "مرد" کے الفاظ واحد استعمال ہوئے ہیں۔ کتاب میں انھیں بہ صیغہ جمع "عورتوں" اور "مردوں" استعمال کیا گیا ہے۔

۶۲۔ "عورتوں کا بدل کردہ کہاں جو مردوں کی ..." کتاب میں اس طرح ہے: "عورتوں کا بدل کردہ کہاں کہ وہ مردوں کی ..."

۶۳۔ (التوضیح فی اصول التشریح ص ۳۰۷) کتاب مذکورہ ڈاکٹر "یوحنا ورتبات" پروفیسر تشریح و فزیالوجی کی مستند تصنیف ہے، جدید تشریح میں اس سے بہتر کوئی کتاب عربی میں نہیں لکھی گئی۔ پہلی مرتبہ مصر میں چھپی، پھر ترمیم و تہذیب کے بعد بیروت سے شائع ہوئی، بیروت کا ایڈیشن پیش نظر ہے۔

۶۴۔ کتاب میں ان دونوں پیراگرافوں کو "لیکن آزاد دلوں اور گردوں ... تا ... کس قدر کم!" اور اس کا حوالہ "التوضیح والتشریح ص ۳۰۷" حذف کر دیا گیا ہے۔

۶۵۔ ''فرید وجدی نے ان کی بھی قلعی کھول دی'' کتاب میں یہ جملہ اس طرح تبدیل ہو گیا ہے: ''ہم ان کی بھی قلعی کھول دیتے ہیں۔''

اس جملے کے بعد کی عبارت ''اور بتلا دیا ہے ... تا ... کرتے ہیں۔'' کتاب میں حذف کر دی گئی ہے۔

۶۶۔ کتاب میں جملہ اس طرح ہے: ''ہم نے جو قول ... ''

۶۷۔ المرأۃ المسلمہ ص ۱۷

۶۸۔ اس مقام پر کتاب میں یہ جملہ زیادہ ہے: ''اس کے دماغ میں احساس اور تمیز کے مراکز مرد کے دماغ کی نسبت زیادہ بہتر ترتیب رکھتے ہیں۔''

۶۹۔ کتاب میں یہ جملہ ''چنانچہ فرید وجدی ... تا ... نقل کیا ہے۔'' اس طرح ہے: ''انسائیکلوپیڈیا میں پروفیسر ووقاریتی لکھتا ہے۔''

۷۰۔ المرأۃ المسلمہ ص ۳۶

۷۱۔ ''طبعی وظیفہ'' کی جگہ کتاب میں ''طبعی فرائض'' استعمال ہوا ہے۔

۷۲۔ اس مقام پر ''المرأۃ المسلمہ'' کی دوسری قسط مطبوعہ الندوہ بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۵ء ختم ہو جاتی ہے۔

اَلمراۃُ المُسْلمَہ

(۳)

رازِ درونِ پردہ، ز رندانِ مست پرس
کیں حال نیست صوفیِ عالی مقام را!

ارادہ نہیں تھا کہ اس ریویو کو رسالے کی حد تک پہنچا دیا جائے، لیکن بحث بڑھ گئی اور زیادہ کارآمد حصہ رہ گیا، اس لیے تیسرا نمبر پیش کر کے یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

دوسری بحث کے ہم نے دو حصے کیے تھے:

(الف) عورتوں کو اس وقت تک تعلیم سے محروم رکھا گیا، اس لیے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان میں علمی ترقی کی صلاحیت نہیں۔ (۱)

(ب) آج یورپ کی جدید تشریحی تحقیقات اور علم فزیالوجی نے ثابت کر دیا ہے کہ مرد اور عورت ہر حیثیت سے برابر ہیں۔

آزادیٔ نسواں کی حامی پارٹی نے اس وقت تک جس قدر دلائل جمع کیے ہیں، اگر ان کی تحلیل کی جائے تو آخر میں صرف یہی عروۃ الوثقیٰ دلیل رہ جائے گی، جو اوپر کی دو سطروں میں محدود کر دی گئی ہے۔

اگر تمھارے دوستوں میں کوئی شخص پردے کا مخالف اور آزادی کا حامی ہے، اگر اس خیال کے کسی نوجوان سے تم کو گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا ہے، تو اچھی طرح یاد کرو! بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ہوگا کہ یورپ کی نئی تحقیقات نے مرد اور عورت کو جسمی اور عقلی قوت کی ایک سطح پر پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا ہے۔ اس نے نہایت جوش میں بے باکانہ کہا ہوگا کہ مشرق کا یہ قدیم غاصبانہ خیال ہے کہ عورت مرد کی برابری نہیں کر سکتی، مگر آج یورپ نے اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیا اور

عورت کی اصلی صورت دنیا کو دکھا دی۔ اس نے بہت دلچسپ، موثر اور ہنگامہ خیز تقریر کی ہوگی، لیکن اس دعوے کے مرکز سے ایک انچ بھر نہ ہٹا ہوگا۔ اس کی تمام تقریر سے اور تمام دلیلیں، ایک تشریح طلب عبارت ہوگی، جس کی تفسیر میں وہ کئی گھنٹے سرگرمِ سخن رہا ہوگا۔ قاسم امین بک نے جب اس عنوان پر قلم اٹھایا، تو اس مرکز سے ہٹنے کی جرأت نہ کر سکا۔ المرأۃ الجدیدہ اور تحریر المرأۃ کی سیر کرو! جہاں تک مساویانہ حقوق کی فریاد ہے، اسی دلیل کے بل پر ہے۔ یہی وہ دعویٰ ہے، جس کے آگے پردے کی حامی جماعت دم بخود ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ مذہب کا زور دکھلایا جاتا ہے تو وہ بھی ناکام ہو کر الگ ہو جاتا ہے۔ یورپ کا قول اور حال زبان کی بے خبری نے چھپا دیا۔ اس لیے اتنی قوت نہیں کہ جستجو کی کوشش کریں اور دعوے کی صداقت کا سراغ لگائیں۔

لیکن فرید وجدی (۲) پر اس دعوے کا جادو اسی طرح ناکام رہا جس طرح مذہب کا معجزہ مخاطب جماعت کے لیے بے سود تھا۔ متعدد زبانوں کی واقفیت اور مذاق نے یورپ کا ذرہ ذرہ آئینہ کر دیا تھا، (۳) اس لیے جو کچھ مطلب کا دیکھا پیش کر دیا۔

گزشتہ نمبر (۴) میں ہم نے اس کا بڑا حصہ نقل کر دیا ہے۔ کیا ممکن ہے کہ اس کے پیش کر دینے کے بعد بھی اس دعوے کا طلسم ٹوٹ کر "ہباءً منثوراً" نہ ہو جائے؟ کہا جاتا ہے کہ یورپ نے مشرق کے قدیم پردۂ غفلت کو چاک کر دیا، لیکن گزشتہ نمبر (۵) اپنے سامنے رکھ لو اور منصفانہ کہو کہ کیا فرید وجدی (۶) نے مخالف پارٹی کے تیس برس کے پردۂ فریب کو چاک نہیں کر دیا!؟ علم تشریح، فزیالوجی، اور سائیکالوجی کے جلیل القدر علما نے یورپ کے جو اقوال پیش کیے ہیں، کیا ان کے مقابلے میں کسی کی جرأت ہے کہ پھر اس دعوے کا اعادہ کر سکے؟ کیا ان اقوال کے پیش کرنے کے بعد (۷) بھی اس دعوے میں کچھ جان باقی ہے؟ اگر ہے تو آؤ آج اس کا بھی فیصلہ کر دیں۔

ہمارے دوستوں کو آزادی کا شور مچاتے ہوئے کامل ایک قرن گزر گیا، لیکن اس عرصے میں کسی تعلیم یافتہ شخص نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یورپ کی منتخب جماعت کی آواز کہاں تک ان کی تائید کرتی ہے؟ ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ کی عام علمی معلومات سے قاسم امین بک کا دایرۂ علم بہت زیادہ وسیع ہے لیکن گزشتہ نمبر (۸) پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد کیا تم پر حیرت طاری نہیں ہو جاتی کہ جمہور کی اس بلند آواز سے کیوں کر اس باخبر شخص کی قوت سامعہ بے خبر رہی؟ یہ حیرت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ جب تم دیکھو گے کہ تشریحی اور فزیالوجی تحقیقات کے علاوہ عورت کے قدرتی

فرائض سے متعلق، اعاظم اور کبار علمائے یورپ کی کیا رائے ہے؟ کس طرح وہ عورتوں کو فطرۃً فرائض منزلی کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں اور کس طرح پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کا اپنے قدرتی فرائض کے باہر قدم نکالنا، دنیا کی تباہی ہے، تمدن کی بربادی ہے اور معاشرت کے لیے خوف ناک شگون ہے۔

قاسم امین بک نے اس دعوے کو جن اقوال علماء کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ پچھلے نمبر (۹) میں تمھاری نظروں سے گزر چکے ہیں۔ لیکن ایک اور موقع پر اس سے بھی زیادہ دھوکا دینے والی عبارت میں یہ خیال ظاہر کیا ہے اور دعویٰ کر دیا ہے کہ یورپ کی تمام علمی جماعت یا تو عورتوں کی موجودہ حریت پر قانع ہے یا موجودہ آزادی سے بھی زیادہ آزادی کی خواست گار ہے لیکن ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو آزادی کا مخالف ہو۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

> ”اسی بنا پر یورپ اور امریکہ میں جو لوگ انسانی ترقی کے طالب ہیں اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ عورت جس آزادی اور استقلال کے درجے تک پہنچ چکی ہے، اس سے بھی اور زیادہ درجۂ کمال (۱۰) کی طرف ترقی کرے۔ ان کی اصلی غرض دنیا کی اس قدیم جہالت پر جہاد کرنے کی یہ ہے کہ انسان کی یہ دونوں جنسیں ایک نظر سے دیکھی جائیں اور ان میں باہم کوئی فرق باقی نہ رہے چناں چہ آج کل یورپ اور امریکہ میں دو جماعتیں ہیں، جو اس مسئلے کے متعلق دو مختلف رائیں رکھتی ہیں۔
>
> پہلی جماعت اس آزادی اور حریت کو عورتوں کے لیے کافی سمجھتی ہے جو مغربی عورتوں نے اس زمانے میں حاصل کر لی ہے۔
>
> دوسری جماعت موجودہ حالت پر اکتفا نہیں کرتی اور اس سے زیادہ بہتر حالت کی طلب گار ہے۔ وہ اس کوشش میں ہے کہ عورتیں یہاں تک ترقی کریں کہ ان میں اور مردوں میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔“ (۱۱)

فرید وجدی اس کے جواب میں کہتا ہے کہ (۱۲) صرف اس قدر کہہ دینا کافی نہیں! ان لوگوں کے نام پیش کرنا چاہیے (۱۳) جو موجودہ آزادی پر قانع، یا کلی مساوات کے طلب گار ہیں کیوں کہ جو جماعت علم و فضل کے لحاظ سے آج یورپ میں اعلیٰ درجے کی جماعت تسلیم کی جاتی ہے

ان کی تصنیفات موجود ہیں۔ مساوات کا خواستگار ہونا ایک طرف، وہ موجودہ آزادی کو ایک خوف ناک تمدنی مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر یہ اصول پیش کیا ہے کہ اگر ایک شخص کسی خاص ملک کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ وہاں کے لوگ فلاں خیال یا عقیدے کو تسلیم نہیں کرتے اور مخاطب کو اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہو تو اس کا فیصلہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس ملک کے اعاظم اور جلیل القدر علما کی رائیں جمع کی جائیں اور دیکھا جائے کہ وہ رائیں اس دعوے کی تصدیق کرتی ہیں یا وہ خیال ان میں بالکل نہیں پایا جاتا؟

ہم نے اسی اصول کو پیش نظر رکھا اور مشاہیر علمائے یورپ کی تصنیفات کی ورق گردانی کی۔ ہم پر ثابت ہوا کہ ان کے متعلق یہ دعویٰ صحیح نہیں۔ ہم نے انسائیکلوپیڈیا کے اقوال پیش کیے جو علوم عصریہ اور علمائے یورپ کی رائیوں (۱۴) کا خلاصہ ہے۔ ہم نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اجوسٹ کونٹ (۱۵) پرودان، ژول سیمان، جیسے رؤسائے فلسفہ اور مستند علما کی شہادتیں نقل کیں جو آج یورپ میں آسمان علم کے آفتاب سمجھے جاتے ہیں۔

قاسم امین بک لکھتا ہے کہ یورپ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عورتوں کی موجودہ آزادی پر قناعت نہیں کرتے اور کلی آزادی کے طالب ہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ صرف اس مسئلے پر موقوف نہیں۔ یورپ تو دنیا بھر کے متضاد اور عجیب و غریب خیالات کا مخزن ہے۔ یورپ میں وہ لوگ بھی ہیں جو مذہب کے قدیم سلسلے کے مخالف ہیں، وہ بھی ہیں جو اباحت عامہ کے قائل ہیں اور ہر قسم کی انسانی خواہشوں اور ارادوں کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو تمدن و معاشرت کی تمام شاخوں (۱۶) کو فضول سمجھتے ہیں اور نظام حکومت کے دشمن ہیں۔ وہ بھی ہیں جو روحانیت کے خیال کو ایک خبط اور دہشت بتلاتے ہیں، تو کیا اہل مشرق پر واجب ہے کہ ہر قسم کی آواز جو سرزمین مغرب سے بلند ہو یا یورپ کی طرف منسوب ہو، اس کے آگے اطاعت اور تسلیم کا سر جھکا دیں؟

یورپ میں ہر خیال کے لوگ موجود ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کون سی جماعت علم و فضل کے لحاظ سے سربرآوردہ اور قابل اعتماد و استناد سمجھی جاتی ہے، کس گروہ کا قول علم اور عقل کے معیار پر ٹھیک اترتا ہے؟ ہم نے ان لوگوں کے اقوال منتخب کیے ہیں جن کو ملک نے موجودہ مدنیت کے مجدد، فلسفہ حسی کے افضل ترین عالم اور علوم عصریہ کے اعلیٰ ترین معلم تسلیم کر لیا ہے۔ جن کا قول علم و عقل کے موافق

ہے۔ ان کے مقابلے میں اگر چند غیر مستند لوگوں کے اقوال پیش بھی کیے جائیں تو ان کا کوئی اثر ہماری طبیعت قبول نہیں کر سکتی (۱۷)۔

اس کے بعد متعدد فصلوں میں عورتوں کے طبعی فرائض کے متعلق علمائے یورپ کے بے شمار اقوال نقل کیے ہیں اور اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر ان سے استدلال کیا ہے۔ جا بجا نہایت مفید اور بکثرت نتائج نکالے ہیں اور اول سے آخر تک طبعی اصول پر بحث کی ہے۔ ہم ایک خاص ترتیب سے (جس کی طوالت کا یہ دیباچہ متحمل ہو سکتا ہے) بعض سربرآوردہ مصنفوں کے اقوال یہاں درج کرتے ہیں۔ ہمارے آرٹیکل کا یہ حصہ آخری اور اس لیے نہایت اہم ہے، ناظرین اس کی اہمیت کو نظر اغماض سے نہ دیکھیں۔ (۱۸)

(۱۹) ...

قدرت نے نظام تمدن کے دو حصے کر دیے ہیں، فرائض منزلی اور فرائض تمدنی۔ پہلا کام عورت کے ذمے قرار دیا اور اس کو "ربۃ العائلۃ" بنایا۔ دوسرا کام مرد کے متعلق کیا اور اس کو تمدنی مملکت کا تاجدار بنایا۔ اس لیے درحقیقت قدرت نے مرد اور عورت کو دو علیحدہ حصوں میں منقسم نہیں کیا ہے بلکہ انسانی ضرورتوں پر نظر رکھتے ہوئے، دونوں کی مجموعی طاقت کو شخص کامل کی صورت میں مخلوق کیا ہے۔ مرد میں بذاتہ متعدد نقص ہیں جو کامل نہیں ہو سکتے، اگر عورت شریک حال نہ ہو۔ اسی طرح عورت میں بہت سے نقص ہیں جو مکمل نہیں ہو سکتے اگر مرد اس کی اعانت سے دست بردار ہو جائے۔ اس بنا پر مرد اور عورت عبارت ہیں ایک نوع کامل سے جن کی کوشش اور فرائض کی انجام دہی سے نظام تمدن قائم ہے۔ جو لوگ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ عورت کو درجۂ استقلال حاصل ہو جائے، ان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو آکسیجن اور ہائیڈروجن کی مجموعی طاقت کو ضائع کرنا چاہے اور اس خبط میں مبتلا ہو کہ ان میں سے کوئی ایک عنصر مستقل ہو جائے۔ حالانکہ آپ کو اس کا معلوم ہے کہ پانی عبارت ہے ان دونوں کی ترکیب اور مجموعی قوت سے۔ اگر یہ ممکن ہے کہ ان میں سے ایک عنصر دوسرے عنصر کی اعانت سے مستغنی ہو کر درجۂ استقلال حاصل کرے اور پانی کی حقیقت تکوین میں بھی فرق نہ آئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ عورت، مرد کے مشاغل میں شریک ہو جائے اور نظام تمدن بھی متزلزل نہ ہو، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ایسا ہونا محال قطعی ہے۔ جس طرح ہائیڈروجن کے مقابلے میں آکسیجن ثقل میں زیادہ ہے اسی طرح عورت

کے مقابلے میں مرد کی جنسی اور دماغی قوت زیادہ ہے۔ جس طرح ہیڈروجن کے ثقل کی زیادتی، پانی کی طبعی تکوین کی مخالف ہے، بعینہ اسی طرح عورت کا استقلال نظام تمدن اور معاشرت کی تشکیل کے لیے سم قاتل ہے۔

علوم مادیہ کا افضل ترین عالم یورپ کا سربرآوردہ مصنف ژول سیمان اپنے ایک مضمون میں، جو ریویو آف ریویوز میں شایع ہوا تھا، لکھتا ہے:

> ”عورت کو چاہیے کہ عورت رہے۔ ہاں! بے شک! عورت کو چاہیے کہ عورت رہے۔ اسی میں اس کے لیے فلاح ہے اور یہی وہ صفت ہے، جو اس کو سعادت کی منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ قدرت کا یہ قانون ہے اور قدرت کی یہ ہدایت ہے۔ اس لیے جس قدر عورت اس سے قریب ہوگی اس کی حقیقی قدر و منزلت بڑھے گی اور جس قدر دور ہوگی، اس کے مصایب ترقی کریں گے۔ بعض فلاسفر انسانی زندگی کو مکروہ اور پاکیزگی سے خالی سمجھتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ انسان کی زندگی دل فریب، پاک اور بے حد پاکیزہ ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت اپنے ان مدارج سے واقف ہو جائے جو قدرت نے اس کے لیے قرار دیے ہیں اور اپنے ان فرایض کو ادا کرے، جو قدرت نے اس کے متعلق کر دیے ہیں۔“

تم کو حیرت ہوگی کہ یہ عظیم الشان فلاسفر عورت رہنے کی کیوں تعلیم دیتا ہے؟ حال آں کہ کوئی عورت اپنے جنسی دایرے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ عورت عورت ہے اور مرد مرد! مگر یہ حیرت رفع ہو جائے گی جب تم کو معلوم ہوگا کہ عقلاے یورپ، یورپ کی عورتوں کو عورت تسلیم نہیں کرتے، کیوں کہ در حقیقت انھوں نے اپنے جنسی فرایض بھلا دیے ہیں اور اپنے طبعی دایرے سے باہر قدم نکالنا چاہتی ہیں۔ یہی عالم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

> ”جو عورت اپنے گھر سے باہر کی دنیا کے مشاغل میں شریک ہوتی ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ ایک ”عامل بسیط“ کا فرض انجام دیتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ عورت نہیں رہتی۔ (۲۰)“

مشہور مصنف پروفیسر جیوم فریرو (۲۱) نے ۱۸۹۵ء میں ایک مضمون لکھا تھا، جو ریویو آف ریویوز میں شایع ہوا۔ اس مضمون میں نہایت درد انگیز الفاظ میں ان عورتوں کی افسوس ناک حالت

کی تصویر کھینچی ہے، جو یورپ میں موجودہ آزادی سے متاثر ہو کر مردوں کے مشاغل میں شریک ہو گئی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ

> ''ان عورتوں کو معاشرت کے اصلی اصول زوجیت سے سخت نفرت ہے۔ قدرت نے جس غرض سے ان کو مخلوق کیا ہے اور جس کام کے لیے ان کو جسمانی اور دماغی اعضا عطا کیے ہیں، اس کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ ان میں وہ طبعی حاسہ اور جنسی امتیاز بالکل نہیں پایا جاتا جو ان کی ہم عمر عورتوں میں فطرتاً موجود ہے۔ ان کی حالت یک ایسے درجے تک پہنچ گئی ہے جس کو ماں خولیا سے تعبیر کرنا چاہیے۔ درحقیقت نہ ان کو مرد کہا جا سکتا ہے اور نہ وہ عورت ہیں، بلکہ یک تیسری جنس کا نمونہ بن گئی ہیں۔ اگر وہ مرد اس لیے نہیں ہیں کہ مردوں سے طبعاً اور ترکیباً مختلف الجنس ہیں تو عورت بھی اس لیے نہیں ہیں کہ ان کا عمل اور وظیفہ فریضۂ نسوانی سے بالکل مختلف ہے۔ جو علمائے یورپ اس عظیم الشان نقص مدنیت پر غور کر رہے ہیں، جو قوانین قدرت کے احکام کا منافی اور اس کے حدود کو توڑنے والا ہے اگر عورتوں کی یہ افسوس ناک حالت اسی طرح کچھ عرصے تک قائم رہی تو سمجھ لینا چاہیے کہ عن قریب سوسائٹی میں ایک عظیم الشان خلل پیدا ہونے والا ہے، جو تمدن اور معاشرت کی بنیادوں کو متزلزل کر دے گا۔ (۴۲)''

حیرت ہے کہ حریت کے طلب گار عورت کی غلامی کی فریادوں سے کنگرۂ عرش کو ہلانا چاہتے ہیں مگر اس پر غور نہیں کرتے کہ قدرت نے مرد کو عورت کا کس طرح محکوم اور غلام بنا دیا ہے؟ قدرت نے مرد کا فرض قرار دیا ہے کہ عورت کے تغذیہ اور آرام و راحت کے لیے خود (۴۳) کو تمدن کی مہلک موجوں میں ڈال دے اور جان کاہ صدمات برداشت کر کے بے حد کد و کوشش سے (۴۴) سمندر کی تہ تک پہنچے اور موتیوں کا خزانہ نکال کر عورت کے قدموں پر ڈال دے۔

اس سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ عورت کے فرضی وکیل اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ خود عورت کو اپنی طبعی ضروریات کا کفیل ہونا چاہیے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو کر خود (۴۵) کو سیاست اور تمدن کے مناقشات میں مبتلا کر دینا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت پر یہ ظلم اور بے حد ظلم نہیں ہے کہ ایک طرف فرائض منزلی اور بقائے نوع انسانی کا اس کو ذمے دار قرار دیا

جائے؟ اور دوسری طرف تحقیق جرائم اور تلاش معاش کا بھی اس پر بار ڈالا جائے؟ کیا یہ غلطی نہیں ہے کہ مرد اپنا کام بھی عورتوں کے سپرد کر کے طبعی فرائض کی انجام دہی سے سبکدوش ہو جائیں اور عورت کو فرائض منزلی کے ساتھ تمدن و سیاست کے انتظام و اہتمام کا بھی ذمہ دار قرار دیں؟ غور سے دیکھو! انصاف یہ ہے کہ عورت کو اس کے فرائض طبعی کے میدان میں آزاد اور مطلق چھوڑ دیا جائے اور وہ اس کام کو اطمینان اور راحت کے ساتھ انجام دے جس کی صلاحیت اور قدرت فطرت نے اس کو عطا فرمائی ہے۔ ساتھ ہی اس کشاکش سے محفوظ رہے جس کی صلاحیت اور قابلیت سے فطرت نے اس کو محروم رکھا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر تمدنی ترقی اور کمال انسانی کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ عورت استقلال اور تمام آزادی کے درجے تک صعود کر جائے اور مردوں کے مشاغل میں شریک ہو جائے تو اس بنا پر کوئی بعید نہیں کہ وحشی ممالک کو دنیا کا اعلیٰ ترین متمدن حصہ قرار دیا جائے! وہاں مرد خالی الذہن اور غیر مکلف ہوتا ہے۔ تمام کام صرف عورتیں کرتی ہیں!

درحقیقت خود قدرت اس الزام کی ذمہ دار ہے کہ کیوں عورتوں کو نظام تمدن میں کافی حصہ نہیں دیا۔ عورت کی فطرت، داخلی اور خارجی اعضا کی سر سے پیر تک کی مجموعی ہیئت صاف صاف بتلا رہی ہے کہ وہ اس کام کے لیے ہرگز مخلوق نہیں کی گئی ہے جس کو عورت کے فرض و تکلیف کے لیے تجویز کر رہے ہیں۔ یورپ کے وہ عالم جو فلسفۂ حسی کے مجدد، اعلیٰ ترین مصنف اور فلسفۂ جدیدہ کے مسلّم ارکان ہیں، پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ عورت کو گھر سے باہر کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اس کا کام نوع انسانی کی حفاظت اور صرف فرائض منزلی کو انجام دینا ہے۔ مگر افسوس!

گوشِ سخن شنو کجا! دیدۂ اعتبار کو!

مشہور اقتصادی فلاسفر (۲۶) علامہ پرودن اپنی قابل قدر کتاب ابتکار النظام میں لکھتا ہے:

> ”عورت کو تمدن انسانی میں قدرت نے بالکل حصہ نہیں دیا۔ وہ علم کا راستہ طے کرنا چاہتی ہے، مگر علم اس سے مساعدت نہیں کرتا! اسی کا نتیجہ ہے کہ خوفناک نتائج کے ظہور پذیر ہونے کے ہم متوقع ہیں۔ نوع انسانی عورت کی کسی علمی اختراع یا صناعی، ایجاد یا اخلاقی اور سیاسی کوششوں کی ہرگز ممنون نہیں ہے (۲۷)۔“

بلکہ مرد ہی ایک ایسی ذات ہے جو خود اختراع کرتی ہے، تکمیل تک پہنچاتی ہے، اس پر عمل کرتی ہے، اس سے نتائج پیدا کرتی ہے اور عورت کے تغذیے اور آرام و راحت کا انتظام کرتی ہے۔ (۲۸)

فلسفۂ حسی کا موسس، اصولِ نظامِ تمدن کا بانی، استاذ الاساتذہ اجوسٹ کونٹ اپنی مشہور تصنیف "النظام السیاسی علی حسب الفلسفۃ الحسیہ" میں لکھتا ہے:

> "ہمارے زمانے میں جو کوششیں عورتوں کی آزادی کے لیے کی جا رہی ہیں، وہ درحقیقت خیالی گمراہی ہے۔ قدرت کے طبعی قانون نے عورتوں کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود کر دیا ہے اور ہزار کوشش کی جائے مگر اس میں تغیر نہیں ہو سکتا۔" (۲۹)

انسان پر موقوف نہیں، دنیا میں جتنی چیزیں مخلوق کی گئی ہیں سب میں جنسی امتیاز پایا جاتا ہے۔ قوت فاعلہ اور قوت منفعلہ کی مشترک حالت دنیا کا نظام تمدن قائم رکھتی ہے۔ اس بنا پر عورت کا استقلال اور تمدنی دنیا کی شرکت، یہ مفہوم رکھتی ہے کہ قوت منفعلہ سے قوت فاعلہ کا کام لیا جائے اور قدرت نے جو نظام مقرر کر دیا ہے اس میں تغیر اور رد و بدل کیا جائے، **ومن یتعد حدود اللہ فقد ظلم نفسہ۔** (۳۰) یہی فیلسوف اعظم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

> "مردوں کے مشاغل میں عورتوں کی شرکت سے جو خوفناک نتائج اور فساد پیدا ہو رہے ہیں ان کا علاج یہی ہے کہ صاف صاف بتلا دیا جائے کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) اور جنس محب (عورت) کے مادی فرائض کیا ہیں؟" (۳۱)
>
> "مرد پر واجب ہے کہ عورت کے تغذیے کا انتظام کرے یہی وہ قانون طبعی اور ناموس الٰہی ہے جو جنس محب کی اصلی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود کرتا ہے۔ یہی وہ قاعدہ ہے جو ہیئت اجتماعی کے خوفناک اور مہیب اشکال کو احسن اور اکمل کر دیتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جو عورت کو اپنے طبعی جذبات سے ترقی نوع انسانی جیسے شریف فرض کی بجا آوری پر آمادہ کرتا ہے۔ پس وہ تمام مادی ترقی اور علمی کمال جو عورت کی موجودہ حالت ہم سے طلب کر رہی ہے، محال قطعی اور محض ناممکن ہے، کیوں کہ اس ناموس الٰہی اور قانون طبعی سے منطبق نہیں ہو سکتی اور

> چوں کہ یہ خواہش ناموس الٰہی کی مخالف ہے اور اس کے حکم کو رد کرنا چاہتی ہے، اس لیے اس طبعی جرم کے اثر سے سوسائٹی کا کوئی علاقہ اور حصہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔“ (۳۲)

”سموئیل سمائلس“ انیسویں صدی کا مشہور عالم اور انگلستان کے جدید تمدنی دور کا مسلم موسس ہے، جس کی اخلاقی تصنیفات آج یورپ کے تعلیمی نصاب کا ایک ضروری جزو سمجھی جاتی ہیں۔ یورپ کے تمام افاضل اور علما شہادت دے چکے ہیں کہ انیسویں صدی میں اہم تمام مصنفین میں ”سمائلس“ اخلاق کا سرخیل اور بزرگ ترین مصنف ہے۔ اس سے بڑھ کر مقبولیت کیا ہو سکتی ہے کہ علمی اور اخلاقی سوسائٹی کی طرح مذہبی سوسائٹی بھی اس کی تصنیفات کو بائبل کا ہم پلہ تسلیم کرتی ہے اور اس الماری کو منحوس سمجھتی ہے جس میں سمائلس کی تصنیفات کو جگہ نہ دی گئی ہو۔ یہی عالی دماغ اخلاقی فلاسفر اپنی گراں بہا تصنیف ”الاخلاق“ میں انگلستان کی آزاد عورتوں کی حالت پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> ”قدیم اہل روما کے نزدیک شریف اور ”ربۃ العائلہ“ عورت کی سب سے زیادہ قابل تعریف اور اعلیٰ درجے کی قابل مدح بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھنے والی اور گھر سے باہر کی کشمکش سے محفوظ ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی کہا جاتا ہے کہ عورت پر جغرافیے کی تعلیم اس لیے واجب ہے کہ وہ اپنے گھر میں مناسب رخ اور صحیح سمت میں کھڑکیاں بنوا سکے اور علم کیمسٹری کی تحصیل اس لیے فرض ہے کہ جوش کی حالت میں دیگچی کی حفاظت کر سکے، کیوں کہ لارڈ بائرن باوجود اس میلان اور رغبت کے، جو اس کو عورتوں کی طرف تھی، یہ رائے رکھتا تھا کہ عورتوں کے کتب خانے میں بائبل اور طباخی کی کتب کے سوا اور کوئی کتاب نہیں ہونی چاہیے۔ مگر یہ رائے عورتوں کے اخلاق اور تہذیب کے لحاظ سے غیر معقول اور ان کی ترقی میں ایک رکاوٹ سمجھی جاتی ہے۔“

قدیم اہل روما اور لارڈ بائرن کی رائے لکھ کر جس کا درحقیقت وہ مؤید اور حامی ہے۔ عورتوں کی آزادی اور تعلیم کے متعلق یورپ کی عام رائے نقل کرتا ہے اور اس کو ایک جنون اور مدنیت کے لیے بے حد مضر قرار دیتا ہے:

> ''اس رائے کی مخالف ایک اور رائے ہے جو آج تمام یورپ میں شائع اور عام ہو رہی ہے۔ اہل روما اور لارڈ بائرن کی رائے اگر عورتوں کی تہذیبی اور اخلاقی ترقی کے لیے مضر سمجھی جاتی ہے تو درحقیقت اس دوسری رائے کو دیوانگی اور خبط سمجھنا چاہیے کیوں کہ نظام طبیعت پر منطبق نہیں ہوتی۔ اس رائے کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو اس قدر مہذب بنایا جائے اور تعلیم سے آراستہ کیا جائے کہ اس میں اور مرد میں سوائے جنسی امتیاز کے اور کوئی فرق باقی نہ رہے اور حقوق سیاسی و علمی کے لحاظ سے مرد اور عورت بالکل مساوی درجے میں سمجھے جائیں۔ (۳۳)''

قدرت نے مرد کو عورت پر فوقیت دی ہے۔ اس لیے عورت کا فرض ہے کہ وہ مرد کی حمایت میں رہے۔ اگر مرد کی حمایت اور فوقیت عورت کے لیے غلامی ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ عورت کو اس غلامی سے کبھی نجات نہیں مل سکتی۔ قدرت دنیا کی آسائش اور انتظام پر نظر رکھتی ہے، ہماری تمھاری رایوں پر نظر نہیں رکھتی۔ وہ تمھاری رائے کی تابع ہو کر کیوں عورت کو مستقل اور آزاد کر دے؟ جب کہ اس کا استقلال دنیا کے لیے اور دنیا کے تمدن کے لیے ایک خوف ناک بربادی ہو؟ اس لیے بیکار اور (۳۴) فضول شور و غل سے دست بردار ہو کر غور اور فکر کی نظر ڈالو! دیکھو کہ نظام تمدن میں عورتوں کو کیا مرتبہ دیا گیا ہے؟ دنیا کس درجے ان کی محتاج ہے؟ اور کس امر میں محتاج ہے۔ خود مردوں کے فرائض کیا ہیں؟ دنیا میں اس وقت تک عورتوں کو کہاں تک تمدن میں شریک کیا گیا اور اب کہاں تک شریک ہیں؟ پھر جو کچھ علم و عقل کا فیصلہ ہو، اس پر شاکر ہو کر بیٹھ رہو! (۳۵) کیوں کہ قدرت کے قانون میں تغیر ممکن نہیں ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (۳۶)

مشہور اشتراکی فلاسفر (۳۷) فیلسوف اعظم علامہ پرودون ابتکار النظام میں لکھتا ہے:

> ''سوسائٹی کی تکوین درحقیقت ان تین عنصروں سے ہوتی ہے: علم، عمل، عدالت، اب دیکھو کہ مرد اور عورت کا ان عناصر ثلاثہ میں کس درجے حصہ ہے اور باہم کس قدر متفاوت ہیں۔ نظام تمدن ہم کو بتلاتا ہے کہ علم و عمل و عدالت کے لحاظ سے مرد اور عورت میں وہ نسبت ہے جو ۳×۳×۳ کو ۲×۲×۲ سے ہوتی ہے۔ یعنی (۲۷) اور (۸) کی نسبت ہے۔ اس لیے جو لوگ عورتوں کے لیے آزادی اور استقلال کے طالب ہیں، وہ درحقیقت عورتوں کو شقاوت کے قید خانے میں مقید

> کرنا چاہتے ہیں وہ قید خانہ جو مفروضہ عبودیت کے قید خانے سے کچھ کم نہیں ہے۔ پس مرد اور عورت میں مساوات سخت مردود اور ایک قبیح خیال ہے، جو زوجیت کے سلسلے کو روکنے والا رعیت کو ہلاک کرنے والا اور نوع انسانی کے لیے آفت اور سخت آفت ہے۔ (۳۸)"

لطف یہ ہے کہ قاسم امین بک اور اس کے ہم خیال حضرات تربیت اطفال کو ایک نہایت اہم فرض قرار دیتے ہیں مگر ساتھ ہی آزادی اور استقلال کی فریاد بھی بلند کرتے ہیں۔ قاسم امین بک لکھتا ہے:

> "جمہور کا خیال یہ ہے کہ اطفال کی تربیت ایک معمولی کام ہے، جس کو ایک جاہل عورت بھی اچھی طرح انجام دے سکتی ہے۔ مگر جو لوگ فطرت انسانی سے واقف ہیں اور علم کے زیور سے آراستہ، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شئون انسانیہ میں سے کوئی شے اس قدر اہم نہیں ہے اور دنیا کے تمام علمی اور تمدنی کاموں میں سے کوئی کام اس قدر دشوار نہیں ہے، جس قدر بچوں کی تربیت اور صحیح تربیت ہے۔ انسان کی تمام علمی اور اخلاقی خوبیوں کا دارومدار محض اس تربیت پر ہے، جو عالم طفولیت میں ماں کی توجہ سے انسان حاصل کرتا ہے اور انسان کی علمی ترقی اور اخلاقی کمال کا حقیقی سرچشمہ وہ قصیر زمانہ ہے، جب وہ اپنی ابتدائی عمر میں قدرت کے مقرر کیے ہوئے شفیق معلم سے صحیفۂ فضل و کمال کے دیباچے کا درس حاصل کرتا ہے۔ علمی حیثیت سے دیکھو کہ تربیت اور صحیح تربیت ان تمام علوم کی محتاج ہے، جن کے ذریعے سے انسان کے جسمانی اور روحانی نشو ونما کے قوانین سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ محنت اور توجہ کے لحاظ سے تربیت ہی ایک ایسی چیز ہے، جس میں بے انتہا صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ یوم ولادت سے سن بلوغ تک بچے کی نگہداشت کرنی، صبر اور تحمل سے اپنی کوشش اور توجہ کے نتائج کا انتظار کرنا اور تقریباً چودہ پندرہ برس کا طول طویل زمانہ اسی کوشش میں بسر کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ (۳۹)"

لیکن سوال یہ ہے کہ جس عورت کے طبعی فرائض میں ایسا اہم اور دشوار محتاج علوم و مشقت

کام داخل ہے، کیا وہ دنیا کے سیاسی اور علمی جھگڑوں میں بھی حصہ لے سکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ تربیت اطفال بے انتہا مشکل اور غیر معمولی توجہ کی محتاج ہے، لیکن کیا اس کی اہمیت اور دشواری اس امر کے لیے مستلزم ہے کہ انتظام حکومت اور سیاسی مناقشات کے انفصال کا بار بھی اس مظلوم اور مسکین عورت پر ڈالا جائے؟ تم کہتے ہو کہ عورت کی آزادی مردوں نے چھین لی ہے، ظلم وستم کا عادی بنا دیا ہے، لیکن سچ سچ بتلاؤ، عورت کو تمدن کی کشمکش سے محفوظ رکھنا اور اس امر کا موقع دینا کہ فرائض تربیت کی انجام دہی میں منہمک رہے، انصاف اور حقیقی انصاف ہے یا تربیت جیسی اہم اور مشکل ذمے داریوں کے ساتھ سیاسی اور تمدنی انتظام کا بھی ذمے دار بنانا انصاف اور خالص انصاف ہے؟

تم کہتے ہو کہ ہم انصاف نہیں کرتے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ تم عدالت سے کوسوں دور ہو، مرد کے فرائض کا بار بھی غریب عورت کے سر ڈالنا غلامی نہیں ہے، مگر عورت کو اس ناواجب اور خلاف احکام قدرت بوجھ سے بچانا ظلم اور انصاف سے بعید ہے؟ تم کہتے ہو کہ تربیت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی کام اہم اور دشوار نہیں۔ پھر کیوں عورت کو اس امر کا موقع نہیں دیتے کہ وہ اس اہم اور دشوار کام کو تعلیم قدرت کے مطابق انجام دے؟

حقیقت یہ ہے کہ تم اگرچہ عورتوں کی وکالت کا دعویٰ کرتے ہو، مگر تمھاری وکالت غریب عورتوں کے لیے تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے، ہم ہیں عورتوں کے حقیقی اور سچے حامی کہ پکار پکار کر ان کو سمجھا رہے ہیں کہ قدرت اور قدرت کے قانون نے تم کو جس دائرے میں محدود کر دیا ہے، اے غریب اور شریف عورتو! اس دائرے سے باہر قدم نکالنے کی مجرم مت بنو!

قاسم امین بک نے امریکہ کے ایک چیف جسٹس کا قول نقل کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے کہ خارجی مشاغل عورت کے منزلی فرائض میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

> ”عام مشاغل اور گھر سے باہر کی زندگی عورت کے منزلی فرائض پر مؤثر نہیں ہو سکتی، وہ مشاغل عمومی میں بھی مشغول رہ سکتی ہے اور ساتھ ہی اس کے منزلی فرائض بھی انجام پا سکتے ہیں، چناں چہ میں نے اس وقت تک اس قسم کی کوئی خبر نہیں سنی کہ کوئی شخص اپنی بیوی کا اس لیے شاکی ہوا ہو کہ وہ مصالح عامہ میں بھی

شریک ہے۔" (۴۰)

قاسم امین بک (۴۱) سے اور اس کے ہم خیال مصلحوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا امریکہ کے جج کا قول صحیح ہے؟ اور کیا یہ بھی صحیح ہے کہ تم تربیت اطفال کو ایک مشکل اور محتاج مشقت کام سمجھتے ہو؟ کیا ممکن ہے کہ ایک شخص اول الذکر رائے کو صحیح تسلیم کر کے، آخر الذکر رائے کی صحت کا بھی اعتراف کرے؟ کیا ممکن ہے کہ دو اور دو پانچ بھی ہوں اور دو اور دو چار بھی؟ جواب کی امید نہیں! اس لیے ہم خود جواب دیتے ہیں کہ یہ سب ممکن ہے۔ اگر یہ ممکن ہو کہ فطرت کے قوانین منسوخ ہو جائیں، اگر یہ ممکن ہو کہ خدا کے قرار دیے ہوئے فرائض بدل جائیں، اگر یہ ممکن ہو کہ مغرب مشرق ہو جائے اور جنوب شمال فطرة الله التي فطر الناس عليها لاتبديل لخلق الله (۴۲)

قاسم امین بک لکھتا ہے کہ

"ابتدائے تخلیق عالم سے اس وقت تک کی مجمل تاریخ عورت کی یہ ہے کہ اس پر چار دور گزرے ہیں،

دور اول میں انسان بالکل ابتدائی حالت میں تھا، اس لیے عورت حر مطلق اور بالکل آزاد تھی۔

پھر عائلہ (۴۳) کی تشکیل ہوئی، عورت کے بنیے یہ دوسرا دور تھا، اس دور میں آ کر عورت استعباد اور مردوں کی غلامی میں مبتلا ہوگئی اور اس کی فطری حریت مردوں نے چھین لی۔ اس کے بعد

تیسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں انسانی حالت نے کمال کی طرف ترقی کی اور تمدنی اثر آہستہ آہستہ پھیلنے لگا۔ اس لیے عورت کی غلامی نے ایک کروٹ لی اور اس کے حقوق کی طرف توجہ ہوئی لیکن مرد کی خود غرضی نے پسند نہیں کیا کہ عورت کے جن حقوق کو اس نے تسلیم کیا ہے، ان سے فائدہ اٹھانے کا اس کو موقع دے، لیکن

چوتھے دور میں جب تمدن درجہ کمال کو پہنچا اور فطرت کے بخشے ہوئے حقوق پر متمدن انسان کو توجہ ہوئی، تو عورت کی حریت تامہ کو مردوں نے تسلیم کر لیا اور مرد اور عورت کا درجہ مساوی ہو گیا۔

یہ ہے عورت کی مجمل تاریخ اور تمدن عالم کے ادوار اربعہ" (۴۴)

فاضل مصنف نے عورتوں کی مجمل تاریخ بیان کر دی، مگر یہ نہیں بتلایا کہ دور اول میں وہ کس طرح آزاد تھی؟ اور دور دوم میں کس طرح استعباد اور غلامی پر راضی ہو گئی؟ عائلہ کی تشکیل کے ساتھ ہی عورت کا ابتدائی استقلال کیوں مفقود ہو گیا؟ اور کیوں مردوں کی غلامی سے اس نے خود (۴۵) کو آزاد نہیں کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہیں، جن پر غور کرنے کی اگر قاسم امین بک تکلیف گوارا کرتا، تو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان میں سے ہر ایک دور کے لیے ایسے اسباب اور لوازم تھے، جن سے عورت کسی حالت میں بچ نہیں سکتی تھی۔ لیکن ہم اس بحث سے الگ ہو کر صرف پہلے سوال کو دہرانا چاہتے ہیں کہ دور اول میں عورت کا کیا حال تھا اور اس کی حریت اور استقلال کی کیا صورت تھی؟ کیوں کہ جب دور اول زمانہ آزادی تھا۔ اور دور دوم میں عورت گرفتار استعباد ہو گئی اور اب پھر آزادی اور استقلال کی طالب ہوئی تو ہم کو تلاش کرنا چاہیے کہ دور اول میں عورت کی کیا حالت تھی؟ تا کہ معلوم ہو جائے کہ اب پھر اسی حالت کو تم عورتوں کے لیے پسند کرتے ہو!

انیسویں صدی کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے:

> "یہاں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا پہلا زمانہ وہ زمانہ تھا، جب عائلہ کی بنا نہیں پڑی تھی۔ اور عورت تمام قیود سے آزاد اور استقلال کے آخری درجے تک پہنچی ہوئی تھی، مگر اس استقلال کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی حالت انتہائی درجے کی حقیر اور ذلیل تھی اور اس کی بے حد اہانت کی جاتی تھی۔ لیکن جب عائلہ کی بنیاد پڑی تو عورت کی حالت میں تغیر ہوا اور بالکل ایک نئی قسم کی حالت شروع ہوئی، کیوں کہ عائلہ کے دائرے میں قدم رکھتے ہی درجۂ استقلال سے یکایک گر پڑی اور تقییدات میں مبتلا ہو گئی، مگر اس کے مقابلے میں ایک معنوی درجہ اس نے حاصل کیا جو اس سے پیشتر مفقود تھا۔ (۴۶)

اس سے معلوم ہوا کہ عورت دور اول میں اگرچہ آزاد اور مستقل تھی، لیکن اس کی حقیر حالت اور ذلت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ جس سے زیادہ حقارت اور ذلت نہیں ہو سکتی۔ پھر عائلہ کی تشکیل سے استقلال مفقود ہو گیا لیکن ایک ایسا معنوی درجہ حاصل کیا جو اس سے پیشتر اس کو میسر نہ تھا۔ عورتوں کے فرضی وکیل اس کوشش میں ہیں کہ پھر آزادی اور استقلال کے درجے پر عورت صعود کر

جائے (۴۷) جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورت کو معنوی درجہ چھوڑ کر ذلت اور حقارت کا درجہ حاصل کرنا چاہیے۔ پس اگر یہ خیال صحیح ہے، تو ہم سد راہ ہونے کی تکلیف گوارا کرنا نہیں چاہتے۔ قدیم وحشت اور حیوانی حالت کا شوق ہے تو چھوڑ دو مدنیت کو، یا دوسرے لفظوں میں ترک کر دو انسانیت کو اور پھر عورت کو اس وحشت کے میدان کی سیر کرا دو، جس سے آزاد ہو کر اس نے معنوی درجہ کمال و مدنیت حاصل کیا تھا۔

اسلام اور اسلام کی خالص مدنیت نے عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا، وہ ایک منصف مورخ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ آج یورپ میں حد اعتدال سے گزری ہوئی آزادی نسواں نے جو نتائج پیدا کیے ہیں، ان کو دیکھ کر یورپ کے افاضل وہی طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں، جو اب سے تیرہ سو برس پیشتر اسلام نے دنیا کو بتلایا تھا۔ اگر مسلمان اسلام کے مجموعہ تعلیم و ہدایت میں عورتوں کی حریت یا عدم حریت کے مناقشے کا قول فیصل تلاش کریں اور ڈھونڈیں کہ اسلام نے عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، کہاں تک اس کو آزادی دی ہے، کس درجے تک اس کے حقوق تسلیم کیے ہیں؟ غلامی اور مفرط آزادی کی خرابیوں کا کیوں کر علاج کیا ہے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی تعلیم سے مستغنی ہو جائیں۔ ہمارے آرٹیکل (۴۸) کا موضوع اس بحث میں قدم نہیں رکھ سکتا، ورنہ ہم دعوے کے ساتھ اسلام کے فیصلے کو پیش کرتے اور بتلاتے کہ دنیا کے تمام بنائے ہوئے قانون اور انسان کے تمام بنائے ہوئے طریقے، اس الٰہی اور روحانی قانون کے آگے ہیچ ہیں۔ مگر یہاں ہم صرف اتنا بتلانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے اس محتاج عورت کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، جس کا شوہر دنیا سے کوچ کر چکا ہو اور کوئی محافظ اور کفیل نہ ہو۔ کیا اس کو گھر سے باہر کی زندگی میں قدم رکھنا چاہیے اور کیا اس کو اپنی معاش کا انتظام خود اپنے ہاتھوں انجام دینا چاہیے؟ یا اس کے لیے کسی دوسری صورت کا انتظام ہونا چاہیے؟

درحقیقت یہ ایک ضروری سوال ہے۔ قاسم امین بک نے بھی اس کو پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس صورت میں عورت گھر سے باہر نکل کر اپنی ضروریات کے انتظام کرنے پر مجبور ہے اور لامحالہ اس کو آزادی اور استقلال کی اجازت دے کر منزلی دائرے میں محدود رہنے کے قانون کو توڑنا پڑے گا۔ اسلام نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے، وہ آج ہم یورپ کے مشاہیر عقلا کی زبانی سن رہے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کی محتاج اور لاوارث عورتوں کی ضروریات کا انتظام

مسلمانوں کو بیت المال سے کرنا چاہیے۔ بیت المال مسلمانوں کا مشترکہ فنڈ ہے جو امیر وقت کی نگرانی میں ہمیشہ اس قسم کے محتاجوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ پس اسلام نے سوسائٹی یا قوم پر محتاج عورتوں کی امداد واجب کردی ہے (۴۹) تاکہ معاش کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر عورت کو منزلی دائرے سے باہر قدم نہ نکالنا پڑے۔ یورپ کے دانش مند اکابر آج اسی تعلیم پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ گورنمنٹ ان عورتوں کے نفقات کا انتظام قومی فنڈ سے کرے۔ علامہ جوسٹ کونٹ (۵۰) انتظام السیاسی میں لکھتا ہے:

> ”شوہر یا کسی اور قریبی رشتے دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ عورت کی ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے، تاکہ معاش کی ضرورت سے مجبور ہو کر اسے گھر سے باہر کی زندگی میں خود کو مبتلا نہ کرنا پڑے، کیوں کہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو منزلی دائرے میں محدود رہنا چاہیے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اس کو جس دائرے میں محدود کردیا ہے، اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔

ہمارا ارادہ تھا کہ ریویو کو اس نمبر پر ختم کردالیں، مگر ابھی ایک ضروری بحث باقی ہے، یعنی یورپ میں درحقیقت متمدن عورتوں کا کیا حال ہے؟ آزادی ان کو ترقی کی طرف لے جا رہی ہے یا تنزل کی طرف؟ مگر مضمون کو یہاں ختم کر دیتے ہیں۔ آئندہ نمبر میں ایک مستقل عنوان سے اس پر نظر ڈالیں گے۔“

ابوالکلام آزاد دہلوی

ندوہ۔ لکھنؤ (۵۱)

حواشی

۱۔ کتاب میں "[illegible] اردو میں تھا" سے "[illegible] صاحب" تک ان سطروں کو حذف کر دیا ہے۔

۲۔ "کیا فرید وجدی پر" کے بجائے کتاب میں "الکیمی [illegible]" ہے۔

۳۔ "مشہور باتوں کی واقفیت [illegible] آخر رہتی تھی" اس جملے کی جگہ کتاب میں یہ جملہ ہے "یورپ کے مشاہیر علماء کی [illegible] پیش نظر تھیں۔"

۴۔ [illegible] "[illegible] فصل" ہو گیا ہے۔

۵۔ یہاں بھی [illegible] "[illegible] فصل" ہو گیا ہے۔

۶۔ "فرید وجدی" [illegible] "[illegible]" ہو گیا ہے۔

۷۔ جملہ "[illegible] کے بعد" کتاب میں "[illegible] کے بعد" ہو گیا ہے۔

۸۔ [illegible] "[illegible] فصل" سے بدل گیا ہے۔

۹۔ "[illegible]" کی جگہ "[illegible] فصل" نے لے لی ہے۔

۱۰۔ یہ جملہ کتاب میں "[illegible] کمال" ہو گیا ہے۔

۱۱۔ ملاحظہ ہو [illegible]

۱۲۔ "فرید وجدی اس کے جواب میں کہتے ہیں" اس پورے جملے کی جگہ کتاب میں صرف ایک لفظ "الکیمی" نے لے لی ہے۔

۱۳۔ "[illegible] چاہیے" کتاب میں یہ جملہ "[illegible] کیا جا سکتا" سے بدل دیا گیا ہے۔

۱۴۔ "[illegible]" کی جگہ کتاب میں "[illegible]" ہے۔

۱۵۔ کتاب میں اس مصنف کے نام کا املا "[illegible]" ہے۔

۱۶۔ کتاب میں "[illegible]" کی بجائے "خوش خوانی" ہے۔ میرا خیال ہے کہ "[illegible]" ہی درست ہے۔ اس لیے کہ خوش خوانی کا مفہوم [illegible] کے نظریے میں پہلے سے موجود ہے۔

۱۷۔ المرأۃ الجدیدہ ص ۵۵

۱۸۔ یہ پیراگراف "[illegible] کے بعد" سے شروع ہو کر "[illegible] سے تدریجی" پر ختم ہوتا ہے، کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔

۱۹۔ کتاب میں اس مقام سے "عورتوں کی آزادی اور [illegible] کے متعلق علمائے یورپ کا فیصلہ" کے زیر عنوان نئی بحث شروع ہوتی ہے۔

۲۰۔ المرأۃ المسلمہ ص ۲۱

۲۱۔ کتاب میں پروفیسر جیوم فریرو کے نام کے بعد اس کے تعارف میں مولانا نے قوسین میں ایک جملے کا اضافہ کیا ہے وہ جملہ یہ ہے: ’’جو اطوار انسانی کا مشہور نقاد ہے۔‘‘

۲۲۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۳۸

۲۳۔ کتاب میں ’’خود‘‘ کی جگہ ’’آپ‘‘ ہے۔

۲۴۔ کتاب میں اس جملے ’’بے حد کروکوشش سے‘‘ کو نکال دیا ہے۔

۲۵۔ کتاب میں ’’خود‘‘ کی جگہ ’’آپ‘‘ نے لے لی ہے۔

۲۶۔ کتاب میں ’’اقتصادی فلاسفر‘‘ کے بجائے ’’سوشلسٹ فلاسفر‘‘ کی ترکیب استعمال کی ہے۔

۲۷۔ اس مقام پر کتاب میں یہ عبارت زیادہ ہے: ’’وہ علم کی شاہراہ پر بغیر عورت کی مساعدت کے چلی ہے اور اس نے خود ہی حیرت انگیز عجائبات ظاہر کیے ہیں۔‘‘

۲۸۔ مصنف المرأۃ المسلمہ نے عربی اور انگریزی کتابوں کے ناموں کا اپنے طور پر ترجمہ کر لیا ہے۔ ہم نے بھی انھیں کی نقل پر اکتفا کیا۔

۲۹۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۱۹

اسی مقام پر اسی مصنف کا جو اقتباس کتاب میں درج کیا گیا ہے، وہ اس سے قدرے مختلف اور طویل ہے۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

> ’’جس طرح ہمارے زمانے میں عورتوں کی سوشل حالت کے متعلق خیالی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں، اسی طرح تغیر نظام تمدن اور آداب معاشرت کے ہر ایک دور میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ مگر وہ لاز آف نیچر جو جنس محب (عورت) کو منزلی زندگی کے لیے مخصوص رکھتا ہے، اس میں کبھی کوئی اہم تغیر واقع نہیں ہوا۔ یہ قانون الٰہی درجہ صحیح اور محقق ہے کہ گو اس کی مخالفت میں سیکڑوں باطل خیالات قائم ہوتے رہے مگر یہ بغیر کسی تغیر یا نقصان کے سب پر غالب آتا رہا۔‘‘

۳۰۔ قرآن حکیم کی سورۂ احقاف (۴۶) کی آیت نمبر ۱ کا ٹکڑا

۳۱۔ المرأۃ المسلمہ: ص ۸۷۔ اس اقتباس کے آخری خط کشیدہ جملے اپنی تالیف اور تفصیل میں کتاب میں مختلف ہیں۔ اس لیے انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے: ’’ان کا علاج یہی ہے کہ دنیا میں جنس عامل (مرد) پر جنس محب (عورت) کے جو مادی فرائض ہیں، ان کی حد بندی اور تعیین کر دی جائے۔‘‘

اس اقتباس کے بعد کتاب میں اس مقام ’’سموئیل سمائلس‘‘ کے بارے میں مولانا ابو الکلام نے ذیل کے چند جملوں کا اضافہ کیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

> ’’تم جانتے ہو کہ یہ کس شخص کا قول ہے؟ یہ اس شخص کا قول ہے جو علم عمران کا استاذ الاساتذہ اور فلسفۂ حسی کا بانی ہے اور فلسفۂ حسی وہ علم ہے جس کو نوع انسانی کی دماغی ترقی کا آخری زینہ تصور کیا جاتا ہے، کیوں کہ اشیاء کی حقیقت پر محسوس باتوں کے لحاظ سے حکم لگانے کا صحیح اور تنہا قانون یہی

تسلیم کیا گیا ہے۔" (مسلمان عورت: ص ۶۱، ۶۲)

۳۳۔ المرأۃ المسلمۃ۔ ص ۱۹۳

۳۴۔ اس جملے سے کتاب میں "بیکار اور" نکال دیا گیا ہے۔

۳۵۔ کتاب میں "بیٹھ رہو" کی بجائے "بیٹھ جاؤ" ہے۔

۳۶۔ کتاب میں استدلال کی یہ آیت (سورۂ احزاب۔ ۳۳: ۳۲) نظر نہیں آئی!

۳۷۔ "اشتراکی فلاسفر" کو مولانا نے "سلطنت فلاسفر" لکھا ہے۔

۳۸۔ مولانا ابوالکلام نے یہ حوالہ المرأۃ المسلمۃ کے ص ۴۰ سے دیا تھا۔ لیکن کتاب میں اس اقتباس کی آخری تین سطریں ("ہمیں مرد اور ...... تا ...... آفت ہے") حذف کر دی ہیں۔ اور اسی مقام پر اسی فلاسفر کا ایک اور اقتباس اضافہ ہے۔ اقتباس یہ ہے: "یہی مصنف عالم ایک اور موقع پر لکھتا ہے:

> چوں کہ عورت کو صرف معنوی خوبیاں عطا کی گئی ہیں اس لیے اس حیثیت سے وہ ایک بیش بہا جواہر اور اس صفت میں مرد پر سبقت لے جانے والی ہے۔ عورت کی ان خوبیوں کا ظہور مرد کی ماتحتی میں رہنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ عورت کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ اس بے بہا عطیۂ قدرت کو اپنے لیے محفوظ رکھے جو دراصل اس کی مستقل خاصیت نہیں بلکہ ایک ایسی صفت، شکل اور حالت ہے جو اس پر شوہر کی حکومت ماننے کو لازم قرار دیتی ہے۔ پس عورت کا مرد کے ساتھ دعویٰ ہم سری کرنا، اس کو نہایت مکروہ اور بدنما بنانے والی بات ہے جس کی وجہ سے وہ تعلقات زوجیت کو توڑنے والی، محبت کو مٹانے والی اور نوع انسانی کو ہلاک کرنے والی بن جاتی ہے۔"
>
> (مسلمان عورت۔ ص ۶۵)

۳۹۔ المرأۃ الجدیدۃ: (فصل چہارم) قاسم امین بک

۴۰۔ المرأۃ الجدیدۃ: (فصل پنجم) قاسم امین بک

۴۱۔ "قاسم امین بک" سے پہلے کتاب میں "لیکن ہم" جملہ اضافہ ہے۔

۴۲۔ سورۂ روم (۳۰)، ۳۰

www.KitaboSunnat.com

۴۳۔ خاندان یا معاشرہ

۴۴۔ المرأۃ الجدیدۃ: فصل سوم

۴۵۔ کتاب میں "خود" کی جگہ "اپنے آپ" نے لے لی ہے۔

۴۶۔ اس المرأۃ المسلمۃ: ص ۶۷

۴۷۔ کتاب میں یہ جملہ اس طرح ہے: "عورت کو محصور کر دیا جائے۔"

۴۸۔ کتاب میں "آرٹیکل" کو "رسالے" نے بدل دیا گیا ہے۔

۴۹۔ کتاب کے اس جملے کی تالیف میں ایک خفیف و لطیف فرق ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

"جس نظام میں سوسائٹی یا قوم پر محتاج عورتوں کی امداد واجب کردی گئی ہے۔"

۵۰۔ کتاب میں اس نام کی تصحیح شدہ شکل "آگسٹ کونٹ" ہے۔

۵۱۔ اس مقام پر الندوہ بابت ماہ فروری ۱۹۰۶ء میں المرأۃ المسلمہ کی تیسری قسط ختم ہو جاتی ہے۔ الندوہ میں یہ سلسلۂ مضمون اس سے آگے نہیں بڑھا۔

علمی خبریں

(۱)

انگلستان میں جنون:

یورپ اور یورپ میں بالخصوص انگریز حفظانِ صحت کا بے حد خیال رکھتے ہیں اور علوم وتمدن کی ترقی نے جو اسباب، صحت اور حفاظت کے مہیا کر دیے ہیں، ان سے پورے طور پر متمتع ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجود اس ممتاز خصوصیت کے انگلستان میں دیوانوں کی تعداد روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ سنہ رواں میں جو تعداد سرکاری طور پر مشتہر کی گئی ہے، ایک لاکھ انیس ہزار آٹھ سو انتیس ہے۔ جب ہم اس تعداد کو انگلستان کی عام مردم شماری کے مقابلے میں رکھتے ہیں تو اوسط طور پر ہر دو سو پچاسی آدمیوں کے بعد ایک آدمی دیوانہ ثابت ہوتا ہے۔ حال آں کہ دس سال پہلے عام اوسط ۱/۳۱۹ تھا! اور اس سے پیشتر اس سے بھی کم۔ انگلستان کی طبی جماعتوں نے جب اس خوف ناک ترقی کے اصلی اسباب تلاش کیے تو بحث وتجربہ کے بعد دو وجہیں ثابت ہوئیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ انگلستان میں شراب نوشی کی عادت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ شراب کا اصلی جزو الکحل ہے اور الکحل دماغی قوت کے لیے سم قاتل ہے۔

دوسری وجہ، انگلستان کے اس مظلوم طبقے کی ذلیل اور غلیظ معاشرت ہے جو تمدن وعلوم کے مرکز میں رہ کر تمدنی آرام وآسایش سے قطعی محروم ہے۔ انگلستان میں فقرا اور مساکین کا گروہ نہایت وسیع ہے۔ لندن کا ایک بڑا حصہ، انھیں آوارہ گرد فاقہ مستوں سے بھرا ہے۔ رات کو خوفناک سردی سے بچنے کے لیے نہ کسی ڈیوک کی فیاضی انھیں ایک پرانا کمبل بخشتی ہے۔ نہ تین گھنٹہ سونے کے لیے کسی باعظمت لارڈ کی ڈیوڑھی جگہ دیتی ہے۔ ہم دردی، بنوع انسان کی محبت، اپنائے جنس پر

کل یورپ کے وہ جذبات ہیں جو یا تو ترکی کی حکومت میں سرکش عیسائیوں کو آزادی دلانے کے لیے حرکت میں آتے ہیں، یا مشنریوں کے مقدس گروہ کی زبانی مخالف مذہب کے مظلوم بھائیوں کو عیسائی بنانے کے لیے ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر خود دارالحکومت ان جذبات کے اثر سے ناآشنا ہے، جو ہزاروں میل کے فاصلے پر ترکی میں دکھلائے جاتے ہیں یا سمندر پار ایشیا میں۔

یہ وحشی گروہ چوں کہ مجبوراً قابلِ نفرت حالت میں زندگی بسر کرتا ہے، اس لیے طبعی طور پر مختلف قسم کے عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ من جملہ ان کے ایک جنون بھی ہے۔ چناں چہ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ سو دیوانوں میں اکانوے دیوانے اسی گروہ کے ہوتے ہیں۔ گذشتہ سال دو ہزار چھ سو تیس دیوانوں میں دو ہزار پانچ سو چھیانوے فاقہ مست اور محتاج تھے۔

ہر سال دیوانوں کی مجموعی تعداد کے ساتھ فرداً فرداً بھی بتلایا جاتا ہے کہ کن کن عوارض اور اسباب کے دیوانوں سے یہ تعداد پوری ہوتی ہے۔ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۳ء تک کے پانچ سالوں کی مجموعی تعداد میں مندرجہ ذیل اسباب سے خاص خاص تعداد کے دیوانے دریافت ہوئے:

	دماغی عوارض	مرد	عورت
۱۔	خانگی پیچیدگیوں اور صدمات سے	۳۱	۸۸
۲۔	خلافِ توقع ناکامیابی کے صدمے سے	۵۱	۳۵
۳۔	قوائے عقلی کو بے حد محنت میں ڈالنے سے	۵۵	۵۹
۴۔	مذہبی اثرات سے	۱۱	۱۲
۵۔	عشق کے صدمات سے	۵	۱۹
	جسمانی عوارض		
۶۔	کثرتِ استعمالِ مسکرات سے	۴۲۷	۹۷
۷۔	آفتاب کی حرارت کے صدمے سے	۱۳	۱
۸۔	ناگہانی صدمات سے	۴۳	۸
۹۔	بخار کی شدت سے	۱۲	۹
۱۰۔	بھوک کی شدت سے	۹	۵
۱۱۔	بڑھاپے سے	۷۱	۸۵

۱۲۔ مختلف بدنی امراض سے	۱۳۰	۱۳۱
۱۳۔ خاندانی اثر وراثت سے	۱۸۸	۲۳۹

اس جدول میں سب سے زیادہ تعداد نمبر ۲، ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ کی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شراب نوشی اور زنا کاری کی کثرت جنون کی زیادتی کا اہم ترین سبب ہے۔

الکحل:

الکحل، ایک مسکر مادہ کا نام ہے۔ جو شراب کا جزو اعظم ہے۔ اس بنا پر شراب کی جتنی مضرتیں بیان کی جاتی ہیں وہ فی الحقیقت الکحل کی مضرتیں ہیں۔ شراب کے علاوہ الکحل مختلف امراض کی دوائیوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اب سے کچھ عرصے پہلے عام خیال یہ تھا کہ شدت ضعف کی حالت میں مریض کو فوری تقویت پہنچانے کے لیے اور اعضا میں چستی پیدا کرنے کے لیے الکحل سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں۔ لیکن آج کل شراب کی مضرتیں یورپ میں اس درجہ مسلم ہو گئی ہیں کہ ایک بڑی جماعت مرض کی حالت میں بھی الکحل کا استعمال جائز نہیں رکھتی۔ اس جماعت کے مقابلے میں قدیم رائے کی جماعت بھی موجود ہے جو الکحل کی مضرت کو تسلیم نہیں کرتی۔ حال میں لندن کے مجمع طبیہ کے سیکریٹری، ڈاکٹر ڈون ہیرس نے اس اختلاف کے متعلق ایک محققانہ مضمون شائع کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ جو لوگ شراب کے اصلی جزو الکحل کو عام طور پر، یا بعض حالتوں میں مفید قرار دیتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں کیونکہ شراب اور الکحل، انسان کی جسمانی اور روحانی صحت کے لیے ہر حالت میں مضر ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے مضمون کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ یورپ میں عام طور پر یہ خیال پھیل گیا ہے کہ الکحل اکثر امراض کے لیے مفید ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں

۲۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ اعصاب اور عضلات کے انحطاط پر انسان کے لیے الکحل مفید ہوتا ہے۔

۳۔ بعض حالتوں میں دیکھا گیا ہے کہ شدت ضعف کے موقع پر الکحل سے فائدہ ہوا لیکن اول تو اس قسم کا فائدہ ضروری نہیں کہ ہر حالت میں ثابت ہو، دوسرے یہ کہ اگر نادر صورتوں میں ہوتا بھی ہے تو وہ ایک وقتی اثر ہے، جس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

آج کل مصر اور قسطنطنیہ میں دو قابل ذکر کتابیں چھپ رہی ہیں:

۱۔ **کتاب الفہرست ابن الندیم**، مسلمانوں کی قدیم علمی کوششوں کی ایک بے نظیر یادگار ہے۔ سب سے پہلے یورپ نے اس کا سراغ لگایا اور لیپزگ کے مشہور عالم پرہس میں چھاپ کے شائع کیا لیکن چوں کہ یورپ کی تمام کتابوں کی طرح اس کی قیمت بھی بہت گراں تھی اس لیے معمولی استطاعت کے علم دوست اشخاص اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ناظرین نہایت مسرت سے سنیں گے کہ اب اس کی نقل قسطنطنیہ کے ایک تاجر نے چھپوانی شروع کر دی ہے۔

۲۔ **الاصابہ فی معرفۃ اسماء الصحابہ**، رجال کی مشہور کتاب ہے جس کو ۱۸۴۸ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے کلکتہ میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اب مصر کی ایک نئی شرکت (کمپنی) اس کی نقل چھاپ رہی ہے۔ پہلا حصہ عن قریب شائع ہوگا۔

سنہ رواں (۱۹۰۵ء) میں ۷۹،۹،۲۸،۲۴،۱ گنی، اشاعت علوم و معارف پر انگلستان میں صرف کی گئی۔

باہر نامہ:

الیاس ولکنس، موجودہ زمانے میں یورپ کا ایک جلیل القدر مستشرق (اورینٹلسٹ) گزرا ہے جس کو مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی، فارسی اور ترکی سے خاص طور پر دل چسپی تھی۔ یورپ میں بڑے بڑے اہم کام معمولی لوگوں کی شخصی توجہ سے انجام پاتے ہیں اور آگے چل کر عظیم الشان صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ الیاس ولکنس نے جب ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا تو اس کی شفیق والدہ نے ایک معقول رقم اس کام کے لیے وقف کر دی کہ یورپ کے منتخب اور فاضل مستشرقوں کی ایک انجمن قائم کی جائے جس کا مقصد مشرقی علوم و السنہ کے آثار کی حفاظت ہو۔ عربی، فارسی اور ترکی کی ان نایاب اور نادر کتابوں کا سراغ لگائے، جن کا نام صفحۂ روزگار سے مٹ رہا ہے اور تصحیح و تہذیب کے بعد چھاپ کر شائع کرے۔ غرض یہ تھی کہ بیٹے کی یادگار میں ایک ایسی انجمن قائم ہو، جو اس کے مذاق اور دل چسپی کے کام کو ہمیشہ جاری رکھے۔ چناں چہ اس انجمن کا نام بھی یادگار الیاس ولکنس رکھا گیا اور ایک منتخب جماعت اس کام میں مشغول ہوگئی۔

اس انجمن کی کوششوں سے اس وقت تک دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

۱۔ تاریخ طبرستان

۲۔ بابر نامہ

بابر نامہ سلطنت مغلیہ ہند کے مؤسس بابر شاہ کی سوانح عمری ہے جس کو خود بابر نے چغتائی ترکی میں روزنامچے کے طرز پر مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی زبان میں شائع ہو چکا ہے، لیکن اصل کتاب نایاب تھی۔ انجمن مذکور نے نہایت کوشش سے سر سالار جنگ مرحوم کے کتب خانے کا ایک نسخہ بہم پہنچایا جو نہایت خوشخط، صحیح اور قدیم ہے اور اس کا نفیس عکس لے کر کتاب کو اصلی صورت اور وضع میں شائع کیا۔ یورپ کی مستشرق جماعت مشرقی علوم و آثار کی جو خدمت کر رہی ہے، اس کا ایک ادنیٰ پیمانے پر نمونہ، اس کتاب کی اشاعت ہے۔

بابر نامہ (۳۸۲) صفحوں کی ایک ضخیم کتاب ہے۔ چوں کہ اصل کتاب میں جابجا مختلف تاریخی واقعات کا ذکر ہے، سیکڑوں شہروں اور لوگوں کے نام آئے ہیں، اس لیے (۱۰۱) صفحوں کی ایک مبسوط انڈکس تیار کر کے آخر میں لگا دی ہے جس سے ہر نام اور ہر واقعے کا فوراً پتا لگ سکتا ہے۔

''حقوق المرأۃ فی الاسلام''، احمد بیگ آجایف ایک مشہور مسلمان روسی مصنف ہے جس نے اسلام کے متعلق متعدد کتابیں روسی زبان میں تصنیف کی ہیں۔ حال میں اس نے ایک نئی کتاب اس عنوان پر شائع کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب اور عجم میں عورتوں کی کیا حالت تھی! اور اسلام نے ان کی اصلاح اور ترقی کی کہاں تک کوشش کی! اور کیا کیا حقوق عطا کیے؟ مصر میں اس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے اور تقریباً بارہ آنے قیمت ہے۔ دفتر الہلال مصر سے مل سکتا ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

دارالعلوم، ندوہ، لکھنؤ (۱)

---

[۱] ماہنامہ الندوہ_ لکھنؤ، دسمبر ۱۹۰۵ء، ص ۲۷-۳۴

علمی خبریں

(۲)

اللغة العامة: بیسویں صدی کی حیرت انگیز ایجادات اور انکشافات نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو تمدنی، علمی اور تجارتی تعلقات پیدا کر دیے ہیں، وہ روز بروز ایک ایسے ذریعے کی ضرورت ظاہر کر رہے ہیں جو بطور ایک مشترک زبان کے باہم مستعمل ہو۔ یورپ کے علمی اثرات نے مشرق میں متعدد مغربی زبانیں رائج کر دی ہیں اور یورپ کے سیاح اور تاجر اس کی بدولت ہر جگہ اپنی زبان کے سمجھنے والے موجود پا کر کچھ بہت زیادہ دقتوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ خود یورپ میں فرنچ زبان ایک مشترک زبان کی حیثیت رکھتی ہے، کیوں کہ یورپ کے ہر حصے میں اس کے جاننے والے بہ کثرت موجود ہیں۔ اس بنا پر درحقیقت اگر کسی عام زبان کی ضرورت ہے تو مغربی تعلقات کی بدولت صرف مشرقی ممالک کو کیوں کہ ہندوستان کے باشندے برٹش حکومت کی وجہ سے یورپ کی زبانوں میں سے صرف انگریزی سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے انگلستان کے علاوہ یورپ کے دیگر حصوں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ مگر یورپ کی آسائش پسند اور زیادہ بہتر حالت کی طلب گار طبیعتیں فرانسیسی زبان کی آسانیوں پر قانع نہیں ہیں۔ بیسیوں فاضل اور السنۂ عالم کے ماہر اس کوشش میں مصروف ہیں کہ تمام دنیا کے لیے نہیں تو کم از کم یورپ بھر کے لیے ایک آسان، سہل، خوش لہجہ زبان وضع کی جائے جس کو معمولی توجہ سے ہر شخص حاصل کر سکے اور تمام اقوامِ یورپ میں ایک مشترک ذریعۂ گفتگو ہو۔ اس وقت تک اس مقصد میں علماے یورپ کو جس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کی اجمالی کیفیت ایک علمی خبر کی صورت میں یہاں درج کی جاتی ہے۔

”مسلمانوں کی گذشتہ علمی ترقی“ ایک عجیب سبجیکٹ ہے، جس پر یورپ کی متضاد نگاہیں

پڑ رہی ہیں۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، نہ انھوں نے کوئی نئی بات دریافت کی، نہ کسی علمی مسئلے کو ایجاد کیا، دوسری طرف بعض مستشرقین کی جماعت مسلمانوں پر اس قدر مہربان ہے کہ دنیا بھر کے علمی مسایل اور تحقیقات کے بانی مسلمانوں ہی کو قرار دیتی ہے۔ فرانس کا مشہور مستشرق لیون فاکیس کا دعویٰ ہے کہ عام اور مشترک زبان کے موجد بھی مسلمان ہیں۔ سب سے پہلے شیخ محی الدین عربی نے چھٹی صدی میں صوفیوں کے لیے ایک خاص زبان تیار کی، جس میں عربی، فارسی اور عبرانی زبانوں سے الفاظ منتخب کرکے جمع کیے تھے اور بلیبلان نام رکھا تھا۔ مصنف مذکور اس نام کا مطلب بھی بتلاتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ بلیبلان کے معنے زندہ زبان کے ہیں کیوں کہ واضع کا نام بھی محی الدین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لیون فاکیس نے اس تحقیق سے ہم پر ایک بڑا احسان کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ مستشرقین کے اور بہت سے احسانوں کی طرح اس احسان کو بھی ہم قبول نہیں کر سکتے۔ شیخ محی الدین عربی کی تصنیفات ان کے خاص وضع کردہ اصطلاحات سے بھری ہوئی ہیں، اگر "بلیبلان" سے مراد یہ اصطلاحات ہیں تو سخت غلطی ہے اور اگر کوئی اور زبان مراد ہے تو اس کے ذکر سے ہماری تاریخیں خاموش ہیں۔

یورپ میں سب سے پہلے سولھویں صدی کے مشہور فلاسفر لارڈ بیکن نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ مگر غالباً اس کو کوشش کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بیکن کے بعد دیکرت ولیبنس وبشر نامی ایک عالم نے اس ضرورت پر توجہ کی۔ الفاظ وضع کیے، صرف ونحو مرتب کی اور ایک مستقل کتاب میں اپنی کوششوں کے نتائج درج کیے۔ یہ پہلی کتاب ہے، جو یورپ میں اس عنوان پر لکھی گئی۔ اس کے بعد اور بہت سے لوگوں نے کوششیں کیں، بعض زبانیں خاص خاص جماعتوں میں رائج بھی ہوگئیں لیکن چوں کہ ان تمام زبانوں میں بے انتہا نقص تھے اور عام ہونے کی کافی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں، اس لیے کامیابی نہیں ہوئی۔

۱۸۷۹ء میں یکا یک ایک نئی کتاب چھپ کر شائع ہوئی، جس کو اس عنوان پر پہلی کامیاب کتاب سمجھنا چاہیے۔ اس کا مصنف جرمنی کا مشہور عالم السنہ ڈاکٹر شیلیر تھا۔ جس نے کامل بیس برس کی محنت میں یورپ کی تمام زبانوں سے مختلف الفاظ جمع کر کے ایک آسان زبان تیار کی اور اس کے اصول وقواعد اس کتاب میں ترتیب دیے۔ کتاب کے شائع ہوتے ہی یورپ بھر میں ازسرِنو توجہ پیدا ہوگئی۔ جرمنی اور وسط یورپ میں عام طور پر اس زبان کو لوگ حاصل کرنے لگے۔ سیکڑوں

آدمیوں میں باہمی بول چال اور خط و کتابت کا ایک ذریعہ بن گئی۔ ایک انجمن بھی قائم کی گئی جس کا مقصد اس زبان کی اشاعت اور ترقی تھا۔ کچھ عرصے میں جب اس نئی زبان کے جاننے والے بہ کثرت پیدا ہو گئے تو ایک کانفرنس بھی قائم کی گئی، جس کے اجلاس مختلف مقاموں میں منعقد ہوتے تھے اور اسی زبان میں تقریریں کی جاتی تھیں۔ خاص خاص اخبارات بھی جاری کیے گئے جس میں تمام خبریں اور مضامین اسی زبان میں درج کیے جاتے تھے۔ یہ تمام کارروائی اس امر کا عمدہ ثبوت تھی کہ یورپ کی اس ضرورت کو ڈاکٹر شلیئر کی بست سالہ کوشش نے پورا کر دیا اور یہ زبان تھوڑے ہی عرصے میں تمام یورپ کے باہمی تعلقات کا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے میں یہ خیال غلط ثابت ہو گیا اور شوراشوری بے نمکی سے مبدل ہو گئی۔ انیسویں صدی کے آخری برسوں میں جب اس زبان کی ترقی کی کوششوں کو تلاش کیا گیا تو یورپ میں کہیں ان کا نشان نہ تھا۔

ڈاکٹر شلیئر ہی کے زمانے میں ایک اور شخص بھی اپنی کوششوں کے نتائج کا انتظار کر رہا تھا۔ اس شخص کا نام ڈاکٹر زامنہوف تھا۔ بارہ برس کی محنت کے بعد کامیاب ہوا اور اس طرح کامیاب ہوا کہ جس ضرورت کے لیے شلیئر کی بست سالہ کوشش مفید نہ ہوئی اس کو بارہ سال کی محنت سے پورا کر دیا۔

ڈاکٹر موصوف نے اس زبان کا نام ”اسپرنتو“ رکھا اور ”معلم اسپرنتو“ کے نام سے اس کے اصول و قواعد ایک رسالے کی صورت میں شائع کیے۔

”اسپرنتو“ ایک سہل اور آسان زبان ہے، جس کے مادے چھبیس ہزار سے زیادہ نہیں۔ یورپ کی تمام زبانوں سے ایسے الفاظ منتخب کیے ہیں جن سے زیادہ سلیس الفاظ ان زبانوں میں نہیں مل سکتے۔ ہر مفہوم کے لیے انھیں منتخب الفاظ میں سے ایک مناسب لفظ قرار دیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ ترکیب، مخرج، آواز، اسلوب کے لحاظ سے کوئی لفظ مشکل نہ ہو۔ ”اسپرنتو“ صرف یورپ کے باہمی تعلقات کی آسانی اور سہولت کے لیے وضع کی گئی ہے، اس لیے صرف یورپ ہی کی زبانوں سے الفاظ چنے گئے، تاکہ ہر زبان کا بولنے والا اپنی زبان کی شمولیت کی وجہ سے آسانی کے ساتھ سیکھ سکے اور صحت کے ساتھ بول سکے۔ منتخب الفاظ کے علاوہ چھیالیس لفظ اور وضع کیے، جن میں سے تیس لفظ منتخب لفظوں کے ساتھ ترکیب پا کر مختلف معانی پر دلالت کرتے ہیں اور سترہ الفاظ ترکیب پا کر معانی میں تصریفی تغیر پیدا کرتے ہیں۔ اس زبان کی کل کائنات صرف

آتی ہے، لیکن انھیں الفاظ سے کروڑوں الفاظ ترکیب پا سکتے ہیں۔

''معلم اسپرنتو'' کے شائع ہوتے ہی یورپ بھر میں اس نئی زبان کا چرچا ہونے لگا اور سہولت اور آسانی کی وجہ سے نہایت قلیل عرصے میں ہزاروں آدمی بے تکلف سیکھ گئے۔ روس، جرمنی اور فرانس میں عام طور پر رائج ہو گئی اور نہایت سرعت سے یورپ کے دیگر حصص میں پھیلنے لگی۔ خود ڈاکٹر زامنھوف نے معلم اسپرنتو کو یورپ کی بارہ زبانوں میں چھاپ کے شائع کیا تاکہ ایک ہی وقت میں یورپ کا تمام حصہ اسپرنتو سے واقف ہو جائے۔

یہ زبان آج یورپ میں جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ مختلف علوم و مذاق کی ایک سو پچیس سے زاید کتابیں اسپرنتو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ہومر، ورجیل، شکسپیر، بومری وہ نظمیں جو قدیم و جدید یورپ کی شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں، مدت ہوئی اسپرنتو میں شائع ہو چکی ہیں۔ ترجمے کے علاوہ خاص مستقل تالیفات اور تصانیف کی تعداد بھی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ متعدد اخبارات بھی شائع ہوتے ہیں۔ سینٹ لوئیس کی نمائش میں جہاں دنیا بھر کی علمی زبانوں کی تصنیفات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا تھا۔ وہاں یہ نوخیز زبان بھی اپنی عمر کے لحاظ سے ایک معقول سرمایہ لیے ہوئے موجود تھی، (۲۵۰) کتابیں مختلف علوم اور مذاق میں، (۳۰۰۰) ڈاک کے خطوط، (۲۵) اخبار جو یورپ کے مختلف شہروں سے شائع ہوتے ہیں۔ نہایت قلیل عرصے میں اس قدر ترقی کچھ کم حیرت انگیز اور عجیب نہیں ہے۔

آج یورپ میں اسپرنتو کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے جس میں سے دس ہزار سے زیادہ صرف فرانس میں موجود ہیں۔

اگست ۱۹۰۳ء میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یورپ کے تمام حصوں سے اسپرنتو کے بولنے والے جمع ہوئے تھے۔ کانفرنس کی تمام کارروائی اسی زبان میں ہوئی اور اسپرنتو کی ترقی اور اشاعت کی تدابیر پر غور کیا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو دن کے لیے ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا ہے جہاں کے باشندوں کی بولی اسپرنتو ہے۔

اسپرنتو جس ضرورت کے پورا کرنے کے لیے وضع کی گئی اس کا منشا صرف یہ تھا کہ ایک ایسی عام اور مشترک زبان تیار کی جائے جس کا تلفظ آسان ہو اور بغیر انہماک اور غیر معمولی توجہ کے ہر شخص تھوڑی سی کوشش سے سیکھ سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسپرنتو نے اس ضرورت کو اس

خوبی کے ساتھ پورا کردیا جس سے بہتر صورت غالباً ممکن نہیں۔ آسانی اور سہولت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ اوڈیسہ میں ایک شخص کو اسپرنٹو کا شوق ہوا تو ایک دن کی کوشش میں بے تکلف بولنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس قدر سہل اور آسان زبان اگر تھوڑے ہی عرصے میں تمام متمدن ممالک کی مشترک زبان بن جائے تو کیا تعجب ہے۔ مگر چوں کہ اسپرنٹو کا مادہ صرف یورپ کی زبانوں سے لیا گیا ہے اس لیے درحقیقت یورپ ہی کے لیے آسان اور مفید ہو سکتی ہے۔ مشرق کی کسی زبان کا بولنے والا جو مغربی زبانوں کے لہجہ اور تلفظ سے قدرتاً نامانوس ہے، ہرگز اسے آسانی سے حاصل نہیں کرسکتا جو کسی مشترک زبان کے لیے ضروری ہے۔ تاہم بہ نسبت یورپ کی منتظم اور قدیم زبانوں کے اس کا حاصل کرنا مشرق کے لیے آسان اور بہت زیادہ آسان ہے۔

کتاب الحیوان:

جاحظ کی تصنیفات میں سے دو کتابیں مشہور ہیں:

۱۔ کتاب البیان والتبیین
۲۔ کتاب الحیوان

پہلی کتاب ۱۳۱۱ ہجری میں چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ دوسری کتاب نایاب تھی مگر حال میں مصر کے ایک مشہور تاجر محمد ساسی نامی نے اپنے اہتمام میں چھپوانا شروع کر دیا ہے۔ پوری کتاب سات جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد شائع ہو گئی ہے جس کے دو سو صفحات ہیں۔ مصر میں اس کتاب کے صرف دو نسخے تھے۔ ایک مشہور ادیب محمود شنقیطی کے کتب خانے میں، دوسرا ایڈیٹر المقتطف کے کتب خانے میں۔ کتاب نہایت سرعت سے چھپ رہی ہے۔ امید ہے کہ باقی جلدیں بھی عن قریب نکل جائیں گی۔

ابوالکلام آزاد دہلوی
ندوہ، لکھنؤ (۱)

۱۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ، جنوری ۱۹۰۶ء، ص ۲۶:۳۶

علمی خبریں

(۳)

کتاب الام، جو امام شافعی کی مشہور، ضخیم اور مبسوط تصنیف ہے اور جس کے زیرِ طبع ہونے کی خبر کسی گذشتہ اشاعت میں درج ہو چکی ہے، اس کی چار جلدیں مطبع میری بولاق سے چھپ کر شائع ہو گئیں۔ کتاب کی کل سات جلدیں ہیں، باقی جلدیں بھی نہایت سرعت سے چھپ رہی ہیں۔ حاشیہ پر امام صاحب کی تین وہ کتابیں بھی چھاپی ہیں، جن میں مسند اور اختلاف الحدیث رد قابل ذکر کتابیں ہیں۔ کتاب الام میں پہلی کتاب کتاب الطہارۃ ہے اور آخری کتاب الشروط، اور اس طرح عبادات اور معاملات کے تمام ابواب آ گئے ہیں۔

اس کتاب کے پبلشر سید احمد بک حسینی ہیں اور انھیں سے مکتبہ سید مصطفےٰ البابی، محلہ خان الخلیل کے پتے سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ زراعت پر چاند کی مختلف حالتوں اور روشنی کا اثر پڑتا ہے، لیکن حال کے تجربوں سے یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ مشہور فرانسیسی ہیئت دان، ایم کستول فلاماریون نے آلو اور بعض اور چیزوں کی کاشت ایسے موقعوں میں کی، جب چاند ٹھیک عروج کے درجوں میں تھا، مگر ثابت ہوا کہ چاند سے زراعت ذرہ بھر متاثر نہیں ہوتی، تجربہ کا سلسلہ جاری ہے۔

حال میں امریکہ کے ایک مضمون نگار نے یہودیوں کی موجودہ تعداد کے متعلق ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ آج تمام دنیا میں ۱،۱۱،۸۱،۲۳۴ یہودی ہیں، جس میں سے نصف تعداد تمام دنیا میں اور باقی صرف ممالک روس میں آباد ہے۔ اس نے یہودیوں کی

خوشحالی اور غربت کا بھی اندازہ کیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہودیوں میں دس فی صدی متمول اور امیر ہیں اور تیس فی صدی غربا اور فقرا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی
دارالعلوم، ندوہ، لکھنؤ (۱)

ا۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ، مارچ ۱۹۰۶ء، ص ۴۔

ایڈیٹوریل نوٹس

ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان

کتب خانے کی ضرورت!

سولھویں صدی کے مشہور فلاسفر لارڈ بیکن نے انسانی تعلیم کے دو ذریعے بتلائے ہیں:

ا۔ معلم ذی روح اور

۲۔ معلم غیر ذی روح!

معلم غیر روح قوم کے افضل ترین حصے کی علمی جدوجہد کے تحریری نتائج ہیں۔ جن کے پرتو تعلیم نے مسلمانوں کے قدیم دور کو دنیا بھر میں روشن اور ممتاز بنا دیا تھا۔ موجودہ دنیا میں یورپ کی مہذب قومیں آخر الذکر معلم کی تعلیم سے جس طرح اپنے ضمیر کو منور کرتی ہیں۔ وہ آج ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ یورپین سلطنت کے اثر اور تعلیمی تحریک نے ہندوستان میں بھی اس معلم کی طرف توجہ دلا دی ہے۔ ملک میں جابجا فاتح زبان کی درس گاہیں قائم ہیں اور ان کی شاندار عمارتوں کا ایک حصہ اس معلم کے لیے بھی وقف ہے۔ انگریزی علوم کے مستقل کتب خانے بہ کثرت نہیں تو تھوڑے بہت موجود ہیں، لیکن اگر معلم غیر ذی روح کے پرتو تعلیم سے خالی ہیں، تو عربی کی درس گاہیں! اور اگر اس طرح تعلیم سے غافل ہیں تو عربی کے نام لیوا! مطابع کی ایجاد نے دنیا کی تمام علمی زبانوں کو مشترک فائدہ پہنچایا ہے۔ عربی اور فارسی کی سیکڑوں کتابیں چھپ کر شائع ہو گئی ہیں، مگر ہمارے لیے ان کا وجود و عدم برابر ہے، کیوں کہ ہماری نظروں سے چھاپے خانے کے وہ فوائد جو عربی علوم نے حاصل کیے ہیں، پوشیدہ ہیں۔ اگر ایک مسلمان تعلیم یافتہ اپنی قوم کے قدیم علمی کارناموں کو تلاش کرنا چاہے تو کہاں جائے.....؟ ملک میں تصنیف و تالیف کا مذاق پیدا ہو چلا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عربی کا مذاق روبہ تنزل، مگر پھر بھی عربی کے جاننے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے اور گورنمنٹ کی نئی توجہ اس جماعت کو وسیع کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اگر یورپ اور ممالک اسلامیہ

کی چھپی ہوئی قیمتی کتابوں سے وہ فایدہ اٹھانا چاہیں تو کدھر کا رخ کریں؟ کیا ملک بھر میں ایک بھی پبلک کتب خانہ ہے جہاں علوم عربیہ کی تمام نادر اور بیش قیمت کتابوں کا ذخیرہ موجود ہو؟ نہیں ہے، اور افسوس کہ نہیں ہے!

کتب خانہ بانکی پور:

بانکی پور کا مشہور کتب خانہ، اس میں شک نہیں کہ اپنے بانی کی علمی فیاضی کا قابل قدر نمونہ ہے، مگر چوں کہ پورے طور پر پبلک نہیں ہے (۱) اس لیے قوم کی علمی ضرورتوں کے لیے اس کا وجود سود مند بھی نہیں ہے۔ ضرورت ہے ایک ایسے کتب خانے کی، جس میں نایاب قلمی کتابوں کے ساتھ عربی کا تمام مطبوعہ ذخیرہ موجود، پبلک ہو اور اس کا فایدہ کسی خاص شہر تک محدود نہ ہو۔

ندوۃ العلماء کا مقصدِ قیام:

ندوۃ العلماء نے قوم میں روشن خیال، محافظِ علوم، ہمدردِ ملک علما کا پیدا کرنا اپنا مقصد قرار دیا ہے۔ وہ قوم کی اخلاقی اور علمی حالت کی اصلاح اور اس لیے علوم عربیہ کا ایک دار العلوم قایم کرنا چاہتا ہے تاکہ دنیاوی علوم کے ایک عظیم الشان مرکز کی موجودگی میں مذہبی ضرورتوں کو بھی پورا کرنے والا مرکز قوم میں موجود ہو۔ اس لیے اس کا ایک اہم فرض یہ بھی تھا کہ علوم عربیہ کا ایک عظیم الشان کتب خانہ اپنی سرپرستی میں قایم کرے اور جو لوگ اس کے حلقۂ تعلیم میں شامل ہو کر اپنی زندگی مذہبی اور علمی خدمات میں صرف کرنا چاہتے ہیں، وہ معلّم غیر ذی روح کے پرتو تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ ندوۃ العلما نے اس ضرورت پر توجہ کی اور اس کی بنیاد قایم کر کے ایک حد تک اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب قوم کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے کہ اسے تکمیل تک پہنچا دے۔

کتب خانے کا قیام:

اس مقصد کے متعلق علمی کام شاہ جہاں پور کے اجلاس سے شروع ہوا۔ سب سے پہلے مولوی عبدالرافع صاحب ڈپٹی کلکٹر نے تقریبا تین ہزار کتابوں کے بیش بہا عطیے سے اس کا بنیادی پتھر رکھا۔ پھر پٹنہ کے اجلاس میں مولوی عبدالعظیم صاحب نے دو سو کتابوں کا اس پر اضافہ کیا اور

مولوی سید عبدالغنی صاحب نے تاریخ و ادب کی ایک سو ایک کتابیں عطا فرمائیں۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً بعض اور عطیے بھی اس سرمایے کو وسیع کرتے رہے، جن میں نواب عالم گیر محمد خان صاحب بہادر جاگیردار بھوپال، سید حمید الدین صاحب رئیس پٹنہ، مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم لکھنؤ، دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن، سید احسن شاہ صاحب کے عطیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کتب خانے کے بعض نوادر:

اس وقت تک جس قدر کتابیں جمع ہو چکی ہیں، ان میں بعض ایسی نادر اور نایاب کتابیں بھی ہیں جو مجوزہ کتب خانے کی زینت اور افتخار کا باعث ہوں گی۔ یعقوب کندی مامون الرشید کے زمانے میں ایک مشہور حکیم گزرا ہے جس کو اسلام میں سب سے پہلے فیلسوف کا اعلیٰ خطاب دیا گیا۔ اس کے رسائل کا نادر الوجود مجموعہ اگر کوئی خوش قسمت کتب خانہ پیش کر سکتا ہے تو وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا غریب کتب خانہ ہے۔ مدینۃ العلوم ارنیقی، تذکرہ ہفت اقلیم امین رازی یہ دو کتابیں بھی کتب خانے کی قلمی کتابوں میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کے متعلق اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ کشف الظنون، جو مسلمانوں کے علوم و فنون کی واحد فہرست سمجھی جاتی ہے، اس کا ایک ماخذ ارنیقی کی یہی کتاب مدینۃ العلوم ہے۔ امین رازی کا تذکرہ شعرا فارسی کے بہترین تذکروں میں ایک ممتاز تذکرہ ہے، جو اور تذکروں کی طرح اس وقت تک حلیۂ طبع سے محروم رہا۔ مگر دارالعلوم کے کتب خانے میں موجود ہے۔ دور اکبری کے علمی تراجم کا غلغلہ ایک عرصے سے ملک میں بلند ہو رہا ہے، لیکن اس قصے کے سوا جس سے ابوالفضل کی زبانی ہماری قوت سامعہ متاثر ہوئی ہے اور کچھ معلوم نہ ہوا۔ دارالعلوم کے کتب خانے میں چند کتابیں ایسی موجود ہیں، جن سے ہماری موجودہ معلومات پر بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اکبر کے علاوہ شاہجہانی دور میں بھی سنسکرت سے کتابیں ترجمہ کی گئیں جن میں سے فن موسیقی کے متعلق ایک مبسوط کتاب دارالعلوم کی بدولت ہمارے پیش نظر ہے۔ فن موسیقی کے علاوہ موسیقی کے باکمالوں کا تذکرہ بھی اس کتاب میں شامل ہے، جس سے دور مغلیہ کے اکثر باکمالان موسیقی کی خدمت میں ہم باریابی حاصل کر سکتے ہیں۔ سید احسن شاہ صاحب کا عطیہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ وہ بیش بہا کتابیں ان کی توجہ سے کتب خانے کو میسر آ گئیں۔ حجۃ الاسلام غزالی کی تصنیفات میں جواہر القرآن ایک بے نظیر کتاب ہے، جو

اگرچہ چھپ کر شائع ہو چکی ہے، مگر کامل نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے علمی اشتیاق کو پورا نہیں کر سکتی۔ سید صاحب نے جواہر القرآن کا ایک قلمی نسخہ عنایت فرمایا ہے جو صحیح اور صاف ہونے کے ساتھ مکمل بھی ہے۔ دوسری کتاب قاموس کا ایک شاہی نسخہ ہے، جس پر مختلف شاہان مغلیہ کی مہریں ثبت ہیں اور عالم گیر کی مہر صاف پڑھی جاتی ہے۔

کتب خانہ شبلی کی جامعیت:

اس وقت تک تقریباً چار ہزار کتابیں مختلف علوم وفنون کی جمع ہو چکی ہیں۔ مگر درحقیقت موجودہ حالت کو اس اصلی صورت سے کوئی نسبت نہیں، جس کو ہماری آنکھیں دارالعلوم کے ایک شان دار ایوان میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہندوستان مٹ چکا ہے مگر پھر بھی سیکڑوں زر و جواہر موجود ہیں۔ افسوس کہ ان سے کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہیں! ضرورت ہے ایک ایسے کتب خانے کی۔ جو ان تمام بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹ کر اپنی سرپرستی میں لے (۲) اور ان کی مجموعی قوت کے ذریعے معلّم غیرذی روح کی تعلیم سے قوم کے ضمیر کو روشن کرے۔ ندوۃ العلما ایک ایسے ہی کتب خانے کو دارالعلوم میں قایم کرنا چاہتا ہے اور ایک حد تک قایم کر چکا ہے۔ موجودہ صورت اگرچہ معقول نہیں ہے لیکن ان شاء اللہ عنقریب معقول ہو جائے گی، جب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا پرائیویٹ کتب خانہ اس کتب خانے میں شامل ہو جائے گا۔ علوم عربیہ کے ہمدرد بے حد مسرت سے اس خبر کو سنیں گے کہ مولانا نے قطعی ارادہ کر لیا ہے کہ اپنا قیمتی کتب خانہ، جو ساری عمر کی علمی تلاش کا نتیجہ ہے، قوم کے لیے وقف کر دیں اور چوں کہ دارالعلوم سے بہتر کوئی مقام عربی علوم کے کتب خانے کے لیے نہیں ہو سکتا اس لیے دارالعلوم کے کتب خانے کو اس کا بہترین مستحق سمجھنا ایک واقعی بات ہے۔ مولانا کے کتب خانے کی ہم نے سیر کی ہے اس لیے ہم خوش ہیں کہ مولانا کی توجہ سے قوم کے لیے ایک بے بہا خزانہ وقف عام ہو جائے گا۔ مولانا کی تصنیفات کا بڑا حصہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے عام خیال یہ ہوگا کہ ان کے پرائیویٹ کتب خانے میں تاریخی ذخیرے کے سوا اور علوم کی کتابیں خال خال ہوں گی، مگر درحقیقت یہ خیال صحیح نہیں! مولانا کا مذاق جس طرح جامع واقع ہوا ہے اسی طرح ان کا کتب خانہ بھی مختلف علوم پر حاوی ہے۔ تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، سب ہی کچھ ان کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ فارسی لٹریچر اور شاعری کے مذاق نے

فارسی لٹریچر کا عطر بھی مہیا کر دیا ہے۔ قیمتی ہونے کے لحاظ سے اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ ممالک اسلامیہ کے علاوہ یورپ کی چھپی ہوئی اکثر کتابیں اس کتب خانے میں موجود ہیں۔ مطبوعہ ذخیرے کے علاوہ وہ کتابیں بھی ہیں جو اس وقت تک دنیا میں شائع نہیں ہوئیں اور ممالک اسلامیہ یا ہندوستان کے بعض نامور کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ مولانا کی علمی جستجو نے ان کا سراغ لگایا اور بیش بہا رقمیں صرف کر کے ان کی نقلیں مہیا کیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ایک بڑی بات یہ ہے کہ بغیر کسی کوشش اور جاں فشانی کے قوم کے لیے اسلامی لٹریچر کا اعلیٰ ترین منتخب حصہ مہیا ہو جائے گا، جس کی قابل سے قابل اور فاضل سے فاضل ممبروں کی کمیٹی سے بھی ہم کو توقع نہیں۔ مولانا کے کتب خانے میں کسی کتاب کا نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ کتاب ہمارے موجودہ علمی لٹریچر کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتی۔

حضرت شبلی کا عزم ایثار:

دار العلوم کی موجودہ حالت محض ایک بنیاد ہے کہ قوم کی فیاضیوں پر آس لگائے اس کی اصلی صورت کا خاکہ کھینچ رہے ہیں۔ اس لیے دار العلوم میں کوئی ایسا عمدہ ہال موجود نہیں ہے، جس میں کتب خانے کو سجایا جائے اور تعلیمی حصے کا بھی ہرج نہ ہو۔ اس بنا پر مولانا نے اس عطیے کو اس شرط پر مشروط کر دیا ہے کہ جب تک کتب خانے کے لیے کوئی عمدہ اور مناسب عمارت مہیا نہیں کی جائے گی، کتب خانہ دار العلوم کے کتب خانے میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ اب اس امر کا فیصلہ قوم کے ہاتھ میں ہے کہ مولانا کے علمی عطیے سے ہم کو فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس لیے اس شرط کے پورا کرنے کا سامان مہیا کرنا چاہیے، یا اپنی خاموشی سے ثابت کر دینا چاہیے کہ علمی احساس تو مدت ہوئی رخصت ہو چکا ہے، مذہبی احساس سے بھی اب ہاتھ دھو لینا چاہیے۔

مولانا شبلی نعمانی کی افسوس ناک علالت کی خبر اخباروں میں مشتہر ہو چکی ہے۔ مگر الحمدللہ! اب طبیعت رو بہ صحت ہے۔ الٰہ آباد سے تشریف لے آئے ہیں اور بدستور اپنے مشاغل میں مصروف ہیں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

ندوہ، لکھنؤ (۳)

حواشی

۱۔ بانکی پور کا تاریخی کتب خانہ اب اپنے بانی کے اسم سامی و گرامی کے حوالے سے اپنے نئے نام "خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ" سے بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ اب "یہ پورے طور پر پبلک ہے۔" اور اپنے نامور ذخیرۂ مخطوطات کے حوالے سے دنیا کی چند اہم لائبریریوں کی صف میں شامل ہے۔ اس کی شکل میں ابوالکلام آزاد کے علمی خواب کی تعبیر کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ (ا۔ ب۔ ش)

۲۔ ندوۃ العلماء کا کتب خانہ حضرت علامہ شبلی کے نام سے موسوم ہے۔ وہ اگرچہ اپنی ابتدائی حالت سے گزر چکا ہے اور حضرت علامہ کی شرط کے مطابق ایک مستقل اور شاندار عمارت میں قائم ہے وہ اپنے ذخیرۂ علمی کے لحاظ سے ملک کے چند اہم کتب خانوں میں اس کا شمار ہوتا ہے لیکن بہ حیثیت کتب خانے کی جامعیت اور وقت کی ضرورت کے موافق ابوالکلام کی دعوت اور التفات اب بھی اپنی حقیقی تعبیر کی بتدریج منتظر ہے۔ (ا۔ ب۔ ش)

۳۔ ماہنامہ الندوہ، لکھنؤ، بابت ماہ فروری ۱۹۰۶ء، ص ۱۵۱

القضاء فی الاسلام

قضات یا جج اس زمانے سے دنیا میں چلی آتی ہے جب کہ انسان نے آئے دن کے باہمی جھگڑوں سے تنگ آ کر سلطنت اور حکومت کے تقیدات بخوشی قبول کرے۔ قضاۃ ہی کی ضرورتوں نے حکومت کی بنیاد ڈالی اور قضات کی ضرورتوں نے شخصی سلطنت کا استحقاق دنیا سے منظور کرالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دو شخصوں کا باہمی جھگڑا بغیر تیسرے شخص کی مداخلت کے کسی صورت میں فیصل نہیں ہو سکتا۔ زید کا دعویٰ ہے کہ زمین کا فلاں حصہ میری ملکیت میں داخل ہے۔ عمر اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس حصے پر فلاں زمانے سے میرا تصرف قائم ہے۔ اگر مدعی کا دعویٰ صحیح ہے تو گزشتہ زمانے میں کیوں نہیں مطالبہ کیا گیا؟ زید اس کے جواب میں متعدد وجوہ پیش کرتا ہے اور مختلف دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ اتنے زمانے کی خاموشی اس امر کے لیے مستلزم نہیں ہے کہ میں حق ملکیت سے دست بردار ہو جاؤں۔ فرض کرو کہ اس مقدمے میں زید برسر حق ہے۔ مگر جب عمر اس زمین پر قبضہ کر چکا ہے اور اس کا مدعا یہی ہے کہ اس زمین کو ناجائز طریقے سے حاصل کرے تو ایسی حالت میں زید کے مسکت سے مسکت دلائل اور قاطع سے قاطع ثبوت عمر پر کیا اثر کر سکتے ہیں؟ اس طرف سے دلیلیں پیش کی جائیں گی اور اس طرف سے جواب اول کا اعادہ! ظاہر ہے کہ اس صورت میں فیصلہ ممکن نہیں لیکن اگر ان دونوں شخصوں نے بکر کو اپنا جج مقرر کر لیا اور اس کے ہر فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تو اس صورت میں آسانی سے فیصلہ ہو سکتا ہے اور آخر حالتوں میں حق حق دار کو مل سکتا ہے۔ جج غور کرے گا کہ مدعی کا دعویٰ کن دلائل پر مبنی ہے؟ مدعا علیہ اس کی مدافعت میں کیا دلیل پیش کرتا ہے؟ مثلاً صورت مفروضہ میں زید نے جو وجوہ پیش کیے ہیں، وہ قرائن صحیح سے، واقعات کے اتفاق سے اور دلائل و شواہد کی تائید سے بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ عمر اس کے جواب میں صرف جواب اول کا اعادہ کرتا ہے۔ یہ اس

امر کی دلیل ہے کہ اس کے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ لہٰذا زید کی اس دلیل کو تسلیم کر کے کہ ''اتنے زمانے کی خاموشی اس امر کے لیے مستلزم نہیں کہ میں حق ملکیت سے محروم ہو جاؤں'' بکر زید کے حق میں ڈگری دے گا۔ یہی وہ ضرورت ہے جس نے ابتدا میں انسان کو مجبور کیا کہ وہ ایک تیسرے وجود کو اپنا حکم قرار دے اور یہیں سے قضاءت کی بنا پڑی، لیکن آگے چل کر جب تمدن نے ترقی کی اور انسانی ضرورتوں اور تعلقات کا دامن وسیع ہوا تو قضاءت کے اصول و قوانین میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں اور بہت سی نئی نئی باتیں اس میں داخل ہو گئیں۔ مثلاً مدعی اور مدعا علیہ کے خاص خاص فرائض قرار پائے۔ ثبوت دعویٰ کے طریقے زیادہ وسعت کے ساتھ اختیار کیے گئے۔ غرض کہ اسی طرح بہت سی نئی باتیں پیدا ہو گئیں اور رفتہ رفتہ یہاں تک ترقی کی کہ آج قانون کے پیمانے کا بڑا حصہ اسی مسئلے کی باریکیوں سے لبریز ہے۔

اسلام دین و دنیا کا جامع ہے، اس لیے اس کے مجموعۂ تعلیم میں اعتقادات اور عبادات کے ساتھ معاملات کا بھی مکمل حصہ موجود ہے۔ لیکن مخالفین کا دعویٰ ہے کہ اسلام آخری حصے سے تہی دست تھا، اس لیے رومن لا کی دریوزہ گری کر کے اس کمی کو پورا کیا گیا۔ اس مضمون میں ہم قانون کے حصۂ قضاءت سے بحث کرنا چاہتے ہیں اور دکھلانا چاہتے ہیں کہ بانی اسلامؐ نے کس جامعیت کے ساتھ اس مسئلے پر نظر ڈالی اور کس خوبی اور شائستگی سے اس کے قواعد اور قوانین ضبط کیے۔ اس بنا پر اس مضمون کے تین حصے ہوں گے:

۱۔ مدعی اور مدعا علیہ کے فرائض
۲۔ ثبوتِ دعویٰ کا طریقہ
۳۔ شہادت کے اصول

آج دنیا کے مہذب قوانین کی اگر تحلیل کی جائے تو آخر میں قضاءت کے اصلی اصول بھی تین حصے نظر آئیں گے۔ لیکن اصل بحث سے پیشتر بہ طور تمہید کے ہم آداب قضاءت اور آداب عدالت پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اسلام نے قضاءت اور عدالت کے جو آداب بتلائے ہیں، وہ قضاءت کے اصلی مقصد امن اور صلاح کاری کے لیے کہاں تک مفید ہیں؟

آدابِ قضاۃ:

قاضی کا اصلی فرض یہ ہے کہ ملک میں امن قائم رکھے اور سوسائٹی کی باہمی مخاصمت کو دور کرے۔ دو شخصوں میں کسی خاص مسئلے کے متعلق خصومت پیدا ہو گئی ہے، ان کی خواہش ہے کہ قاضی کا انصاف ہمارے جھگڑے کا فیصلہ کر دے، اس لیے قاضی کا فرض ہے کہ فریقین کے دعوے اور دلائل کو انصاف کے کانوں سے سنے اور قوت مرجحہ کا جو فیصلہ ہو، ٹھیک ٹھیک ان کو سنا دے۔ لیکن بسا اوقات بعض جذبات ایسے طاری ہو جاتے ہیں اور بعض حالات اس قسم کے پیش آ جاتے ہیں کہ قاضی اپنے فرض کی انجام دہی میں قاصر رہ جاتا ہے۔ بعض اوقات دانستہ اور بعض اوقات نادانستہ ایسا فیصلہ کر دیتا ہے، جو حق دار کو حق سے محروم کرنے والا اور ظالم کو ظلم کا عادی بنانے والا ہوتا ہے۔ دنیا کا مادی قانون اس خرابی کے صحیح علاج سے عاجز محض ہے۔ اس نے قانون بنا دیا ہے، ضابطہ تیار کر دیا ہے اور حکم کرتا ہے کہ قاضی اس پر عمل کرے لیکن قاضی کے دل یا کانشنس پر اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ واقعی وہ عمل کرے۔ مذہب کا کام دنیا میں یہ ہے کہ جو کام مادی قانون نہیں کر سکتا اس کو اپنے روحانی اور الٰہی قانون کے ہاتھوں انجام دے۔ دنیا کا قانون واقعات اور حالات کا تابع ہے، اس کی حکومت زبان پر ہے مگر مذہب دل کو دیکھتا ہے اور کانشنس پر اس کی حکومت قائم ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس نقص کا علاج کیا۔ ایک طرف قوانین وضع کر کے قاضی کے سامنے پیش کر دیے اور دوسری طرف اپنی روحانی وعیدوں سے اس کے دل کو انصاف پر آمادہ کیا، حالات جمع ہو گئے ہیں، نا انصافی اور طرف داری کے جذبات کا ہجوم ہے، لیکن مسلمان قاضی کے سامنے اسلام کا مجموعۂ ہدایت رکھا ہے اور وہ سختی کے ساتھ بے انصافی سے روک رہا ہے۔ جرأت کرتا ہے مگر مخبر صادق کی سچی وعید عذاب اخروی کا نقشہ سامنے پیش کر دیتی ہے اور جھجک کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس لا علاج مرض کا علاج ہے تو اسلام نے جو صورت اختیار کی ہے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔

حقیقی انصاف کا پہلا اصول یہ ہے کہ فریقین میں درجے اور حقوق کے لحاظ سے کسی قسم کا فرق جائز نہ رکھا جائے، جو برتاؤ اور سلوک ایک فریق کے ساتھ کیا گیا ہے دوسرے فریق سے بھی وہی ملحوظ رہے اور دونوں کو ایک نظر سے دیکھا جائے۔

مساوات بین الخصمین:

مہذب دنیا میں مساوات اور حریت کا شور مچا ہوا ہے، لیکن وہاں کی عدالتیں بھی کلی مساوات کے منظر سے خالی ہیں۔ اگر مدعی معمولی عزت کا آدمی ہے اور مدعا علیہ اعلیٰ پوزیشن کا، تو عدالت آخر الذکر کے ساتھ رعایت سے پیش آتی ہے، عزت اور احترام کرتی ہے۔ عام قاعدہ کے خلاف کرسی دیتی ہے حال آں کہ عدالت کی دنیا کو عام دنیا کی حالت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ایک شخص دولت مند یا ذی خطاب ہے تو اپنے دائرے میں، عدالت کو اس سے متاثر نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ عدالت میں مدعا علیہ مدعا علیہ کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ عدالت سے باہر خان بہادر سی۔ آئی۔ اے ہو۔ اسلام دنیا کا اکیلا مذہب ہے، اسلامی قانون دنیا میں تنہا قانون ہے جس نے اس حقیقی اور اصلی مساوات کو دنیا میں قائم کیا۔

(۱)

(عن ام سلمه) قال رسول الله صلعم من ابتلی بالقضاء بین المسلمین فلیعدل بینھم فی لحظة واشارتة ومقعدة ومجلسة ولا یرفع صوته علی احد الخصمین ما لا یرفع علی الاخر۔ (٠)

(آنحضرت ﷺ نے فرمایا) جس شخص پر قضاءت کا بوجھ پڑ جائے اس کا فرض ہے کہ نشست میں، طریق نشست میں، اشارات میں، تخاطب میں غرضے کہ ہر بات میں (مابین الخصمین) عدل کرے، یہاں تک کہ اگر ایک فریق سے چلا کر بات کرے، تو دوسرے سے بھی اسی طرح مخاطب ہو۔ اگر ایک فریق سے آہستہ بات کرے تو دوسرے سے بھی آہستہ گفتگو کرے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک فریق سے پیش آئے اسی طرح دوسرے سے سلوک کرے۔

(۲)

(عن علی علیہ السلام) ان رسول اللہ صلعم قال لہ، یاعلی! اذا جلس الیک خصمان، فلا تقض بینہما حتی تسمع من الآخر کما سمعت من الاوّل فانک اذا فعلت ذلک تبین لک القضاء۔ ...(۲)

(حضرت علی کو آنحضرت ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ) اے علی، جب تمھارے پاس دو لڑتے ہوئے آدمی آئیں اور تم فیصلہ کرنا چاہو تو یاد رکھو کہ اس وقت تک فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک دوسرے فریق کی بھی اسی طرح نہ سن لو جس طرح فریق اوّل کی باتیں تم نے سنی ہیں۔

پہلی حدیث میں مسلمانوں کی شرط ہے **من ابتلی بالقضاء بین المسلمین**، مگر دوسری حدیث میں حکم مساوات عام ہے۔ اس لیے محققین علما کا فیصلہ ہے کہ اگر فریقین میں کوئی فریق نصرانی یا یہودی ہو تو بھی قاضی کا فرض ہے کہ مساویانہ سلوک سے پیش آئے۔ حضرت علی سے ایک حدیث مروی ہے کہ انھوں نے ایک موقع پر آنحضرت ﷺ کا ارشاد نقل کیا **لاتساووھم فی المجالس**۔ ھم کی ضمیر ذمیوں کی طرف راجع ہے۔ لیکن محدثین کی عام تحقیق یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے چناں چہ محدث ابن جوزی نے اس کو علل میں شمار کیا ہے۔

رشوت کی سخت ممانعت:

انصاف سے باز رکھنے والی چیزوں میں ایک بے حد موثر چیز "رشوت" بھی ہے۔ قانون نے اس کو جرم قرار دیا ہے اور تحقیق پر قید کی دھمکی دی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ باوجود اس خوف اور وعید کے آج سیکڑوں مقدمے رشوت کی بدولت حق دار کو اپنے حق سے محروم کر دیتے ہیں۔ اسلام نے اس کا یہ علاج کیا کہ خدا کی بادشاہت کی اخروی عدالت کا قانون سنا کر سمجھا دیا کہ اگر رشوت لے کر دنیا کی قانونی سزا سے محفوظ رہ گئے تو یہ سمجھ لو کہ مرنے کے بعد ایک دوسری عدالت بھی انصاف کرنے کے لیے موجود ہے، جس کی سزا سے کوئی شخص نہیں بچ سکتا۔ فرض کرو کہ قاضی نے

مدعاعلیہ سے رشوت لے کر مدعی کو حق سے محروم کر دیا۔ کارروائی اس احتیاط اور پوشیدگی کے ساتھ کی گئی کہ قانون کے متجسس کانوں تک اس کی خبر نہیں پہنچی۔ ایسا ہونا ممکن ہے اور قانون اس کا کوئی علاج نہیں کر سکتا لیکن اگر قاضی مخبر صادقؐ کے پیروؤں میں شامل ہے اور اسلام کی وعید اس کے کانوں تک پہنچ چکی ہے تو اگرچہ افشائے راز کا خوف نہ ہو، احتیاط اور پوشیدگی کا سامان مہیا ہو لیکن خدائی عدالت کا خوف اس کو رشوت خوری سے مانع آئے گا اور ایک غیر محسوس قوت اس بے انصافی سے اس کو روکے گی اور اس طرح روکے گی کہ کوئی مادی قوت اور دنیاوی طاقت اس کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(۱)

(عن عبد اللہ بن عمرؓ قال رسول اللہ صلعم لعن اللہ الراشی والمرتشی......(۳)

(آنحضرت ﷺ نے فرمایا) خدا کی لعنت ہے رشوت لینے والے پر اور اس شخص پر جو رشوت دے!

(۲)

(عن ثوبان) قال لعن رسول اللہ صلعم الراشی والمرتشی والرایشی.....(۳)

ثوبان روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر لعنت بھیجی جو رشوت لے اور اس پر بھی جو رشوت دے اور راشی اور مرتشی کے درمیان جو کوشش کرے۔

غضب اور غصہ کی ممانعت:

انصاف سے باز رکھنے والے اسباب میں وہ سبب زیادہ خطرناک ہے جس کا احساس خود قاضی کو نہیں ہوتا اور اضطراری حالت میں ایسا فیصلہ کر دیتا ہے جو حق دار کو حق سے محروم کر دیتا ہے اور غاصب کو غصب و ظلم پر جرأت دلا دیتا ہے۔ یہ خطرناک سبب غصہ اور غضب ہے۔

بسا اوقات بعض حالات ایسے پیش آتے ہیں کہ قاضی کو طیش آ جاتا ہے اور غصے کی حالت میں بغیر ارادے اور احساس کے ناانصافی کر بیٹھتا ہے۔ چوں کہ غصے کے جوش میں دلائل اور شواہد کی تنقید نہیں کر سکتا اس لیے اس کا فیصلہ اکثر حالتوں میں غلط ہوتا ہے۔ اسلام نے بہت سختی سے اس کی ممانعت کی ہے۔

> (عن ابی بکر) قال "سمعت رسول اللہ صلعم" یقول لا یقضین حاکم بین اثنین، وھو غضبان. (۵)
>
> آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حاکم کو کسی مقدمے کا ایسی حالت میں فیصلہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ غضب اور غصے میں مبتلا ہو یعنی حالت غضب میں فیصلہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کوشش کرنی چاہیے کہ غصہ اور غضب کے اثر سے فیصلہ محفوظ رہے۔

قاضی کے دروازے کو ہر وقت مظلوموں کے لیے کھلا رہنا چاہیے:

دنیا کی کوئی چیز اور کوئی ادا منفعت کے ساتھ ضرر سے خالی نہیں۔ تہذیب وتمدن کی ترقی نے قاعدے اور ضبط اوقات کا دنیا کو عادی بنا دیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کو یہ عادت بے حد فایدہ پہنچاتی ہے لیکن بعض حالتوں میں نقصان بھی ہوتا ہے۔ ایک مظلوم لٹ رہا ہے، ظالم کا دست تظلم اس کو تباہ کر رہا ہے مگر وہ اپنی فریاد جب تک باضابطہ پیش نہ کرے، عدالت اس پر توجہ نہیں کر سکتی۔ ایسی حالت میں وہ مظلوم جو بدقسمتی سے غریب ومفلس بھی ہو گیا ہے، کہاں جائے اور کس کے آگے اپنی مظلومی کا قصہ دہرائے؟ عدالت کی فلک نما عمارت ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو وقت پر آئیں، ضابطے کو اپنا دستور العمل بنائیں اور مال ودولت صرف کر کے لٹی ہوئی دولت کو عدالت کی مدد سے واپس لیں۔ مگر غریب اور مفلس طبقہ اس ضابطے اور تمدن کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسلام دنیا میں امن قائم کرنا چاہتا ہے۔ تمدنی شوکت اور ضابطے کی پیچیدگیوں کا طالب نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ایسے قوانین وضع کیے اور اس قسم کی شرطیں مقرر کیں، جو سادگی میں ڈوبی ہوئی ہیں، آسان ہیں، سہل ہیں اور امرا سے لے کر مفلس قلاش تک کے لیے مفید ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ قاضی کو ہر مظلوم اور فریادی کی فریاد پر کان دھرنا چاہیے اور ہر حالت میں اس کی مدد کرنا چاہیے۔

دربان اور پاسبان روک ٹوک کرتے ہیں اور مظلوموں کو قاضی کے حضور میں آنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس لیے قاضی کو چاہیے کہ اس کی ڈیوڑھی دربانوں اور پاسبانوں سے بالکل خالی ہو۔ آنے والوں کے لیے کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو۔ جس کا جی چاہے بغیر کسی انتظار او روقت کے قاضی تک پہنچے اور اپنی فریاد سنا کر کامیاب واپس ہو۔

(عن عمر بن مرہ) قال "سمعت رسول اللہ صلعم یقول" مامن امام اووال یغلق بابہ دون ذوی الحاجہ والخلہ الا اغلق اللہ دونہ ابواب السماء دون خلتو حاجتہ و مسکنتہ ....(۲)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا، کہ جو قاضی یا گورنر اہل حاجت پر اپنے دروازے کو بند کرتا ہے، اس کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آسمان کے دروازے بھی اس پر اسی طرح بند ہو جائیں گے۔

حاکم اور قاضی کو تحفہ و ہدیہ:

انصاف سے باز رکھنے والے اسباب میں ایک اہم سبب ہدیہ بھی ہے۔ بہت سے لوگ بظاہر محتاط معصوم ہوتے ہیں، رشوت کو حرام قطعی سمجھتے ہیں لیکن جن لوگوں کی غرضیں ان سے وابستہ ہیں، ان سے بلا تکلف تحفہ تحائف قبول کر لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ بھی ایک قسم کی شائستہ رشوت ہے، جو قاضی کی زبان کو بند کر دیتی ہے اور ہدیہ دینے والے کا احسان یاد آ کر قاضی کو اس سے باز رکھتا ہے کہ اس کے مقاصد کے مخالف فیصلہ صادر کرے۔ عام طور پر اس قسم کے ہدیے ایک پرائیویٹ تعلق پر مبنی سمجھ کر معیوب نہیں سمجھے جاتے، لیکن چوں کہ نا انصافی کا بیج بونے والے ہیں اس لیے اسلام نے نہایت سختی سے ان کے لینے کی ممانعت کر دی۔

(۱)

(عن ابی، حمید الساعدی) ان رسول اللہ صلعم قال "ھدایا العمال غلول" .... (۷)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو عمال ہدیہ لیتے ہیں، وہ درحقیقت خیانت کے

مرتکب ہوتے ہیں۔

(۲)

(عن بریدہ) عن النبی صلعم انہ قال استعملناہ علی عمل و رزقناہ رزقاً، فما اخذہ بعد ذلک فھو غلول۔ (۸)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو ہم کسی مقام کا گورنر مقرر کرتے ہیں تو اس کی ضروریات کے لیے ایک رقم بھی منظور کر دیتے ہیں، اگر اس کے علاوہ وہ کچھ اور لے تو یہ خیانت ہے۔

(۳)

(عن علی علیہ السلام) عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اخذ الامیر الھدیہ، سحت وقبول القاضی الرشوہ کفر۔ (۹)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو امیر لوگوں سے ہدیہ لیتا ہے وہ ایک حرام فعل کا مرتکب ہوتا ہے، اور جو قاضی رشوت لیتا ہے وہ گویا کفر کا مرتکب ہوتا ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی
ندوہ، لکھنؤ (۱۰)

حواشی

۱۔ دارقطنی، طبرانی، بیہقی

۲۔ ابوداؤد، ترمذی، مسند امام احمد

۳۔ بخاری، مسلم

۴۔ مسند امام احمد

۵۔ بخاری، مسلم

۶۔ ترمذی

۷۔ مسند امام احمد، بیہقی، کنز العمال

۸۔ ابوداؤد

۹۔ مسند امام احمد

۱۰۔ الندوہ۔ لکھنؤ فروری ۱۹۰۲ء، ص ۲۵ تا ۳۲

یورپ میں گونگوں کی تعلیم

ایک زمانہ تھا جب ہم استعجاب کے لہجے میں کہا کرتے تھے کہ ''کیا گونگے بھی بول سکتے ہیں؟'' جب ضرورت ہوتی تھی کہ قدرت کے ناممکن التبدیل قوانین کی کوئی بیّن مثال مخاطب کے ذہن نشین کریں تو اس سے بہتر کوئی مثال نہیں ملتی تھی کہ کیا گونگے بھی بول سکتے ہیں؟ مگر آج علوم کی ترقی انسان کی حریت اور یورپ کی علمی فیاضی نے ایسے واقعات پیش کر دیے ہیں کہ ہم بیان واقعہ کے لہجے میں کہتے ہیں کہ گونگے بھی بول سکتے ہیں:

انیسویں صدی کے ابتدائی نصف حصے میں اگرچہ علوم و فنون موجودہ قالب اختیار کر چکے تھے، علم کی روشنی یورپ سے نکل کر دور دور تک پہنچ چکی تھی اور قرونِ وسطیٰ کی بہت سی ناممکن باتیں ممکن ہو گئیں تھیں، لیکن اس مسئلے پر جب بھی توجہ ہوئی تو اس درجے ناممکن سمجھا گیا کہ کسی عالم نے اپنی کوششیں اس کے لیے وقف نہیں کیں۔ لیکن صدی کے آخری حصے میں یکایک قدرت نے انسان کے اس بے انتہا مظلوم طبقے پر ترحم آمیز نگاہ ڈالی اور اس کی علمی لذتوں سے محرومی کا طول طویل زمانہ ختم ہوا۔ یورپ میں جا بجا اس امر کی کوششیں ہونے لگیں کہ اس بے زبان فرقے کو جہالت اور محتاجی کی غلامی سے نجات دلائی جائے۔ لاکھوں روپے اس کام کے لیے وقف کیے گئے، بیسیوں انجمنیں اس مقصد سے قائم ہو گئیں، یہاں تک کہ آج ان کوششوں کے نتائج حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں اور دنیا حیرت کی نگاہوں سے اس اعجاز نما کامیابی کو دیکھ رہی ہے۔

گونگے بول رہے ہیں، مخاطب کا مفہوم سمجھتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، دنیا کی روزمرہ ترقی میں ہماری طرح حصہ لیتے ہیں۔ تجارت میں وہ نظر آتے ہیں، ہر قسم کی علمی ملازمتیں وہ کرتے ہیں۔ ان کے خاص خاص اخبارات نکلتے ہیں، جس کے ایڈیٹر اور مضمون نگار اسی فرقے کے فاضل افراد ہوتے ہیں۔ ان کی خاص انجمنیں ہیں، جن کے ممبر، سیکریٹری

گونگے ہی گونگے ہوتے ہیں۔ غرض کہ علم وتمدن کی روشنی سے اس طرح اپنے ضمیر کو منور کرتے ہیں کہ دنیا کی کوئی علمی لذت اور تمدنی دل چسپی ان سے اپنا دامن نہیں سمیٹ سکتی۔

مسلمان بھی اپنے دور میں اس علمی فیاضی سے محروم نہیں رہے۔ ان کی فیاض طبیعتوں نے گونگوں کو نہ سہی، لیکن اندھوں کو اپنی علمی دل چسپیوں میں شریک کرلیا تھا۔ تاریخ میں آج سیکڑوں عالموں، مقرروں اور مصنفوں کے نام ملتے ہیں جو ظاہری آنکھوں سے محروم تھے، مگر علم کی روشنی نے ان کے ضمیر کو اس طرح منور کردیا تھا کہ ظاہری آنکھوں سے مستغنی ہوگئے تھے۔ بشار، ابوالعینا، علی قیروانی اس پایے کے شاعر اور ادیب تھے کہ اپنے زمانے میں فرید روزگار سمجھے جاتے تھے۔ مگر حیرت ہوتی ہے، جب ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ سرمۂ بصارت سے محروم تھے!

ابوالعلا معرّی کے فضل وکمال سے کس تاریخ دان کے کان ناآشنا ہیں؟ لیکن وہ بھی اسی باکمال جماعت کا ایک فرد ہے، جو بچپن میں دولت بصارت سے محروم ہوگئے، مگر اپنی کوششوں کے صدقے میں دولتِ علم سے مالامال ہوئے۔

یورپ میں آج گونگوں کی تعلیم کا جو انتظام ہے، جس طریقے سے تعلیم دی جاتی ہے اور جو نتائج ان سے حاصل ہوئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان کا اجمالی بیان ایک علمی خبر کی صورت میں یہاں درج کریں۔ لیکن اصلی بیان سے پیشتر یہ بتادینا ضروری ہے کہ اس افسوس ناک نقص کے اصلی اسباب کیا ہیں؟ اور یورپ میں آج تعلیم وتربیت کا جو انتظام کیا گیا ہے، وہ کس قسم اور صورت کے گونگوں کے متعلق ہے؟

گنگ کی دو قسمیں ہیں، عارضی اور پیدائشی۔ بعض حالتوں میں چند عوارض ایسے لاحق ہو جاتے ہیں کہ گلے میں یا زبان میں ایک نقص پیدا ہوجاتا ہے، آواز بیٹھ جاتی ہے، زبان کام نہیں دیتی اور ہمیشہ کے لیے بدقسمت انسان قوت گویائی سے محروم ہوجاتا ہے۔ اس کا گنگ، عارضی گنگ ہے۔ یورپ میں تعلیم وتربیت کا جو انتظام کیا گیا ہے، اس کو اس قسم کے گونگوں سے کوئی تعلق نہیں۔

پیدائشی گنگ دراصل نتیجہ ہے خلقی بہرے پن کا، یا عالم طفولیت میں قوت سماعت سے قطعی محروم ہوجانے کا۔ انسان کی قوت گویائی کا دارومدار درحقیقت قوت سماعت کی صحت پر ہے، بچہ جب یکایک عالم وجود میں قدم رکھتا ہے تو ہر قسم کی جسمانی اور دماغی قوت اپنے ساتھ لاتا ہے۔ وہ

بولتا نہیں لیکن بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ منتظر ہوتا ہے کہ خاندانی سوسائٹی کا اثر اس کی رہنمائی کرے اور تھوڑے ہی دنوں میں ہزار داستان بنا دے۔ اس کے نازک اور ضعیف ترین اعضا بظاہر اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کے قابل نہیں نظر آتے، مگر ان میں نشوونما کی وہ فطری قابلیت چھپی ہوتی ہے، جو دیکھتے ہی دیکھتے شیر افگن بنا دیتی ہے۔ اس کی زبان کام نہیں دیتی، تتلا تتلا کر بے ربط آوازیں نکالتا ہے اور قوتِ گویائی کے عجیب وغریب کرشمے سے محض ناآشنا معلوم ہوتا ہے، مگر قوتِ سماعت اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ سنتا ہے کہ اس کے آس پاس کے لوگ کس طرح باتیں کرتے ہیں، کس لب ولہجے میں ان کے الفاظ زبانوں سے نکلتے ہیں، کس چیز کو کس لفظ سے پکارتے ہیں اور کس حالت کو کس نام سے یاد کرتے ہیں؟ فطرت کی دوسری بخشی ہوئی قوتیں اس کو سہارا دیتی ہیں، وہ کوشش کرتا ہے کہ ان کی تقلید کرے اور اسی ترکیب سے، اسی لب ولہجے میں سنے ہوئے لفظوں کو نقل کرے۔ رفتہ رفتہ قوتِ سماعت اس کی نقالی اور تقلید کی اصلاح کرتی رہتی ہے اور قوتوں کی نمو اور ترقی کے ساتھ قوتِ گویائی بھی طبعی حد تک ترقی کرتی جاتی ہے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ جو قابلِ رحم انسان قوتِ سماعت سے محروم دنیا میں آیا، یا بچپن ہی میں اس قوت نے بے وفائی کی تو چوں کہ اس کا دماغ خارجی آوازوں کے اثر سے بے خبر رہتا ہے، اس لیے قوتِ گویائی کو بھی تحریک نہیں ہوتی اور اس کی فطری قابلیت محض بیکار جاتی ہے، یہی گنگ پیدائشی یا حقیقی گنگ ہے۔ یورپ نے اسی کے علاج کیا اور اسی قسم کے گونگوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا۔

دنیا کا عام خیال یہ ہے کہ آنکھوں سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی نعمت نہیں۔ یہ جاتی ہے تو تنہا نہیں جاتی، زندگی کا لطف بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ عام طور پر بہرے سے زیادہ مجبور اور بہت زیادہ قابلِ رحم اندھا سمجھا جاتا ہے، جو زندگی میں مجبور ومحتاج ہو جاتا ہے، نہ چل سکتا ہے، نہ کسی کو دیکھ سکتا ہے، فطرت کے مناظر سے محروم اور دوستوں عزیزوں کی صورت سے ناآشنا رہتا ہے، لیکن درحقیقت یہ خیال صحیح نہیں۔ سب سے زیادہ مجبور محتاج، اور قابلِ رحم وہ انسان ہے، جو قوتِ سماعت سے محروم دنیا میں آیا۔ یا زمانۂ طفولیت میں اس دولت سے محروم ہو گیا۔ آنکھوں سے معذور انسان اس لیے بدقسمت ہے کہ ایک قوت جاتی رہی، لیکن قوتِ سماعت سے محروم اس سے زیادہ بدقسمت ہے کہ دو قوتیں اس سے ضائع ہو گئیں۔ اندھا دنیا کے دل چسپ مناظر کے جلووں سے محروم ہے، دوستوں کی صورت سے ناآشنا ہے، مگر پھر بھی ایک ایسی چیز اپنے پاس رکھتا ہے، جو

ان کا نقشہ اور صورت اس کے ذہن میں محفوظ کر دیتی ہے۔ لیکن بہرا دنیا کے دل چسپ جلوؤں کو دیکھتا ہے، مگر چوں کہ نہ کسی کی سنتا ہے اور نہ اپنی سنا سکتا ہے، اس لیے علم کی روشنی سے بالکل محروم رہتا ہے۔ آنکھوں سے معذور ہزاروں برسوں کی علمی تحقیقات سے قوتِ سماعت کی بدولت واقف ہو سکتا ہے، اس لیے آنکھوں کا کام کانوں سے لے سکتا ہے۔ مگر جو بدقسمت قوتِ سماعت سے محروم ہے اس کے پاس کوئی طبعی ذریعہ ایسا نہیں، جس سے اس قوت کی کمی کی تلافی ہو سکے، اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب سے بڑی نعمت قوتِ سماعت ہے، جس کا ضائع ہونا درحقیقت قوتِ گویائی کا ضائع ہونا ہے۔ جو شخص اس قوت سے محروم ہے وہ زندگی کے لطف سے محروم ہے۔ اگرچہ قدرت کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کوئی نعمت ایسی نہیں ہے، جس کا ضائع ہونا زندگی کے لیے بربادی نہ ہو۔

خلقی گنگ کے اسباب:

فزیالوجی کی تحقیقات نے ثقلِ سماعت کے مختلف اسباب قرار دیے ہیں۔ بعض حالتوں میں کان کی بناوٹ میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے، یا سماعت کے اندرونی اعضا میں سے کوئی عضو ضعیف ہو جاتا ہے۔ بعض حالتوں میں کوئی مادہ اس طرح حائل ہو جاتا ہے کہ آواز کی موجیں عصبِ سماعت تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اس لیے ذہن ان سے متأثر نہیں ہوتا۔

لیکن یورپ کی عام طبی تحقیقات سے خلقی ثقلِ سماعت کے چار بڑے سبب دریافت ہوئے ہیں:

۱۔ بہت قریبی رشتے میں باہمی تزوّج

۲۔ خاندانی اثر بہ طور وراثت کے

۳۔ والدین کا جسمانی ضعف، یا صرف ماں یا باپ کا

۴۔ مرض خنازیر

ان چار سببوں میں پہلا سبب خلقی ثقلِ سماعت کا قوی ترین سبب ہے۔ جب کسی خاندان میں عرصے تک باہمی تزوّج کا طریقہ قائم رہتا ہے تو خاندان کی تمام متفرق بیماریاں اور جسمانی نقص ایک ہی نسل میں جمع ہو جاتے ہیں اور نسل کا بڑا حصہ مختلف عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ من جملہ ان کے بڑا عارضہ بہرا پن بھی ہے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ جن جن خاندانوں یا

جماعتوں میں باہمی تزوج کا طریقہ نہیں ہے یا کم ہے، ان کی اولاد اس عارضے سے عموماً محفوظ ہوتی ہے۔ چناں چہ انگلستان کے بعض فاضل اطبا نے پچھلے دنوں اس مسئلے پر خاص طور پر توجہ کی اور دریافت کرنا چاہا کہ خاص اس سبب سے کس تعداد میں یہ نقص ثابت ہوتا ہے؟ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ تین ہزار حادثات میں خاص اس سبب سے ذیل کی تعداد قوت سماعت سے محروم پائی گئی:

والدین کی باہمی قرابت	خلقی بہرے پن کے حوادث	اکتسابی حوادث	جملہ
(۱) عم زاد بھائی بہن کے باہمی تزوج سے	۸۰	۵	۸۵
(۲) عم زاد بھائیوں کی اولاد میں باہمی تزوج سے	۶۰	۳	۶۳
(۳) عم زاد دادا کی اولاد میں باہمی تزوج سے	۳۱	۱	۳۲
(۴) عم زاد پردادا کی اولاد میں باہمی تزوج سے	۷	۰	۷
(۵) دور کی قرابت میں باہمی تزوج سے	۱۳	۰	۱۳

اس نقشے میں سب سے زیادہ تعداد نمبر ۱ کی ہے اور بتدریج نمبر ۵ تک کم ہوتی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس قدر زیادہ قریب کے رشتے میں باہمی تزوج ہوتا ہے، اسی قدر اس نقص کے حادثات زیادہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

گونگوں کی تعلیم پر توجہ:

گونگوں کی تعلیم ایک محض ناممکن بات تسلیم کر لی گئی تھی۔ دنیا کا عام خیال یہ تھا کہ زبان کی تعلیم بغیر نطق کے محال ہے۔ بعض اقوام گونگوں کو اس درجے منحوس اور مغضوب الٰہی سمجھتے تھے کہ گونگوں کی ولادت خاندان کے لیے بربادی کا شگون ہے۔ فرانس میں ایک مدت تک یہ خیال قائم رہا۔ اس لیے کیوں کر ممکن تھا کہ قدیم دنیا میں اس منحوس اور مغضوب الٰہی فرقے کی تعلیم پر کوئی آمادہ ہوتا۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں یکایک ایک شخص نے یورپ کو توجہ دلائی کہ گونگوں کی تعلیم

ناممکن نہیں ہے۔ اس کا قول تھا کہ

> "کتابت کلام کے ساتھ مربوط ہے اور کلام فکر کے ساتھ، لیکن یہ ممکن ہے کہ بغیر نطق کے واسطے کے حروف یا خیالات فکر سے کتابت میں منتقل کیے جائیں۔"

اس شخص کا نام کروم کردان تھا!

اس رائے نے عام خیالات پر بہت بڑا اثر کیا۔ بہتوں کی رائے بدل گئی۔ سمجھنے لگے کہ پیدائشی گونگوں کی تعلیم ناممکن نہیں ہے۔ کردان ہی کے زمانے میں ایک اسپینی راہب بونسی نامی نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہا، اس میں کوئی شک نہیں کہ گونگوں کی تعلیم کا اصلی بانی یہی باہمت شخص ہے، جس نے سب سے پہلے گونگوں کو تعلیم کی خوش گوار امید دلائی۔ لیکن چوں کہ قدرت کو یہ مبارک کام ایک اور شخص کے ہاتھوں پورا کرانا تھا اس لیے بونسی کی کوششیں خاص اس کی ذات تک محدود رہیں۔ نہ اس نے اپنے طریق تعلیم سے کسی کو واقف کیا نہ کوئی کتاب لکھی۔ ۱۶۲۰ء میں یکایک میڈرید سے ایک کتاب چھپ کر شائع ہوئی جو ایک اسپینی عالم بونت کی عمر بھر کے تجربہ و تحقیق کا نتیجہ تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے گونگوں کی تعلیم و تربیت کے تمام تحقیق کردہ اور مجرب طریقے لکھے تھے اور بتلایا تھا کہ بے زبانوں کو کس طرح زبان بخشی جا سکتی ہے۔ اس کتاب نے گونگوں کی موجودہ تعلیم کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے اٹلی میں پھر انگلستان میں گونگوں کے مدرسے قائم ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام متمدن مقامات میں یہ طریقہ عام ہو گیا۔

گونگوں کی تعلیم کا طریقہ:

طبعی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو کس طرح تعلیم دی جاتی ہے جو نہ کانوں سے سن سکتے ہیں، نہ زبان سے بول سکتے ہیں؟ اس لیے مختصر لفظوں میں گونگوں کی تعلیم کا طریقہ بتلا دینا ضروری ہے۔

آج کل یورپ اور امریکہ میں گونگوں کی تعلیم کے عام طور پر دو طریقے پائے جاتے ہیں:

۱۔ ہاتھوں کے اشاروں سے

۲۔ الفاظ کے ذریعے سے

انگلستان اور امریکہ میں مدرسین عموماً پہلے طریقے سے کام لیتے ہیں، مگر جرمنی اور اسٹریا

میں دوسرا طریقہ مستعمل ہے۔ پہلی قسم کی دو صورتیں ہیں:

الف۔ طبیعی اشارات: گونگوں کی تعلیم کا یہ ایک اجمالی ذریعہ ہے، جس سے مختلف اشیا کی صورتوں کی تمثیل ان کے ذہن نشین کی جاتی ہے۔ اس قسم کے اشارات گونگوں کی عام زبان ہے اور اس کی تعلیم آسان اور بالکل آسان ہے۔

ب۔ خاص اصطلاحی اشارات: اس صورت کے ذریعے سے وہ مطالب اور جذبات و کیفیات گونگوں کے ذہن نشین کیے جاتے ہیں جن کی کوئی خاص صورت یا مثال نہیں بتلائی جا سکتی۔

پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ مثلاً ایک گونگے کے سامنے ایک نارنگی یا ناریل رکھ دیا گیا اور ہاتھوں کے اشارے اور قبض و بسط سے اس کی مدور صورت بتلا کر سمجھا دیا گیا کہ نارنگی یا ناریل کی علامت یہ صورت ہے۔ لیکن طبعی کیفیات اور جذبات اور بعض خاص حالتوں کے لیے یہ صورت کافی نہیں اس لیے خاص خاص قواعد مقرر کر کے اس قسم کے اصطلاحی اشارات وضع کیے گئے جن سے ان حالتوں اور کیفیتوں پر استدلال ہو سکتا ہے۔ مثلاً بھوک ایک حالت اور کیفیت ہے۔ اس کیفیت کے لیے ایک اشارہ بطور ممتاز علامت کے گونگے کو سمجھا دیا گیا۔ اب جب اس پر یہ کیفیت طاری ہوگی، وہ اسی علامت سے کام لے گا اور مخاطب کو سمجھا دے گا کہ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

اصطلاحی اشارات کی زبان یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے مدرسوں میں جاری ہو گئی ہے۔ اس زبان کے ذریعے سے انسان اپنے ہر قسم کے مافی الضمیر کو مخاطب پر ظاہر کر سکتا ہے، گونگوں کی خصوصیت نہیں۔ اگر ہم بھی اس زبان کو سیکھ لیں تو بغیر زبان کے بڑی آسانی کے ساتھ بات چیت کر سکتے ہیں۔

لیکن چوں کہ اشارات سے کافی واقفیت بغیر باضابطہ تعلیم کے نہیں ہو سکتی، اس لیے ایک ایسے ذریعے کی ضرورت ہوئی، جو گونگوں میں اور عام لوگوں میں بہ طور ایک مشترک زبان کے مستعمل ہو۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے گونگوں کے لیے حروف تہجی ایجاد کی گئی جس پر نہایت کامیابی سے یورپ اور امریکہ میں عمل کیا جا رہا ہے۔

گونگوں کی حروف تہجی:

قدرت نے انسان کو مختلف قوتیں عطا کی ہیں اور ہر قوت کے فعل کے لیے خاص خاص

اعضا بخشے ہیں، بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زبان ہاتھ کا کام نہیں کرسکتی اور ہاتھ سے زبان کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ مگر ایسا خیال کرنا درحقیقت قدرت کی بے انتہا چھپی ہوئی نعمتوں کی ناشکری ہے۔ ایک عضو کے بیکار ہونے پر دوسرے اعضا وہ کام دینے لگتے ہیں، جن سے عضوِ معطل کی موجودگی میں نہ وہ کام لیا جاتا تھا، نہ توقع تھی لیکن قدرت نے ہماری آسائشوں کا جو سامان ہم کو عطا فرمایا ہے، وہ دنیا کی بنائی ہوئی کلوں کا سا نہیں ہے کہ جہاں ایک کیل پرزا ضائع ہوا، سارے کا سارا طلسم برباد ہوگیا۔ گونگوں کی تعلیم کا اس دوسرے طریقے سے جو انتظام کیا گیا ہے، وہ اس خیال کی ایک بہترین مثال ہے۔

پہلا طریقہ:

اس طریق تعلیم کی صورت یہ ہے کہ حروف ہجائیہ کی جگہ انگلیوں کی خاص خاص حرکتوں اور قبض وبسط سے علامتیں بنائی ہیں اور ہر علامت کو ایک خاص حرف قرار دیا ہے۔ مثلاً

(۱) پانچوں انگلیوں کے بند کرلینے سے (الف)
(۲) صرف انگوٹھے کے بند کرلینے سے (ب)
(۳) صرف انگشت شہادت کے بند کرلینے سے (ت)

اسی طرح کی تک محض انگلیوں کے قبض وبسط سے پورے حروف تہجی وضع کیے ہیں۔ انھیں حرفوں کی ترتیب سے گونگے اپنا مفہوم تحریری صورت میں ظاہر کرتے ہیں اور مخاطب فوراً سمجھ لیتا ہے۔

دوسرا طریقہ:

اس تمام بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یورپ نے گونگوں کو نطق کی نعمت سے بالکل محروم سمجھ کر دوسرے طریقوں سے اظہار مافی الضمیر کے طریقے وضع کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نطق کی کوشش بہ ظاہر ایک محال امر کی کوشش معلوم ہوتی ہے اور اگر ایسا سمجھ لیا جاتا تو مشرقی طبیعتوں کے لیے محل اعتراض بھی نہ تھا، مگر یورپ کی حیرت انگیز اور نہ تھکنے والی کوششوں کے متعلق یہ تسلیم کرنا سخت غلطی ہے۔ ان تمام کوششوں کے ساتھ اس امر کی بھی کوشش کی گئی کہ گونگوں کو نطق کی نعمت

سے حتی المقدور محروم نہ رکھا جائے۔ اس غرض سے کم عمر بچوں کو دہن و زبان کی مختلف حرکتیں دکھا دکھلا کر سمجھایا جاتا ہے کہ وہ بھی تقلید اور نقل کی کوشش کریں، اور اگر قوت سامعت ان کی مدد نہیں کرتی تو اس کا کام قوت بصارت سے لیں۔ استاد بچے کو اپنے سامنے کھڑا کرتا ہے، پہلے صرف منہ کھولتا ہے اس طرح، جیسے بولنے کے لیے آمادہ ہے۔ بچہ بھی اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کچھ دنوں میں اس حرکت کا عادی ہو جاتا ہے۔ استاد جب دیکھتا ہے کہ نطق کے اس ابتدائی مرحلے کو بچے نے طے کر لیا تو زبان کی دوسری حرکتوں کی مشق کراتا ہے۔ حرکت سے طبعی طور پر آواز پیدا ہوتی ہے اور بچہ ان حرکتوں کا عادی ہو کر بغیر کسی تحریک کے مشق کرتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ آواز میں انتظام اور ترتیب پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ دنوں میں بہ دقت بولنے لگتا ہے۔ مگر چوں کہ یہ طریق تعلیم انہیں گونگوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے جن میں کم از کم ان حرکات کی صلاحیت ہو، اس لیے ہر گونگا اس طریقے سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس طریقے کے کامیاب ہونے میں تامل ہو کہ کیوں کر خارجی تعلیم طبعی نقص کو دور کر سکتی ہے؟ مگر یہ ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، گنگ کی علت قوت سامعت کا نقص ہے کہ بچہ دنیا کی آوازوں سے بے خبر رہتا ہے۔ اس لیے قوت گویائی کو تحریک نہیں ہوتی۔ اگر کسی دوسرے ذریعے سے قوت گویائی کو تحریک ہو اور وہ کام دینے لگے تو کامیابی میں کیا شک ہو سکتا ہے؟

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم کے تمام طریقوں میں یہ طریقہ بے حد مشکل ہے۔ جس بچے کا ذہن آواز کے تصور سے عاجز ہے اس کو آواز نکالنے، اس میں انتظام اور ربط پیدا کرنے کا عادی بنانا آسان کام نہیں ہے، مگر یورپ کی ہمت اور استقلال کے سامنے اس قسم کے مشکلات کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس لیے کوشش کا سلسلہ جاری رہا، بالآخر کامیاب ہوئے۔

حروف کی مختلف آوازوں کا تعلق چوں کہ صرف زبان اور منہ کے اندرونی حصے ہی سے نہیں ہے بلکہ حلق اور سینہ وغیرہ اعضا سے بھی بہت زیادہ تعلق ہے، اس لیے اس طریق تعلیم میں استاد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایک ہاتھ بچے کے سینے پر رکھے اور تنفس کی آمد و شد کا اندازہ کرے اور بچے کو اپنی طرف مخاطب کر کے ابتدا میں صرف حروف علت کی آواز اور مخارج صوت کی حرکت کا عادی بنائے۔ اسی طرح جب تمام مخارج صحیح طور پر کام دینے کے لیے بخوبی آمادہ ہو جاتے ہیں اور آواز میں انتظام پیدا ہو جاتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ مشق اور عادت قوت گویائی پیدا کر دیتی ہے۔

آواز کی تعلیم کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ سب سے پہلے بچے کو بسیط آوازوں کی مشق کرائی جاتی ہے، مثلاً اس کے سامنے شمع جلا کر، پھر پھونک مار کر بجھا دیتے ہیں اور اس کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح پھونک مار کر بجھانے کی کوشش کرے۔ اس صورت میں فتح کی سی آواز طبعی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ بچہ اس سے واقف ہو جاتا ہے پھر کوشش کرتا ہے کہ اسی قسم کی آوازیں پیدا کرے۔

گونگوں کی تعلیم کا یہ آخری طریقہ بھی دوسرے طریقوں کی طرح تمام یورپ اور امریکہ میں پھیل گیا ہے اور لاکھوں روپے صرف کر کے کوشش کی جا رہی ہے کہ دنیا کے تمام حصے اسی طریقے پر کاربند ہو جائیں۔ امریکہ کے فیاض اور علم دوست لوگوں کا اس کام میں سب سے آگے قدم بڑھا ہوا ہے۔ بیسیوں انجمنیں اس مقصد سے قایم کی گئی ہیں، سیکڑوں آدمی اس کام کی اشاعت کے لیے اپنا وقت اور مال صرف کر رہے ہیں اور یورپ کے علاوہ دنیا کے اور حصوں میں بھی تعلیم جاری ہوگئی ہے۔

یورپ میں آجکل جس سرعت سے یہ آخری طریقہ ترقی کر رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جاتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں ابتدائی طریقے بالکل معدوم ہو جائیں گے۔ تعلیم نطق میں جو کامیابیاں ہوئی ہیں ان کا بھی یہی اشارہ ہے کہ

> "ہماری موجودگی میں اشارات کے گورکھ دھندوں میں گونگوں کو پھنسانا قرین عقل نہیں ہے۔"

اس وقت تمام دنیا میں کل چار سو انتیس مدرسے ہیں جن میں دو سو انسٹھ مدرسے اسی طریقے پر کاربند ہیں۔

تمام یورپ میں فرانس والوں کو گونگوں کی تعلیم میں بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ آج کل فرانس میں ستر مدرسے قایم ہیں، جن میں چونسٹھ مدرسے آخری طریقے سے تعلیم دیتے ہیں اور صرف چھ مدرسے بذریعہ اشارات کے!

تعلیم کے نتائج:

ان کوششوں سے جو مفید نتائج پیدا ہوئے ہیں اور انسان کے اس بڑے گروہ نے جو قدرتی طور پر مگر بزرگوں کی غلطیوں کی وجہ سے قوت گویائی سے محروم تھا، جو فوائد حاصل کیے ہیں، ان کا صحیح

اندازہ سر دست ممکن نہیں۔ لیکن ذیل میں ہم ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے صرف اتنا اندازہ ہوسکتا ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں سال بھر میں کس تعداد کے گونگے قوت گویائی سے کامیاب ہوئے۔ یہ تعداد ۱۸۸۵ء کی ہے:

ملک کا نام	مدرسوں کی تعداد	طلبا کی تعداد	ملک کا نام	مدرسوں کی تعداد	طلبا کی تعداد
فرانس	۶۴	۳۸۹۶	سوئیس	۱۱	۳۸۰
ممالک متحدہ امریکہ	۵۵	۷۰۵۵	بلجیم	۱۰	۸۶۳
انگلستان	۴۰	۲۶۳۶	ناروے	۷	۳۵۸
جرمنی	۹۰	۵۶۱۴	اسپین	۷	۴۴۳
اٹلی	۳۶	۱۳۸۹	روس	۳	۳۶۰
آسٹریا	۱۷	۱۱۲۹	دنیا کے دیگر حصوں میں	۲۷	۲۷۵۶
اسٹاک ہالم	۱۷	۲۸۰	میزان کل	۳۸۳	۲۶۹۵۹

ابوالکلام آزاد دہلوی

ندوہ، لکھنؤ (۱)

---

۱ ماہنامہ الندوہ۔ لکھنؤ، مارچ ۱۹۰۶ء ص ۲۷ تا ۲۹

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم وفنون اور یورپ کی سرپرستی

(۱)

مسلمانوں کے لیے درحقیقت یہ بات سخت قابلِ شرم ہے کہ جس میدان میں انھیں ہمت کا قدم رکھنا تھا آج اغیار وہاں بازی لے گئے ہیں۔ عربی زبان نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے بلکہ مسلمانوں کی جان، روح، عنصر، جو کچھ کہو عربی ہے۔ مسلمانوں کے تمام علوم وفنون اسی خزانے میں محفوظ ہیں، لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ آج اس بے بہا خزانے پر یورپ کا قبضہ ہے اور مسلمان خالی ہاتھ اس کی اس جرأت کو تک رہے ہیں۔ درحقیقت مسلمانوں کی غفلت سے عربی کا تمام سرمایہ تباہ ہونے والا تھا، اگر یورپ اس کی حفاظت پر آمادہ نہ ہو جاتا، تاریخ وادب کی وہ بے بہا کتابیں، جن کے الگ کر دینے کے بعد عربی کا، اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا کشکول خالی ہو جاتا ہے۔ صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ یہ سرمایہ یورپ کی بدولت بربادی سے محفوظ رہا، اور بجائے ایک کرم خوردہ نسخے کے دنیا میں ہزاروں نسخے پیدا ہو گئے۔ بلکہ عربی زبان اور عربی علوم کے متعلق یورپ کی زبانوں میں، جس قدر معلومات اور تحقیقات کا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، ان کو ہمارے علماء کے دماغوں میں ایک لمحے کے لیے بھی جگہ نہ ملی ہوگی، عربی کی علم اللسان، لغت، صرف، نحو، عروض، قوافی کے متعلق بیسیوں کتابیں اس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہیں کہ اگر اس کا نصف حصہ بھی ہماری زبانوں میں آجائے تو بیش بہا معلومات سے مالا مال ہو جائیں۔

ڈاکٹر لائیٹنر ہماری اس افسوس ناک غفلت کو محسوس کر کے لکھتے ہیں کہ

”مسلمان ہیں تو بہت، مگر وہ جانتے کیا ہیں؟ اگر آج عربی کی کوئی عمدہ تاریخ یا

> کوئی عمدہ دیوان درکار ہو تو یورپ سے منگانا پڑے گا۔ ابن خلدون، ابن رشد، ابن بطوطہ، حاجی خلیفہ، ابن اثیر، اور مقریزی جو اسلام میں آسمانِ علم کے آفتاب ہیں، یہاں ان کو کوئی جانتا بھی نہیں! تابط شرا، امرء القیس، بحتری اور ابو تمام کا دیوان کتنے آدمیوں نے پڑھا ہوگا؟ یورپ میں صدہا آدمی یہ کتابیں پڑھتے ہیں اور ترجمۂ قرآن تو لاکھوں!"

ڈاکٹر جیٹمر کو تو صرف اس کا افسوس ہے کہ اگر عربی کی کوئی عمدہ کتاب درکار ہو تو مسلمانوں کو یورپ سے منگانا پڑے، لیکن ہمیں یہ افسوس ہے کہ مسلمانوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یورپ نے عربی کی کون کون سی نایاب کتابیں چھاپی ہیں اور انھیں چھاپ کر ہم پر اور ہمارے علوم پر کتنا بڑا زبردست احسان کیا ہے؟ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مضمون کے ذریعے علمائے اسلام کو یورپ کی ان خدمات سے واقف کریں جن کی بدولت آج انھیں اس امر کا موقع حاصل ہے کہ اپنے علمی ذخیرے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس مضمون کے دو حصے ہیں: پہلے حصے میں یہ دکھلایا ہے کہ یورپ کو عربی اور عربی علوم پر کب توجہ ہوئی اور صرف ونحو، لغت وادب کے متعلق کون کون سی قابل ذکر کتابیں یورپ کی زبانوں میں ترتیب دی گئیں؟ دوسرے حصہ میں ان کتابوں کی مفصل فہرست دی ہے، جو یورپ کی کوششوں سے چھپ کر شائع ہوئیں۔

یورپ کو عربی اور عربی علوم کی طرف کب توجہ ہوئی؟ اور کیوں کر ہوئی، یہ بجائے خود ایک دل چسپ مضمون ہے جس کے بیان کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت! صرف اس قدر جتلانا سلسلۂ مقصد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ عربی سے یورپ کب روشناس ہوا اور کیوں کر عربی علوم وفنون مشرق سے مغرب میں منتقل ہو گئے۔ (۱)

دنیا کے حیرت انگیز واقعات میں غالباً یہ واقعہ بھی عجیب وغریب ہے کہ یورپ کی شائستگی کی بنا ایک ایسی پولیٹیکل خوں ریزی نے رکھی جو دنیا کا سب سے زیادہ نقصان کرنے والی جنگ تسلیم کی گئی ہے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں جب کہ مسلمان ترقی کے انتہائی درجے تک بلند ہو چکے تھے، یورپ میں ہر طرف تاریکی تھی، لیکن صلیبی لڑائیوں نے یکایک یورپ کو موقع دیا کہ مسلمانوں کی شائستگی کا مطالعہ کرے۔ بیت المقدس اور انطاکیہ میں جب رومی سلطنت قائم ہوگئی

اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کے ذرائع وسعت کے ساتھ پیدا ہو گئے، تو یورپ کی آنکھیں کھلیں، اور مسلمانوں کی شائستگی کا اسے پہلا تجربہ ہوا۔ شام میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد جب یورپ کے جاں بازوں نے مغرب کا رخ کیا، تو یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے کہ مسلمان علمی ترقیات کی دنیا میں اکیلے مخزن ہیں اور تہذیب و شائستگی کا سرچشمہ اسلامی دنیا کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

اس اثر کا یہ نتیجہ ہوا کہ یورپ میں مسلمانوں کی ترقی اور شائستگی پر عام توجہ پیدا ہو گئی اور یہ توجہ برابر بڑھتی گئی۔ کیوں کہ صلیبی حملوں کی بدولت بار بار یورپ کو اسلامی ممالک میں گزر ہوا اور ہر مرتبہ مسلمانوں کی ترقی کے حیرت انگیز آثار نظر آئے۔ اس لیے ایک طرف تو یورپ نے مسلمانوں کی تباہی کا بیڑا اٹھایا، اور دوسری طرف اپنے حریف کی شاگردی پر آمادہ ہو گیا!

اس ذکر میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں یورپ میں عام تعلیم نہ تھی اور لاطینی و یونانی زبانوں کی تعلیم پادریوں اور اراکین سلطنت کے لیے مخصوص تھی، اس لیے مغرب سے مشرق کی طرف جس گروہ کا علمی تلاش میں اول قدم اٹھا وہ مذہبی پیشواؤں کا مقدس گروہ تھا۔ حیرت یہ ہے کہ یہی گروہ آگے چل کر الحاد اور بے دینی کے پریشاں خواب دیکھنے لگا اور اسلامی فلسفے کی اشاعت اس کی تعبیر بتلائی گئی۔ حالاں کہ ابتدا میں اشاعت کا ذریعہ بھی یہی نادان گروہ ہوا۔

گیارھویں صدی کے اوائل سے مسلمانوں کے علوم و فنون پر یورپ کو توجہ ہوئی اور چودھویں صدی کے اواخر تک فلسفے کی تمام کتابیں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو گئیں۔ (۲) ابتدا میں متعدد محکمے قائم کیے گئے کہ لاطینی داں یہودیوں کی مدد سے فلسفے کی کتابیں ترجمہ کی جائیں۔ پھر پوپ اکلر منڈس پنجم کے حکم سے عربی اور دیگر مشرقی زبانوں کی تحصیل کے لیے یورپ سے نوجوان طلبا اندلس روانہ کیے گئے (۳)۔ اندلس میں چوں کہ خود عیسائی اور یہودی فلسفے میں مسلمانوں کے شاگرد رشید تھے، اس لیے یورپ کے طلبا ان کی اعانت سے فائدہ اٹھا کر بہت جلد عربی اور عبرانی میں قابلیت حاصل کر لیتے، اور فارغ التحصیل ہو کر علمی کتابوں کے ترجموں میں مشغول ہو جاتے (۴)۔

جن لوگوں نے یورپ کے مختلف حصوں سے اندلس کا سفر کیا، اور عربی زبان سے واقفیت پیدا کر کے علمی تراجم میں مشغول ہوئے، ان کے نام آج تاریخی صفحات پر موجود ہیں۔ ان میں

بہت سے طالب علم ایسے ہیں جنھوں نے طلب علم میں حب الوطنی کے قید سے خود کو ہمیشہ کے لیے آزاد کر لیا، اور ساری عمر طلیطلہ کے پرائیویٹ مدرسوں اور قرطبہ کے دارالعلوموں میں صرف کر دی۔ کچھ طالب علم ایسے ہیں، جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد مشرق کے ممتاز ملکوں کی خاک چھانتے پھرے اور ایک عرصے کی تلاش و تحقیق کے بعد جب سرزمین مغرب میں قدم رکھا، تو اسلامی علوم وفنون کی معلومات سے ان کا کاسۂ دماغ لبریز تھا۔ ہارڈمن کریموں اس زمانے کا مشہور طبیب اور ہیئت دان ہے۔ یہ اپنے وطن اٹلی سے نکل کر محض عربی کے شوق میں طلیطلہ پہنچا اور ایک عرصے کی اقامت کے بعد جب کافی واقفیت حاصل کر لی، تو متعدد کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

پیٹرز مارٹ ایک فرانسیسی راہب تھا، جس کو جغرافیے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اسی شوق میں اندلس کا سفر کیا، افریقہ کی خاک چھانی اور مدت کی آوارہ گردی کے بعد مسلمانوں سے اس علم کو حاصل کیا۔ ڈینیل مارلی اور پیٹرز ماکر نے اسی طرح اندلس کا سفر کر کے عربی زبان سے واقفیت پیدا کی۔ آخرالذکر نے قرآن شریف کا عربی سے ترجمہ بھی کیا اور آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری بھی لاطینی میں ترتیب دی۔ (۵) ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کے نام تاریخ میں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض کے ترجمے اور تصنیفات اس وقت تک یورپ میں موجود ہیں (۶)۔ ان کوششوں نے یورپ کو مسلمانوں اور مسلمانوں کے علوم سے واقف کر دیا اور اسلامی فلسفے نے عام طور پر مقبولیت حاصل کر لی۔

لیکن چوں کہ یورپ میں اس وقت تک عربی زبان کی کوئی باضابطہ درس گاہ نہ تھی، اس لیے عربی زبان سے وہی خوش قسمت اشخاص واقفیت حاصل کر سکتے تھے، جن میں مشرقی ممالک کے سفر اور وہاں کے کثیر اخراجات اور دقتوں کے متحمل ہونے کی طاقت تھی، لیکن سولھویں صدی سے عربی زبان کی باضابطہ تعلیم خود یورپ میں شروع ہو گئی۔ ۱۶۲۲ء میں پندرھویں گریگوری پوپ نے روم میں ایک انجمن قائم کی، جس کا مقصد اگرچہ مسیحی عقاید کی اشاعت تھا، مگر اس کے قیام سے بہت بڑا ضمنی فائدہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی تعلیم پر یورپ کو توجہ ہو گئی۔ اس کے بعد ہی ۱۶۲۷ء میں خاص پوپ اربانس کے حکم سے اس انجمن کے متعلق مشرقی زبانوں کا ایک مدرسہ قائم کیا گیا، تاکہ نوجوان پادری مشرقی زبانوں کی تعلیم پا کر اشاعتِ مذہب کی غرض سے باہر جا سکیں۔ اس مدرسے

میں خاص طور پر عربی اور سریانی زبانوں کے پروفیسر مشرقی ممالک سے بلوا کر مقرر کیے گئے تھے۔ عربی کتابیں پہلے پہل دنیا میں اسی مدرسے کی بہ دولت چھپ کر شائع ہوئیں۔ تعلیم کے لیے ضرورت ہوئی کہ صرف و نحو اور ادب کی کتابیں بہ کثرت مہیا ہوں، اس لیے چند رسالے خود پروفیسروں نے لکھے اور کچھ کتابیں قدیم زمانے کی لکھی ہوئیں دستیاب کیں اور انھیں نہایت اہتمام سے طبع کرا کر شائع کیا۔

صرف و نحو عربی کی جو کتابیں یورپ میں لکھی گئیں:

اس انجمن نے عربی کے لیے جو کچھ کیا، وہ درحقیقت ایک مذہبی کام تھا، لیکن اسی زمانے میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے محض ذاتی کوشش اور مذاق سے عربی زبان میں قابلیت بہم پہنچائی اور پھر صرف و نحو اور ادب و لغت کی کتابیں لکھ کر یورپ میں اس مذاق کو عام کیا۔ ان لوگوں میں پہلا شخص آرپی نیو نامی ایک عالم ہے جو ہالینڈ کا باشندہ تھا۔ مشرقی زبانوں کے شوق میں وطن سے نکل کر دور دراز ملکوں کی سیاحت کی اور متعدد زبانوں کو حاصل کر کے ۱۶۱۳ء میں ہالینڈ واپس آیا۔ ہالینڈ میں چوں کہ اس کی قابلیت کی شہرت پیشتر ہی سے ہو چکی تھی، اس لیے پہنچتے ہی لیڈن یونیورسٹی کا پروفیسر ہو گیا۔ اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہالینڈ کے مدرسوں میں عربی زبان کی تعلیم داخل ہو گئی اور صرف و نحو عربی میں سب سے پہلے ایک رسالہ ترتیب دیا (۷)۔

آرپی نیو کے بعد لافن وارزنڈی ایک شخص نے عربی کی طرف خاص توجہ کی، یہ عالم ۱۶۱۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۶۵ء میں وفات پائی۔ ۱۶۴۰ء میں مشرقی ممالک کا سفر کر کے عربی کی نادر کتابیں جمع کیں اور لیڈن یونیورسٹی کے کتب خانے میں داخل کر دیں۔

سترھویں صدی کے آخر تک اسی طرح خاص خاص لوگوں کی کوشش سے عربی لٹریچر کا مذاق ترقی کرتا رہا، لیکن اٹھارھویں صدی کے اوائل سے یورپ میں عربی کا وہ نیا دور شروع ہوا، جس نے موجودہ زمانے کی عظیم الشان توجہ کی بنا رکھی۔ اس دور کا افتتاح ایک فرانسیسی عالم پروفیسر سیل وسٹر کی تصنیفات سے ہوا، جو نہ صرف عربی کا ماہر تھا بلکہ مشرق کی دیگر مشہور زبانوں میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا۔ علاوہ اور تصنیفات کے اس کی ایک قابل قدر تصنیف عربی کی مبسوط صرف و نحو ہے، جس کی دو ضخیم جلدیں ۱۸۱۰ء میں چھپ کر شائع ہوئیں۔ اس کتاب میں مصنف

نے ایک مفید التزام یہ کیا ہے کہ جن جن صرفی و نحوی مسایل کو لکھا ہے، ان کے متعلق بطور شواہد کے عربی اشعار بھی پیش کر دیے ہیں (۸)۔

اس دور میں چند اسباب ایسے جمع ہو گئے جن سے عربی پر یورپ کو غیر معمولی توجہ ہوئی، من جملہ ان کے ایک بڑا سبب انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط ہے۔ مسلمانان ہند کا یہ زمانہ اگرچہ زمانۂ انحطاط تھا، مگر پھر بھی عربی تعلیم کا مذاق عام طور پر موجود تھا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ اور دہلی کے جو علما آج زیادہ مشہور ہیں، وہ اسی آخری دور کی یادگار ہیں، اس لیے انگریزوں کو بھی عربی پر توجہ ہوئی۔ اس توجہ سے جو مفید نتایج پیدا ہوئے ان میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور بمبئی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، لیکن اس کا مفصل بیان آگے آئے گا، یہاں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ انگریز بھی فرانسیسیوں کے ساتھ اس دور میں برابر کے شریک رہے۔ مشہور انگریز عالم لمسڈن (۹) نے کلکتہ میں چند مولویوں کی مدد سے ایک عمدہ کتاب صرف و نحو پر لکھ کر ۱۸۱۳ء میں شایع کی۔ اسی طرح کلکتہ میں دو اور رسالے اسی زمانے کے قریب قریب شایع ہوئے، جن میں سے ایک رسالے میں عربی کی چھوٹی بڑی حکایتیں جمع کی تھیں اور دوسرے رسالے میں الف لیلہ کے تیسرے حصے کا انتخاب اور ترجمہ تھا۔ (۱۰) اس دور میں صرف و نحو کی تین کتابیں اور قابل ذکر لکھی گئیں:

۱۔ علامہ ڈی والڈ جرمنی کی صرف و نحو عربی، ۱۸۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک چھپ کر لیپزگ سے شایع ہوئی۔

۲۔ علامہ کاسپری کی صرف و نحو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں چھپ کر لیپزگ سے شایع ہوئی، پھر علامہ اکسنس نے ترمیم و تہذیب کے بعد ۱۸۵۲ء میں دوبارہ شایع کیا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۸۸۷ء تک اس کے پانچ ایڈیشن نکل چکے تھے۔

۳۔ پھر ۱۸۵۹ء میں ایک انگریز عالم رایٹ نے کاسپری کی صرف و نحو کو چند مطالب بڑھا کر انگریزی ترجمے کے ساتھ دو جلدوں میں مرتب کیا، جو لندن میں چھپ کر شایع ہوئی۔

یورپ کے علما نے جب عربی زبان پر توجہ کی، تو ان کو صرف و نحو کی ایسی کتابوں کی تلاش ہوئی، جو ان کے لیے مفید ہوں۔ جب ایسی کتابیں نہیں ملیں تو خود انھوں نے کوشش کر کے کتابیں تصنیف کیں اور آنے والے زمانے کے لیے عربی زبان کی تعلیم کا سامان مہیا کیا۔ اس دور میں جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ اسی کوشش پر مبنی ہیں۔

یورپ اور عربی لغات کی ترتیب:

لیکن بڑا احسان جو یورپ نے عربی زبان پر کیا، وہ ان محققانہ لغتوں کی ترتیب ہے جن کی نظیر عربی میں نہیں مل سکتی۔ سب سے پہلا لغت جو یورپ میں شائع ہوا وہ ججیوس نامی ایک فاضل مستشرق کی تصنیف ہے جو انگلی کا رہنے والا تھا۔ پھر علامہ جولیس نے اس کی تنقید کی اور ۱۸۵۲ء میں اپنا عربی لغت لیڈن سے شائع کیا۔ یہ دونوں لغت چوں کہ صرف عربی کے تھے اس لیے علامہ ماتینس نے دو نہایت ضخیم جلدوں میں مشرق کی تین مشہور زبانوں عربی، فارسی، ترکی کا ایک جامع لغت تیار کیا اور ہر لفظ کا مطلب لاطینی اور جرمنی دونوں زبانوں میں درج کیا۔ اس لغت کا نام کنز اللغات الشرقیہ ہے۔ ۱۸۸۰ء میں وائنا دار السلطنت اٹلی سے چھپ کر شائع ہوا۔

اس کے بعد علامہ فرائیتگ نے چار جلدوں میں، اور کازی مرسکی نے فرنچ میں، اور باڈجر اور لین نے انگریزی میں چار لغت تیار کیے، جو ۱۸۳۷ء سے ۱۸۸۱ء تک چھپ کر شائع ہوئے۔ ان میں پہلا لغت یورپ میں زیادہ مشہور اور متداول ہے۔

ان سات لغتوں میں چھ لغت عربی کے عام لغتوں کی طرح ہیں جن میں کوئی خاص تحقیق یا جامعیت نہیں پائی جاتی لیکن ساتواں لغت، علامہ لین کا، اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس مصنف نے نہایت کوشش سے عربی کے تمام قاموس جمع کیے اور انگریزی میں ایک جامع لغت تیار کیا۔

لیکن جس بے نظیر لغت نے عربی کو ہمیشہ کے لیے اپنا مرہون منت بنا لیا، وہ مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر دوزی کا قاموس Sagg Lementaux Dictionnarv ہے، یعنی اضافہ لغت عربی پر۔ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے کتب خانے میں یہ لغت میری نظر سے گزرا ہے۔ دو ضخیم جلدوں میں وہ تمام الفاظ اور مصطلحات جمع کیے ہیں، جو عربی کے کسی لغت میں نہیں ملتے۔ کامل پچاس برس کی محنت اور تلاش سے یہ بے نظیر لغت تیار ہوا۔ تاریخ وادب اور علوم وفنون کی سیکڑوں کتابیں چھان ڈالیں اور جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ ملے، جمع کر لیے، پھر سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کر کے نہایت کوشش سے ان کا سراغ لگایا، اور تحقیق وتنقید کے بعد جو مفہوم ثابت ہوا، اسے لفظ بہ لفظ درج کیا۔ پہلی جلد کی ابتدا میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے، جن سے

اس لغت کی ترتیب میں مدد لی گئی۔ اس کے دیکھنے سے اس محقق کی تلاش و تحقیق کا سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون کون سی نایاب کتابیں جمع کیں اور کس طرح ان سے مبہم اور مشکوک الفاظ کا پتا لگایا!

مسلمانوں نے جب اسپین فتح کر کے ایک متمدن سلطنت کی بنا ڈالی تو آٹھ سو برس کے اثر نے اسپین کی ملکی زبان میں عربی کے سیکڑوں لفظ داخل کر دیے۔ یہ الفاظ آج بھی اسپینی زبان میں موجود ہیں، مگر اختلاف لب و لہجہ نے ان کی صورت اس طرح بدل دی ہے کہ ان کا سراغ لگانا آسان نہیں ہے۔ پروفیسر دوزی نے مدت کی محنت سے ایک لغت تیار کیا ہے، جس میں عربی کے وہ تمام الفاظ جمع کیے ہیں اور دکھلایا ہے کہ ان لفظوں نے موجودہ صورت کیوں کر اختیار کی اور عربی میں ان کی اصلی صورت کیا تھی؟ افسوس ہے کہ یہ دونوں بے نظیر لغت فرنچ میں ہیں اور ہم براہ راست ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ادب عربی کے منتخبات:

ان کتابوں کے علاوہ ایک اور چیز قابل ذکر ہے۔ یورپ نے عربی علم ادب کے نہایت مفید منتخبات ترتیب دیے ہیں۔ اور ان منتخبات میں ادب کی بعض ان کتابوں کا انتخاب ہے، جو اس وقت تک چھپ کر شائع نہیں ہوئیں اور یورپ کے خاص خاص کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بعض منتخبات میں عربی کی قدیم شاعری کے نمونے دیے ہیں، بعض میں ضرب الامثال اور عرب کی اصطلاحات جمع کی ہیں۔ اس قسم کی چودہ کتابوں کے نام اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں، جن میں سے دو کتابیں بیروت میں اور باقی لندن، برلن اور پیرس وغیرہ میں چھپی ہیں۔

لغت دارجہ کی صرف و نحو:

آج کل جو عربی عام طور پر نجد کے علاوہ تمام عرب میں مستعمل ہے، اس کو لغت دارجہ کہتے ہیں۔ یورپ نے دارجہ کے بھی صرف و نحو لکھے ہیں اور نہایت اہتمام سے لکھے ہیں۔ سب سے پہلے کانس تانی مستشرق نے ۱۸۷۵ء میں دارجہ کی صرف و نحو لکھی اور اسپین میں چھپ کر شائع ہوئی۔ پھر دوبیے نے لکھ کر وانیا سے شائع کی۔ اسی طرح ۱۸۹۰ء تک بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں صرف ایک کتاب مصر کے ایک مسلمان عالم کی تصنیف ہے جو غالباً یورپ ہی کی تحریک سے لکھی گئی۔

لغت دارجہ کے مجموعۂ امثال:

صرف و نحو کے علاوہ لغت دارجہ کی ان ضرب المثلوں کو بھی (جو عام زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں) یورپ کے بعض عالموں نے نہایت کوشش سے جمع کیا ہے اور عرب کے مختلف حصوں کے مجموعے الگ الگ ترتیب دیے ہیں۔ مثلاً علامہ لینڈ برگ نے خاص شام کی ضرب المثلیں جمع کی ہیں۔ باوجر نے صرف مکہ معظمہ کے امثال ترتیب دیے ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ سوسین نامی ایک مصنف نے ایک جامع "مجموعۂ امثال" ترتیب دیا ہے جس میں عام طور پر دارجہ کے تمام امثال اور حکیمانہ مقولے جمع کیے ہیں۔

امثال کے علاوہ جو قصے اور چھوٹی چھوٹی حکایتیں عرب کے مختلف خطوں میں مشہور ہیں اور جن سے ان کے اخلاق و عادات اور طرز معاشرت کا پتا چل سکتا ہے، جرمنی کے چند مستشرقوں نے ان کو بھی نہایت تلاش سے جمع کیا ہے۔ اس قسم کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں:

۱۔ سوسین کا مجموعۂ حکایات، جس میں موصل اور ماردین کی حکایتیں جمع کی ہیں۔ یہ رسالہ مضمون کی صورت میں جرمنی کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔

۲۔ سی، ہ بیک کا مجموعہ جو ۱۸۸۴ء میں لیڈن سے چھپ کر شائع ہوا۔

۳۔ لینڈ برگ کا مجموعہ جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی، لکھنؤ

الندوہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۰۸ء ص۳۱۴۳۳

حواشی

۱۔ الندوہ کے کسی گذشتہ نمبر میں ابن رشد کی لائف کا دوسرا نمبر نکل چکا ہے، جس میں اسلامی فلسفے کی اشاعت کے اسباب و حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ اس مضمون کو پڑھتے ہوئے ناظرین اس نمبر کو بھی پیش نظر رکھیں۔ تفصیلی حالات کے لیے اس مستقل مضمون کا انتظار کیجیے جو اس عنوان پر عن قریب شائع ہوگا۔

(اس حاشیے میں ابن رشد پر علامہ شبلی کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جو الندوہ کی جلد ا کے تیسرے اور ساتویں شمارے میں شائع ہوا تھا اور اس کی آخری اور تیسری قسط جلد ۳ کے چھٹے شمارے (اگست ۱۹۰۶ء) میں شائع ہوئی تھی۔ ا۔ س۔ ش)

۲۔ سیاحت المعارف ص

۳۔ سیاحت المعارف، ص ۲۹۷

۴۔ ایضاً، ص ۲۹۷ و ۳۲۱

۵۔ سیاحت المعارف ص ۳۰۰

۶۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

۷۔ ارپی نیس کی ولادت ۱۵۸۴ء اور سال وفات ۱۶۲۴ء ہے۔ صرف و نحو کے علاوہ اور تصنیفات حسب ذیل ہیں۔ عربی تعلیم کا ابتدائی رسالہ، عربی اور عبرانی کا باہمی تعلق "عہد جدید" کا عربی میں ترجمہ، چند کتابوں کا عربی سے لاطینی میں بھی ترجمہ کیا لیکن اس کا تفصیلی حال معلوم نہیں۔

۸۔ پروفیسر سیل وسٹر کا پورا نام "ان توان آئزک سیل وسٹر دے ساسی" ہے۔ بچپن میں صحت کی حالت اچھی نہ تھی۔ اس نے ابتدائی تعلیم ایک پرائیویٹ استاد سے حاصل کی۔ باوجود اس کے ذہن اس قدر تیز تھا کہ کم عمری ہی میں یونانی اور لاطینی میں کافی لیاقت پیدا کر لی۔ بارہ برس کی عمر میں ایک فاضل راہب کی ملاقات ہوئی جس کا نام "بے تی ذیب نامی" تھا۔ اس راہب کی صحبت سے مشرقی زبانوں کا شوق پیدا ہوا اور دس برس کی محنت اور مطالعے سے مشرق کی سات مشہور زبانوں میں غیر معمولی قابلیت حاصل کر لی۔ ۱۷۸۰ء میں جب کہ اس کی عمر صرف تیس برس کی تھی، انجیل کے بعض اہم مسائل کا پتا لگایا اور ۱۷۸۵ء میں اکاڈمی آف انس کرپ شنز (یعنی قدیم کتبہ جات کی انجمن) کو وہ قابل قدر یادگاریں نذر دیں۔ ان دو کارناموں نے اس کی شہرت دور دور تک

پہنچ گئیں اور یورپ کی تمام علمی انجمنیں ان کی قدر دانی کے لیے آمادہ ہو گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فرانس میں ہر طرف پولیٹکل بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور عن قریب بغاوت کی آگ مشتعل ہونے والی تھی۔ ١٨٠٠ء میں ایکایک یہ آگ بھڑکی اور فرانس میں انقلاب ہو گیا۔ اس بے اطمینانی کے زمانے میں وہ مشرقی لٹریچر کی بعض اہم تحقیقات میں مشغول تھا۔ کچھ عرصے کی خوں ریزی کے بعد جب دوبارہ بادشاہت قائم ہوئی تو گورنمنٹ کی طرف سے اس کی خاص طور پر قدر دانی کی گئی، اور جینوا بھیجا گیا تاکہ ان مشرقی نسخوں کا مطالعہ کرے، جو اس شہر میں محفوظ تھے ١٨٠٥ء میں جینوا سے واپس آیا اور اپنی تحقیقات کی رپورٹ کالج میں پیش کی۔ پھر ١٨٠٦ء میں فارسی مدرسہ کا پروفیسر مقرر کیا گیا اور نپولین اول شاہ فرانس نے زیکوری کے عہدے پر سرفراز کیا۔ اس عرصے میں فرانس کی پولیٹکل حالت میں دوبارہ انقلاب شروع ہوا اور ١٨١٠ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہو کر نئے سرے سے بوربون قائم ہوئی۔ اس زمانے سے دے ساسی کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اول سررشتہ تعلیم کی کونسل کا ممبر مقرر کیا گیا۔ پھر ایشیاٹک سوسائٹی پیرس کا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ یہ ایک ایسی علمی جماعت تھی، جس کی بالذات بھی وہ بہت کچھ مدد کیا کرتا تھا۔ وہ اس منصب کے مدت میں ممتاز تو بہ مقبول ہوئی۔ ور شاہی کتب خانے کے مشرقی حصے کا محافظ اور کالج آف فرانس میں پرشین کا لائبریرین مقرر کیا گیا۔ اس ممتاز محقق نے من جملہ دیگر کتابوں کے عربی صرف و نحو پر ایک ضخیم کتاب لکھی، جو پندرہ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسی کی کوششوں سے پیرس میں اردو، سنسکرت اور چینی زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی کی تجویز و ہدایت سے روس اور جرمنی میں مشرقی زبانوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ سال ولادت ١٧٥٨ء اور سال وفات ١٨٣٨ء ہے۔ صرف و نحو کے علاوہ دیگر تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

تذکرہ شعرائے عجم، اصول صرف و نحو، اس میں مختلف مصنفین عرب کے کلام نظم و نثر کا انتخاب ہے۔ ایک عربی قصے کا ترجمہ، قدامت فارس، مذہب   کے حالات، یہ آخری تصنیف ہے۔ اس میں شام کے ایک پر اسرار مذہب کے حالات درج کیے ہیں۔ (انسائکلوپیڈیا آف بریٹانیکا سے نقل)

٩۔ اس کا پورا نام "لمسڈن میتھیو ایل ایل ڈی" ہے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا عربی اور فارسی کا پروفیسر تھا۔ عربی کے علاوہ فارسی میں بھی اس کی ایک صرف و نحو موجود ہے۔ ١٨٣٠ء میں ایسٹ انڈیا (کمپنی) کی ملازمت ترک کر کے انگلستان گیا اور وہیں مشاغل میں مصروف رہا۔ ولادت ١٧٧٧ء اور وفات ١٨٣٥ء۔

١٠۔ وقائع ولیم جونس، مصنفہ مولوی کبیر الدین احمد مرحوم کا دیباچہ۔

ندوۃ العلماء کا اجلاسِ دہلی

اور

قوم کی شاہراہِ مقصود

ندوۃ العلما کا تیرھواں سالانہ اجلاس، جو ۲۶ر مارچ ۱۹۱۰ء کی صبح کو متضاد امیدوں اور یاس آمیز توقعات کے ہجوم میں نظر آیا تھا، ۲۸ر کی شام کو جب رخصت ہوا تو ہر شخص نے محسوس کیا کہ شادمانی اور خوش کامی کے مصافحے سے اس کا وداع خالی نہ تھا۔ اس کی ابتدا گو امید و بیم سے ہوئی مگر خاتمہ یک سر جوش و اثر تھا! وہ ایک شان دار تاریخ ہمارے حافظے میں یادگار چھوڑ گیا ہے، جس کے نتائج پر غور و عمل کرنے کے لیے بارہ مہینے کی فرصت میں سے ہمیں ایک دن بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے اور اس کی سہ روزہ صحبت کے واقعات پر اطمینان اور تفصیل کے ساتھ نظر ڈالنی چاہیے۔

اجلاس کی اہمیت کا اعلان:

انسان نتائج کی جب قیمت لگاتا ہے تو توقعات کا پیمانہ اُس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ گذشتہ اجلاس سے عام توقعات کے علاوہ ملک کو خاص توقعات بھی پیدا ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے جلسے کی کامیابی کا معیار خود بہ خود ارفع و اعلیٰ ہو گیا تھا۔ جلسے سے پہلے مولانا شبلی نعمانی کا ایک مبسوط آرٹیکل اخبارات میں شائع ہوا تھا، جس میں وہ اہم امور پیش کیے گئے تھے، جن کو جلسے میں پیش ہو کر طے ہونا تھا۔ ان میں سے ہر ایک مسئلہ اوّل تو بجائے خود اہم اور عظیم الشان تھا، پھر ملک کی ایسی بدیہی ضرورتوں سے تعلق رکھتا تھا، جن کو تمام قوم محسوس کر رہی تھی اور مدت سے کسی قابلِ اعتنا صدا کی منتظر تھی۔

اشاعت احکام مذہبی ضروریات کے لیے مرکز کی تاسیس، ایک جامع اکمل سیرۃ نبوی کی تدوین، یہی ایسے مقاصد ہیں جن کے لیے موجودہ زمانے میں قوم کے اندر جس قدر انتظار اور بے چینی پیدا ہو کم ہے۔ پس ان کے اعلان نے قدرتی طور پر قوم میں ایسے توقعات پیدا کر دیے تھے جن کا پیمانہ بہت وسیع تھا اور یہ اجلاس جب تک اس پیمانے پر ٹھیک نہ اترتا امیدوں کا صحیح جواب نہ تھا۔

اس کے علاوہ ندوے کی نئی زندگی کو تقریباً پانچ چھ سال کا زمانہ گزر گیا۔ اس عرصے میں اس کی آواز نے از سر نو اثر پیدا کیا اور جو افسردگی عموماً ملک میں پیدا ہو گئی تھی وہ گورنمنٹ کی توجہ، بعض فیاضانِ قوم کے عطیات اور خود ندوے کی رفتار ترقی کی تیزی سے رفتہ رفتہ دور ہو گئی۔ پس ہم یہ بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ دہلی کا اجلاس جو سنگ بنیاد کے جلسے کے بعد پہلا اجلاس ہے کہاں تک قوم کی ہمدردی اور دلی فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے؟ اور قلم و زبان کی جو سرگرمیاں نظر آ رہی ہیں اس میں دل کہاں تک شریک ہے؟

دہلی مرحوم:

اور پھر ان وجوہ سے قطع نظر اس اجلاس کی اہمیت کے لیے دہلی کا لفظ بجائے خود ایک قدرتی اثر تھا۔ وہ سرزمین جس کی مسجد کے سربفلک مینار اور جس کے قلعے کی خوبصورت برجیاں ہماری برباد شدہ عظمت کی افسانہ خواں ہیں اور جس کا چپہ چپہ اسلامی تمدن کے گزرے ہوئے قافلے کا نقش قدم ہے، اپنی صدیوں کی مسلسل عظمت اور دائمی اثر کے ساتھ سامنے تھی، وہاں ملت مرحومہ کے مرثیہ خواں جمع ہو کر رونے اور رلانے کے لیے صف ماتم بچھانے والے تھے اور جس خاک نے ولی اللہ جیسے حکیم الملت علما پیدا کر کے پھر اپنی آغوش میں لے لیے تھے، اس سے شکوہ کرنا تھا کہ

تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے؟

اور ندوہ جو صوبہ اسلامیہ کے تنزل کا افسانہ خواں ہے، اس کے لیے دہلی سے بڑھ کر اور کون سا مقام ماتم کدہ بن سکتا تھا، جس کی خاک کا ایک ایک ذرہ نہیں معلوم کن کن علما اور حاملین مذہب کے استخوان زیر قدم کا سرمایہ ہے، جو ہماری صدیوں کی علمی اور مذہبی زندگیوں کا مزار اور مدفن ہے، جس سے بڑھ کر اور کوئی خاک ہماری خوں افشانی حسرت کی حق دار نہیں۔ جس کا نام سنتے ہی اگر ہمارا دل وہ غم کدہ نہ ہو تو اس قابل نہیں کہ پہلو میں جگہ پا سکے!

توقعات کے ساتھ موانع:

لیکن ایک طرف تو توقعات اور امید ہائے پے در پے کا یہ حال تھا اور دوسری طرف موانع چند در چند ایسے جمع ہو گئے تھے جو جلسے کے انعقادِ محض کی طرف سے بھی شک و شبہ پیدا کرتے تھے۔ اوّل تو مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ نہایت شان و شکوہ کے ساتھ اخیر جنوری میں منعقد ہو چکا تھا جس پر اہلِ دہلی وقت اور روپیہ جی کھول کر خرچ کر چکے تھے اور ندوے کی تاریخ انعقاد تک جو مہلت انھیں ملی بھی تھی وہ ڈیڑھ ماہ چند یوم سے زیادہ نہ تھی۔ اس طرح تقریباً ایک ہی زمانے میں ایک گھر کو دو دو مہمان خاندانوں کی میزبانی کے لیے تیار ہونا پڑا۔ اور واقف کار سمجھ سکتے ہیں کہ میزبان کے لیے یہ کیسا سخت امتحان ہے! اس پر طرّہ مسلمانوں کا عالمگیر قحط الرجال اور بالخصوص دہلی کی عام افسردگی کہ کام کرنے والے آدمی ہر جگہ کم ہوتے ہیں اور دہلی میں کم تر۔ پس یہ کیسا مشکل موقع تھا کہ جو لوگ لیگ کی میزبانی سے فارغ ہو کر رفع تکان کے لیے آرام بھی کرنے نہ پائے تھے انھیں ندوے کے لیے پھر اٹھ کر کھڑا ہو جانا پڑا۔

مقامی حالت:

اس کے علاوہ مقامی حالات کچھ اس طرح کے واقع ہوئے تھے کہ بعض اشخاص نہ صرف جلسے کے لیے غیر مستعد بلکہ بہ وجوہ چند در چند سنگ راہ بننا چاہتے تھے۔ وہ ان کے لیے ایک کڑوی کسیلی دوا تھی اور ممکن نہ تھا کہ منھ بنائے بغیر وہ اس تلخ گھونٹ کو حلق سے اترنے دیتے۔ پھر یہ بھی تھا کہ گو ندوے نے بھولے سے بھی ایسا ارادہ نہیں کیا، لیکن اس کا وجود قدرتی طور پر ان کے اغراض و منافع کے لیے ایک ناقابلِ دفاع حملہ تھا، اور حملے سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ خود ہی حملہ آور ہو جاتے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، لیکن بالآخر دوا پینی پڑی اور شکست کی ذلت اور حقارت کو ناگزیر دیکھ کر اس کے لیے بھی آمادہ و مستعد ہو جانا پڑا۔

غرضے کہ لیگ کے جلسے میں طاقتیں صرف ہو چکی تھیں، فرصت اور مہلت بالکل نہ تھی، کام کرنے والوں کی قلت، مقامی حالات پیچیدہ، ایک چالاک اور مخفی جماعت (گو ایک شرذمۂ قلیل) آمادۂ مخالفت و پیکار۔ پھر اس پر طرّہ موسم کی مخالفت کہ گرمی پورے طور پر شروع ہو چکی تھی

اور جلسہ پنڈال میں قرار پایا تھا۔ اس کے علاوہ ہر جلسے کی کامیابی کے لیے پہلی چیز اجتماع کی کثرت ہے۔ مگر چند سالوں سے ایسٹر کی تعطیل بھی کرسمس کی طرح سالانہ اجلاسوں کا موسم بنتی جاتی ہے۔ اور بالخصوص پچھلی تعطیل میں تو ملک کا کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی بڑی کانفرنس یا کم از کم مقامی انجمن کا سالانہ اجلاس نہ ہوا! پنجاب میں انجمن حمایت اسلام لاہور، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن اصلاح راجپوتانِ ہند پٹیالہ کے سالانہ جلسے تھے، ادھر یوپی میں علی گڑھ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا سالانہ ڈنر، اور بدایوں میں کوئی اُردو کی انجمن ہے، اس کا سالانہ اجلاس تھا۔ پھر بنارس میں صوبے کی کانفرنس بھی ندوے ہی کی تاریخوں میں منعقد ہوئی تھی۔ ادھر بنگال، مدراس، اور برار میں بھی پراونشیل کانفرنسوں کے اجلاس تھے اور ان چھوٹے جلسوں اور انجمن ہاے اسلامیہ کے سالانہ اجلاسوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں ہو رہے تھے۔ اگر ملک میں عام بیداری اور قومی مجالس سے دل چسپی ہوتی تو خواہ ایک ہی وقت میں کتنے ہی جلسے کیوں نہ ہوتے مگر ہر جلسہ اپنے لیے کافی جماعت موجود پاتا۔ لیکن قوم میں یہ مذاق صرف ایک خاص گروہ میں محدود ہے اور اس کا یہ حال ہے کہ

واے بر صیدے کہ یک باشد و صیادے چند

اس لیے اتنی تقسیمات کے بعد سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ندوے کے حصے میں آنے کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟ پس علاوہ دیگر اسباب ناامیدی کے کچھ عجب نہیں کہ ندوے کو اپنے دوستوں کی نسبت اس لحاظ سے بھی ناامیدی ہو کہ

محال ست ایں کہ بر دامِ نگاہِ ما گذر افتد
غزالے را کہ از پے صد کمند انداز می آید

جلسے کی حیرت انگیز کامیابی:

لیکن با ایں ہمہ عالمِ امید و بیم، جلسہ جس شان و شکوہ، عظمت و رفعت، کیفیت و اثر، جوش و خروش اور ہر حیثیت سے اکمل و اجمل ہوا، اس کی نظیر ندوے کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس کی عظمت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب موانع مندرجہ صدر کو ان کی اصل تفصیل اور طاقت کے ساتھ پیش نظر رکھ لیا جائے۔ نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ کامیابی عام نظر اعتقاد سے نہیں دیکھی گئی بلکہ

ان توقعات کی محک پر جانچی گئی ہے جو بعض اہم مسائل کے اعلانات اور ندوے کے دورِ جدید کے اثر سے خود بخود دلوں میں پیدا ہو گئے تھے۔ چوں کہ ہم کو یقین ہے کہ یہ جلسہ اپنے نتائج کے لحاظ سے زمانۂ جاری کا اہم ترین واقعہ ہے اور ہمیشہ اس حیثیت سے یادگار رہے گا، اس لیے چاہتے ہیں کہ اگر فرصت ساتھ رہے تو جلسے کے واقعاتِ سہ روزہ کو ایک ایک کر کے نظرِ نقد کے سامنے دہرائیں، کیوں کہ جلسے کا زمانۂ ماسبق محض سعی و امید و بیم اور جلسہ صرف ایک دل چسپ مصروفیت ہے، مگر اصلی زمانہ وہ ہے جو جلسے کے بعد سے شروع ہوتا ہے کیوں کہ عمل کا زمانہ وہی ہے۔

اجلاس کا موقع:

اس جلسے کی کامیابی کا پہلا واقعہ مقامِ اجلاس کی موزونیت اور دل فریبی ہے۔ اور کامیابی کا کریڈٹ سب سے پہلے ان اربابِ ہمت کو ملنا چاہیے جو عربک اسکول جیسی وسیع اور شان دار عمارت کو منتخب کرنے اور پھر حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ خوش منظر عمارت اجمیری دروازے کے باہر ایک وسیع خطۂ زمین پر واقع ہے اور اس درجے شان دار، خوش قطع اور خوش وضع ہے کہ اگر اس کی تاریخ معلوم نہ ہو تو بمشکل یقین آ سکتا ہے کہ یہ کسی عربی درس گاہ کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ بلند اور قدیم عربی وضع کے دروازے سے گزرنے کے بعد ایک وسیع اور مربع صحن کی فرحت بخش فضا نظر آتی تھی۔ جس میں سامنے کی طرف سرخ پتھر کی خوش نما مسجد بنی ہوئی ہے اور چاروں طرف حاشیہ چھوڑ کر باقی حصے میں سبزے کا فرش مخملی اور پھر اس فرش کا طراز مختلف پھولوں اور خوبصورت درختوں کی چمن بندی ہے۔ صحن کے تینوں طرف دو منزلہ عمارت کا سلسلہ ہے، جس کی دونوں منزلوں میں نہایت وسیع اور ہوادار و روشن بورڈنگ کے کمرے بنے ہیں۔ ایسی طرب انگیز عمارت دہلی میں جلسے کے لیے نہیں مل سکتی تھی۔ ندوے کے تمام مہمان اسی میں ٹھہرائے گئے۔ گویا ان کے پورے چوبیس گھنٹے یکساں طور پر ایک بہترین تفرج گاہ میں بسر ہوتے تھے۔

اس عمارت کے پہلو میں ایک وسیع میدان اسکول کے ملحقات میں سے ہے۔ اسی میں اجلاس کے لیے پنڈال بنایا گیا تھا اور شان و وسعت کے لحاظ سے ایک عظیم الشان جلسے کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔ تقریباً ایک ہزار ممبر اور وزیٹر اس میں بہ سہولت جمع ہو سکتے تھے اور اس کامیابی کو اربابِ دہلی کی حسن نیت اور خلوص کی طرف منسوب کریں یا قوم کی خوش طالعی سمجھیں کہ جگہ کی

وسعت اور اشخاص کی قلت جو کسی مجمع کی کمی کا نمایاں مگر بدتر سے بدتر منظر ہوتا ہے وہ باوجود پنڈال کی غیر معمولی وسعت کے الحمدللہ! اجلاس کی کسی نشست میں خالی نظر نہیں آیا۔

حضرات دہلی نے اس موقع پر جس جوش و خلوص اور محنت و جاں فشانی کے ساتھ جلسے کا انتظام و اہتمام کیا، اس کا صحیح اندازہ ہمارے لیے بہت مشکل تھا کیوں کہ دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو ان دقتوں اور کلفتوں کا کیا علم، جن سے کارکنان مطبخ کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن تاہم جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ جلسے کے موقعہ و محل کا انفصال بہت ناوقت ہوا اور عربک اسکول اس وقت ملا، جب جلسے کی تاریخیں بالکل سر پر آ گئی تھیں تو بلا مبالغہ الف لیلہ کا وہ عالی شان محل یاد آ گیا، جس کو الہ دین کے عجیب و غریب موکل نے چند لمحوں کے اندر کھڑا کر دیا تھا۔ کیوں کہ ۱۵ دن سے بھی کم مدت کے اندر ایسے وسیع اور موزوں پنڈال کا مع اپنی تمام جزئیات کے تیار ہو جانا اور ایسی حالت میں کہ قطب صاحب کا عرس اور ہولی کی وجہ سے کام کرنے والوں سے شہر بھر خالی تھا، کچھ کم عجیب واقعہ نہیں ہے۔ بالآخر ہم نے یہ سمجھ کر اپنے تعجب کو دور کیا کہ غیر مرئی اور مافوق العادت مخلوقات کی قدیم روایات کی بہر صورت تصدیق کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ارباب دہلی اس بارۂ خاص میں الہ دین جیسے خوش قسمت نہ ہوں مگر عزم راسخ، جوش و خلوص اور ادائے فرض کے معجزہ خیز موکلوں کی جماعت تو ضرور ان کے قبضے میں ہے، اور یہ نیرنگ آرائیاں موکلوں کی اعانت بغیر ممکن نہیں۔

ہماری قوم میں ایسے دقیقہ سنجوں کی تو کمی نہیں ہے جو فن تعمیر کے دقائق کو سمجھ سکیں مگر مزدوروں کا عالم گیر قحط ہے اور کام کرنے والے ہر جگہ مفقود ہیں۔ پس دہلی کے میزبانوں کی عزت ہمیشہ ہماری نظروں میں رہے گی کہ انھوں نے ادائے فرض کی ایک بہتر سے بہتر مثال قائم کر دی۔ ان کا عزم راسخ ایک فتح یاب قوت تھی جس کے سامنے ہر مانع اور ہر مخالف کو سر شکست جھکانا پڑا۔

وتلک الامثال نضربها للناس لعلهم یتفکرون۔

ڈیلی گیٹس اور عام شرکاء کی کثرت:

مجمع کے لحاظ سے یہ جلسہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور قائم مقاموں کا بہتر سے بہتر اجتماع تھا، جس کی دہلی جیسے شہر میں توقع کی جا سکتی ہے۔ سوء اتفاق سے زمانہ ایسا ملا تھا کہ ملک کے ہر حصے میں کانفرنسوں اور انجمنوں کے جال بچھے ہوئے تھے مگر ندوہ کی صدائیں کچھ ایسی کشش اور

مقناطیسیت تھی کہ ایک بہت بڑا گروہ تو دامن بچاتا ہوا ۲۶؍ مارچ تک دہلی پہنچ گیا اور جن لوگوں کے دامن الجھے وہ بھی صیاد از دام جستہ کی طرح کسی نہ کسی طرح نکل کر دوسرے اور تیسرے دن کے جلسوں میں شریک ہوگئے۔ پنجاب کے معززین اور تعلیم یافتہ طبقے کا ایک بڑا گروہ اپنے صوبے کا کامل طور پر قائم مقام تھا، جن کی بے نظیر دلچسپی ندوے کے لیے نئی امیدوں کا ایک جاں فزا باب تھی۔ علی گڑھ میں چوں کہ ۲۶ تک اولڈ بوائز ڈنر اور سرسید کی برسی کے جلسے تھے اس لیے پہلے اجلاس میں وہ اصحاب شریک نہ ہوسکے جن کا علی گڑھ میں شریک ہونا لازمی تھا۔ لیکن دوسرے دن وہاں سے بھی ایک جماعت آگئی، جس میں نواب وقار الملک بہادر کا ذکر کیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح کشمیر اور بمبئی جیسے دور دراز مقامات سے ڈیلی گیٹس کا جلسے میں موجود رہنا اس کی وسعت اثر کے ثبوت کے لیے شاہد عادل تھا۔ پنجاب کے علاوہ صوبہ اودھ و آگرہ کے تقریباً ہر ضلع سے بکثرت اشخاص شریک ہوئے اور اس طرح ندوہ اپنے مرکزی مقام کے صوبے پر رفتہ رفتہ جس درجہ مؤثر ہوگیا ہے اس کا نمایاں ثبوت بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ دہلی کے اطراف و جوانب کا ذکر تو لاحاصل ہے، کیوں کہ جو آواز کشمیر، بمبئی اور کلکتہ سے اپنے عشاق کو کھینچ لائے، یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس کے ہمسایے کس بے قراری کے ساتھ بے اختیارانہ دوڑے ہوں گے!

حضرات علما کی جماعت بھی مختلف اطراف ملک سے بکثرت آئی۔ عام شرکا اور مقامی وزیٹروں کی تعداد کا یہ حال تھا کہ تقریباً ہر اجلاس میں پنڈال بھرا ہوا نظر آتا تھا اور اس خصوصیت کے لحاظ سے تو اس اجتماع کو جس قدر امتیاز دیجیے کم ہے کہ جو ہجوم و ازدحام پہلے دن کے اجلاس میں تھا وہ آخیر تک برابر قائم رہا۔ شہر کے معززین اور تعلیم یافتہ بھی ہر اجلاس میں شریک غالب رہے اور یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہوا کہ معمولاً جلسہ صرف ممبروں اور وزیٹروں کا تھا اور ٹکٹ کے بغیر کوئی شخص شریک نہیں ہوسکتا تھا۔

انتظامی حالت:

عام انتظامی حالت کے لحاظ سے تو ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی ایسے پبلک جلسے کے لیے، جس میں سیکڑوں اشخاص شریک ہوئے ہوں، اس سے زیادہ بہتر انتظام کے تصور سے ذہن عاجز ہے۔ جن لوگوں کو اس قسم کے انتظامات کی ذمے داری کا تجربہ ہوا ہے، صرف

وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سیکڑوں مہمانوں کی میزبانی کس درجے مشکل اور پراز صعوبات گوناگوں کام ہے۔ بڑی دقت عام انتظام کی ان بیسیوں جزئیات میں ہوتی ہے جو کام سے پہلے تو ذہن میں نہیں آسکتیں، لیکن جب کام شروع ہو جاتا ہے قدم قدم پر اُن سے الجھنا پڑتا ہے اور بسا اوقات ایک ذرا سی مجبورانہ غلطی سے سارے کا سارا کام بگڑ جاتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ جزئیات میں کسی ایک جزئی امر کی بدنظمی سے پورا کام اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے۔ لیکن کار فرمایانِ دہلی نے اس اخلاقی اصول کی عملی مثالوں میں ایک نئی مثال کا اضافہ کر دیا کہ عزمِ راسخ اور فرض کے خیال سے جو محنت پیدا ہوتی ہے، وہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو ممکن نہیں کہ ہر قسم کی کامیابیوں کا حاصل کرنا انسان کے قبضے اور قابو میں نہ ہو۔ اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کو بھی کوئی نہ کوئی شکایت سننی پڑتی ہے۔ مگر ہم نے یہ بات اب کی صرف دہلی ہی میں دیکھی کہ مہمانوں کے مجمع کثیر میں، جو مختلف مذاق اور عادات کا مجموعہ تھا اور جن میں سے تقریباً ہر شخص اپنے لیے کوئی نہ کوئی مخصوص ضرورت رکھتا تھا، پورے تین بلکہ چار سے بھی زیادہ دنوں کے اندر ایک زبان بھی حرفِ شکایت سے آلودہ نہ ہوئی۔ بلکہ جس شخص کو دیکھا اپنے باحوصلہ میزبانوں کے کسی نہ کسی نئے وصف میں رطب اللسان نظر آیا۔

ڈائننگ ہال کا انتظام اتنا عمدہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ ہم کو یقین ہے تمام مہمان یہ اثر بھی اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے کہ عمدہ اور لذیذ کھانے صرف دہلی ہی میں پک سکتے ہیں! گویا انھوں نے اپنے حسنِ انتظام سے دہلی کی نسبت واقعی مبالغے کے ساتھ ایک عام حسنِ ظن پیدا کرنے میں مدد دی، لیکن اگر ہم ایک ایک مہمان سے مل سکتے تو ضرور کہتے کہ اس خیال کی صحت میں تو شک نہیں مگر اتنا تتمہ اور بڑھا دیجیے کہ بہ شرطے کہ میزبانانِ دہلی ہی کی طرح فیاض، باحوصلہ، نیز خوش سلیقہ میزبان بھی میسر آئیں۔

مشکل یہ ہے کہ نئی تہذیب کے قوانین کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ میزبان کے حسنِ اخلاق اور لطف و تواضع کی جتنی تعریف ممکن ہو کیجیے مگر خوبیِ طعام کے حظ و لذت کے اعتراف کو صرف کام و زبان کے اقرارِ پنہاں تک محدود رکھیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم حوصلہ مندانِ دہلی کی اس عرب روشی کی کئی صفحوں میں داد دیتے اور پھر افسوس کرتے کہ حقِ تحسین ادا نہ ہو سکا۔

عین جلسے میں تین دن تک جو امن و سکون رہا وہ یوں بھی شاہدِ حسنِ انتظام تھا مگر جن اصحاب

کو ان پوشیدہ اور مخالفانہ سازشوں کا افسانہ معلوم ہے، جس کی آگ جلسے کے بعد تک برابر سلگتی رہی اور جس کے شرارے خود جلسے کی فضا میں بھی چند لمحوں کے لیے نظر آ گئے تھے، وہ یقیناً اس اعتراف میں ہمارا ساتھ دیں گے کہ طاقت اور تدبر کے اعلیٰ درجے کی دانش مندانہ انتظامی قوت اگر منتظمین کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو جلسے کی کامیابی ایک طرف، امن و سکون کے ساتھ انعقاد بھی مشکل تھا۔

ہر طاقت ور ہاتھ، جس میں تلوار ہو، اپنے مخالف کو شکست دے سکتا ہے، لیکن تحسین اسی فاتح کے لیے ہے جو اسلحہ کے استعمال کے بغیر حریف کو اپنے قابو میں کرے۔

بہرکیف یہ تو جلسے کے انتظامات تھے اور مختصر یہ ہے کہ اہل دہلی نے ہر حیثیت سے اپنے آپ کو ایک نمونہ اور مثال ثابت کیا لیکن بہتر یہ ہے کہ اب اسٹیج کی طرف رخ کریں۔ تفصیل روداد تو ارکان ندوہ کو لکھنی چاہیے اور وہ لکھیں گے مگر میں صرف مہمات امور پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد روداد نہیں صرف نتائج ہیں۔ چوں کہ میں دہلی پہنچتے ہی سخت بیمار ہو گیا اس لیے بذاتِ خود ہر اجلاس میں شریک بھی نہ ہو سکا۔

جلسے کا پُر اثر آغاز:

دس بجے تقریباً جلسے کا ہال لبریز تھا۔ ندوے کے ہر اجلاس میں ابتدا کے چند لمحے نہایت قیمتی اور مقدس ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی آواز جو اس کی فضا میں بلند ہو کر دلوں پر گرتی ہے، وہ انسانی آواز نہیں ہوتی وہ صدائے رعد آسائے حق جو گذشتہ تیرہ سو برس سے دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور ہماری حیات و بقا کا مبدا ہے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی ہے اور ہم مدہوشانہ اس کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ اس اجلاس کا فاتحۃ الکتاب بھی یہی آواز تھی۔

سب سے پہلے خان بہادر مولوی عبدالاحد صاحب آنریری مجسٹریٹ نے بہ حیثیت پریسیڈنٹ ریسپشن کمیٹی اپنا مطبوعہ ایڈریس پیش کیا۔ یہ ایک دل چسپ تحریر تھی، جس میں ندوے کا نہایت خلوص آمیز جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا تھا اور ریسپشن کمیٹی کے ایڈریس میں جن بیانات کی عموماً توقع کی جاتی ہے وہ سب نہایت موزوں انداز اور ترتیب سے اس میں موجود تھے۔ اس کے اختتام کے بعد صدارت کا حسب معمول انتخاب ہوا اور حاذق الملک حکیم اجمل خان صاحب نے اپنا مطبوعہ پریسیڈنشل ایڈریس پڑھنا شروع کیا۔

پریسی ڈنشیل ایڈریس:

پریسی ڈنشیل ایڈریس ہمیشہ پبلک مجالس کی اہم ترین کارروائی سمجھی جاتی ہے اور جلسے کی اہمیت اور رفعت کا پیمانہ اسی سے قائم کیا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی علمی اور دماغی کم مائیگی نے اس کے بے اثر نمونے اس کثرت سے پیش کیے کہ اب ہمارے جلسوں میں عموماً اس کے لیے کچھ زیادہ بلند امیدیں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک مسلمانوں نے علم و اہلیت کی قدر کرنا نہیں سیکھا۔ صدارت کی کرسیوں پر بالعموم ایسے اشخاص بٹھائے جاتے ہیں جن کا جسم علم کے وزن سے خالی، مگر اس کی کمی پوری کرنے کے لیے تمام تر چاندی اور سونے کا بوجھ ہوتا ہے۔

مگر ہم ندوے کے لیے پریسیڈنٹ انتخاب کرنے میں ارکانِ ندوہ کے حسنِ انتخاب کی علانیہ داد دیں گے۔ انھوں نے اگرچہ ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو بظاہر طبقۂ علما میں داخل نہیں، مگر اے کاش! علما کا طبقہ ایسے نفوسِ قدسی صفات پیش کر سکتا! ان کو ندوے کے عرشِ صدارت پر دیکھ کر اس وقت بھی ہم نے اپنے آپ کو تو مسرت میں پایا جب وہ اپنا ایڈریس اول سے آخر تک سنا چکے تھے۔ ان کا ایڈریس گو مختصر تھا مگر ندوے کے ایڈریس میں لازمی طور پر جن جن مطالب کو ہونا چاہیے ان میں سے تقریباً کوئی بات نظر انداز نہیں کی گئی تھی۔ ندوے کی تاریخ اختصار کے ساتھ اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ علما کو علمی اور اخلاقی تنزل، ندوۃ العلما کی ضرورت اور دار العلوم کی خصوصیات کا بیان جتنا کچھ کیا گیا، بہ حیثیت مجموعی موثر اور دل نشیں تھا۔ حکیم صاحب کو اگرچہ اردو تحریر و تصنیف کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا، رسالہ طاعون اور چند متفرق مضامین کے سوا وہ بہت کم اردو اہل قلم کی صف میں نظر آئے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ لٹریچر کے حسن کی مشاطہ مشق و مہارت نہیں ہے، مذاق سلیم ہے، وہ لٹریچر کی خوبیوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں گو زیادہ لکھتے نہیں۔ پس طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی ان کا ایڈریس کسی طرح امید شکن نہیں تھا!

تاہم بہتر تھا کہ حکیم صاحب ذرا زیادہ تفصیل اور اطناب سے کام لیتے۔ اختصار اور ایجاز بلاغت ضرور ہے مگر نہ اتنی کہ ہر جگہ خوشنما ہو۔ علوم اسلامیہ کا تنزل، نصاب قدیم کے نقائص، ارتقاے ذہنی اور اجتہادِ فکری کا عالم گیر فقدان، ملک کی اخلاق سے یکسر محرومی، یہ اور اسی قسم کے بعض اور مطالب اس درجہ اہم تھے جن کو ندوۃ العلما کے پریسیڈنشل ایڈریس میں اگر تفصیل کے ساتھ

بیان نہ کیا جائے تو انھیں سننے کے لیے پھر ہم کہاں جائیں۔ حکیم صاحب نے علما کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تنگ مزاجیوں اور باہم دگر معرکہ آرائیوں کی شکایت کی ہے۔ حال آں کہ طبقۂ علما کے تنزل کا افسانہ بہت طول طویل ہے اور اس کا کوئی باب ایسا نہیں جو درد انگیز نہ ہو۔

اس اجلاس میں پریسیڈنشل ایڈریس کے علاوہ دو اور اہم کارروائیاں ہوئیں۔ ندوۃ العلما کی رپورٹ مولانا سید عبدالحی صاحب سیکرٹری دفتر ندوۃ العلما نے حسب معمول پیش کی اور مولانا شبلی نعمانی کا لیکچر ندوہ کی ضرورت اور اس کے مقاصد پر، جن کی تقریریں اجلاس ہائے ندوہ کی سب سے زیادہ قابلِ قدر نعمت ہے۔

مولانا سید عبدالحی:

مولانا سید عبدالحی کا چوں کہ ذکر آ گیا ہے اس لیے یہ کہے بغیر قلم آگے نہیں بڑھتا کہ مولانا شبلی نعمانی کے بعد وہ دوسرے بزرگ ہیں جنھوں نے ندوۃ العلما کی خدمت گزاری میں قابلِ صد تحسین ایثار نفس سے کام لیا ہے اور جو آغاز کار سے اس وقت تک ندوے کی تاریخ میں ایک مثال رہے ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب کہ فرض اور ضمیر کے معانی سے قوم کی قوم بیگانۂ محض ہو رہی ہے اور قومی ترقی کے عام شور و غوغا میں ایک آواز بھی خلوص اور ایثار کی سنائی نہیں دیتی، ایک ایسے شخص کی تعریف کیوں نہ کی جائے جس نے ابتدا سے ندوے کا ساتھ دیا اور اس وقت بھی جب کہ غایت درجے کی کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں ندوہ چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے اغراض شخصیہ کے لیے مفید نہ پا کر تمام مدعیانِ کار ایک ایک کر کے الگ ہو رہے تھے، وہ اس کی خدمت میں برابر سرگرم رہا اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ باوجود مالی بے اطمینانی و ضروریات معاش کے جو قلیل رقم ندوہ پیش کرتا تھا، اس کے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا وجود فرض کے خیال اور ایثار کے جوش کا کتنا موثر نمونہ ہے!

ان کی رپورٹ میں وہ تمام کامیابیاں نہایت تفصیل سے دکھلائی گئی تھیں جو پچھلے دو سالوں میں ندوۃ العلماء کو گورنمنٹ اور قوم کی توجہ سے حاصل ہوئیں، لیکن چوں کہ دارالعلوم کی رپورٹ میں بھی یہ امور پورے تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں اس لیے ان کا ذکر یہاں ضروری نہیں۔

مولانا شبلی نعمانی:

رپورٹ کے بعد ندوے کی ضرورت اور اس کے مقاصد کی تشریح کے لیے مولانا شبلی نعمانی کھڑے ہوئے۔ یہ مولانا کا خاص موضوع ہے اور ایسی موثر اور پر کشش داستان ہے جو کبھی پرانی ہونے والی نہیں۔ جس کو بار بار سن لینے کے بعد بھی ہمارا سامعہ نہیں تھکتا اور جو ”قصہ ہائے دوست“ کی طرح:

صد بار خواندہ ایم و دگر از سر گرفتہ ایم

کی مصداق ہے۔ قوم کی زندگی اور بقا اس پر موقوف ہے کہ اس داستان کو کان لگا کر سنے اور جب تک اپنا نہ ہو، ندوہ کو چاہیے کہ ہمیشہ دہراتا رہے۔

گذشتہ اجلاس سے اگرچہ ہم کو شکایت ہے کہ مولانا نے کسی علمی موضوع پر لیکچر نہیں دیا مگر ندوے کی ضرورت، دارالعلوم کی رپورٹ، وقف اولاد، اور چند دیگر مواقع پر جس تفصیل کے ساتھ انھوں نے تقریریں کیں انھوں نے ایک حد تک اس کمی کی تلافی کر دی۔ مولانا کا لیکچر ایک آریٹری سحر بیانی کی جگہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پروفیسر کا درس ہے جو کسی علمی موضوع پر حلقۂ تلامذہ میں لیکچر دے رہا ہو۔ یہ قدرت آج صرف انھیں کو حاصل ہے کہ جس موضوع پر چاہتے ہیں ایک مرتب اور مدون تصنیف حاضرین کو سنا دیتے ہیں۔ ان کا لیکچر بہ لحاظ ترتیب مطالب اور حسن استدلال ایک مکمل رسالہ ہوتا ہے جس کو اگر قلم بند کر لیا جائے تو نظر ثانی کی بھی ضرورت نہ ہو اور بلا تامل رسائل شبلی میں ایک کا اضافہ ہو جائے۔

قومی ترقی:

ہے یہ دو لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا! وہ جب لیکچر دے رہے تھے تو ہم کو یقین ہے کہ سامعین نے اگر اپنے دلوں کو ڈھونڈا ہوگا تو پہلوؤں کو خالی پایا ہوگا۔ انھوں نے ندوے کی ضرورت کو ایک ایسی مدلل اور نا قابل انکار صورت میں پیش کیا کہ سننے والوں میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جو لیکچر کے بیان سے کلیتہً متفق نہ ہو گیا ہو۔ یہ اثر ان کے حسن بیان کا نہ تھا بلکہ خود بیان کی سچائی اور واقعیت کا تھا! آج چالیس برس سے تمام ملک قومی ترقی کی صداؤں سے گونج رہا ہے اور اس کثرت کے ساتھ سیکڑوں مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ مرزا غالب کے نقش وفا کی طرح قریب ہے کہ

بے معنے ہو جائے۔ کانفرنسوں اور انجمنوں کی کثرت کا یہ حال ہے کہ ملک کا کوئی کونا ایسا نہیں جہاں کوئی نہ کوئی جماعت اپنے دائمی پیشے کی طرح اس مشغلے میں زندگی نہ کاٹتی ہو۔ کانفرنسوں سے الگ عام اخبارات اور مجامع میں ترقی کا غوغا اور ہنگامہ اس زور اور تسلسل کے ساتھ قائم ہے کہ ہمارے دماغوں کو اس تموج اور ہیجان سے ایک دن کے لیے بھی سکون نصیب نہیں ہوتا، لیکن باوجود اس طوفان و تلاطم کے جب زمانے سے پوچھا جاتا ہے کہ قوم کی حالت میں کیا انقلاب ہوا، انگریزی جس کو قوم کے تمام امراض کا نسخۂ وحید قرار دیا گیا تھا اور قومی ترقی اور عزت کی کوئی سطر ایسی نہیں تھی جو اس کے دفترِ مناقب و فضائل میں درج نہ کر دی گئی ہو، اس نے قوم کو علم و اخلاق، عزت و تمول، تہذیب و تمدن میں کہاں تک بلند کیا۔ پھر اس تعلیم کے خواہ کیسے ہی نتائج کیوں نہ ہوں لیکن اتنے وسیع عرصے میں قوم کے کس کس گروہ میں جاری ہو سکی، کتنے روساے ملک، کتنے تعلقے داروں، کتنے اہلِ حرفہ اور کتنے تاجروں نے تعلیم کو حاصل کیا۔ عام طبقہ جو قوم کا اصلی گروہ ہے اور جس کی اصلاح بغیر قوم ایک انچ اپنی سطحِ تنزل سے اونچی نہیں ہو سکتی، اس میں کس درجے تک تعلیم پھیلی، قوم میں کتنے مصنف، کتنے مقرر اور کتنے اہلِ قلم پیدا ہوئے، جہل کے مقابلے میں علم کے جو نتائج بیان کیے جاتے ہیں وہ کہاں تک قوم میں پیدا ہو سکے، ارادوں کا کیا حال ہے، دماغ کس عالم میں ہیں، سوسائٹی میں کس درجے نشاط اور شگفتگی کی طرف تغیرات ہوئے اور پھر جو کچھ ہوا وہ معاصر اقوام کے مقابلے میں کیا درجہ رکھتا ہے؟ تو ان سوالات کے جواب میں یاس اور ناامیدی کے نقوش دکھلا دیے جاتے ہیں اور آواز آتی ہے کہ اس سے زیادہ اڑنے کی بال و پر میں طاقت نہیں۔ تین چار ہائی کورٹ کے جج، سو دو سو ڈپٹی کلکٹر اور منصف، ایک محدود تعداد ان کلرکوں اور چپراسیوں کی جن کی قیمت بازار میں پندرہ بیس روپے سے زیادہ نہیں اور جو صرف اس لیے ہیں کہ نوکری اور ملازمت کی کسی مشین میں لگا دی جائیں اور مدت العمر اپنے محور پر حرکت کرتی رہیں، ہماری امیدوں کے ارتقا و ارتفاع کا سدرۃ المنتہیٰ! بس یہی نقطہ ہے اور ہماری پنجاہ سالہ ترقیات کی داستان اس سے زیادہ طویل نہیں۔ ہم نے پوری نصف صدی کی زندگی تخیل و ترجی اور امید و آرزو میں کاٹ دی اور ہمیشہ اس دھوکے میں رہے کہ مستقبل آ کر نجات دلا دے گا۔

آئندہ و گذشتہ تمنا و حسرت است
یک کاشکے بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

ندوہ اور قومی ترقی کا لاینحل عقدہ:

غرض کہ آج سے چالیس برس پیشتر قومی ترقی کا عقدہ جس طرح لاینحل تھا، آج بھی لاینحل ہے۔ ندوہ اسی عقدے کے حل کرنے کا مدعی ہے اور اس بارے میں اس کے مقاصد بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہیں۔ قوم کے قدرتی لیڈر علما تھے۔ قوم کے بڑے حصے کی باگ انھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ اگر خود ان کی حالت درست ہوتی تو وہ قوم کو بھی درست کرتے، لیکن علم و اخلاق کے تنزل اور تعصب نے انھیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ اپنی قدیم روایات کو قائم رکھ سکیں اور قوم کے لیے راہنما گروہ ثابت ہوں۔ نیا گروہ ان کے سجادے پر بیٹھا مگر وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ اپنا سا ایک گروہ اور پیدا کر دے۔ پھر تعلیم کا جو نصاب تھا وہ اس کارخانے کے مشابہ تھا جس میں صرف ایک خاص قسم کے ہی برتن ڈھل سکتے ہیں اور جو صرف اس لیے تھا کہ ملک میں ملازمت پیشہ گروہ کا اضافہ کر دے۔ پس ایسی حالت میں جب تک نئے علما کا ایک وسیع گروہ ہم میں پیدا نہ کیا جائے اور علم و مذہب سے ترکیب پایا ہوا نصاب مرتب نہ ہو، ہماری حالت میں حقیقی ترقی کی طرف کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔

ندوے کے مقاصد اس سے زیادہ نہیں اور مولانا شبلی سے بڑھ کر اس کی تشریح اور کون کر سکتا ہے! تقریباً دو گھنٹے تک ان کا لیکچر سامعہ نواز بزم و انجمن رہا۔ وہ جب بیٹھے تو گو علماے متقدمین کے خوف سے سامعین کے ہاتھ چیئرز کے لیے نہیں اٹھ سکتے تھے لیکن ان کے چہرے اس بے اختیارانہ اثر پذیری کے ترجمان تھے جس میں ان کے قلوب ڈوب گئے تھے۔

وقف علی الاولاد:

۲۶ر تاریخ کے دوسرے اجلاس میں وقف علی الاولاد کا مسئلہ پیش کیا گیا اور مولانا شبلی نعمانی نے اس کی اصلیت اور صورت شرعی پر نہایت مفصل تقریر کی۔ یہ اہم مسئلہ آج کئی سال سے ملک کے سامنے ہے۔ ابتدا میں متعدد اشخاص نے بطور خود اس کے متعلق کوششیں کی تھیں، لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اب تین سال سے مولانا موصوف نے از سر نو قوم کو توجہ دلائی۔ ان کی تقریر سے حاضرین کو معلوم ہوا کہ اب تک جو کچھ کیا جا چکا ہے، وہ ہر طرح سے امید افزا ہے۔ ملک کے ہر گوشے میں اس کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ تقریباً تمام علما اور تعلیم یافتہ طبقے نے غیر معمولی دل

چسپی کا اظہار کیا ہے۔ ایک مدلل اور مبسوط رسالہ شائع ہو چکا ہے، جس کا انگریزی ترجمہ بھی گورنمنٹ میں جانے کے لیے تیار ہے۔ قوم کا کوئی گروہ اور فرقہ ایسا نہیں جو پریوی کونسل کی اس سخت اور نقصان رساں غلطی سے بے چین نہ ہو! حال میں آنریبل مسٹر جینا ممبر بمبئی نے امپیریل کونسل میں اس کی نسبت سوال کیا اور جو جواب دیا گیا وہ گو حسب دل خواہ نہ تھا مگر امید شکن بھی نہ تھا۔

مولانا کے بعد شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا، چودھری سلطان محمد خان صاحب بیرسٹر ایٹ لا، سید عبد الحی صاحب، خان بہادر خواجہ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر اور چند دیگر اشخاص نے مختلف پہلوؤں پر بحث کی۔ آخر میں مولانا شبلی نعمانی نے اعلان کیا کہ شیخ عبد الرحیم صاحب تاجر چرم خاص وقف علی الاولاد فنڈ کے لیے پانچ سو روپے عطا فرماتے ہیں۔ یہ رقم ان مختلف رقوم کے علاوہ ہے جو گذشتہ دو سال کے اندر اس فنڈ میں جمع ہو چکی ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی اس سعی و محنت کا شکریہ ادا کریں جو وہ تین چار سال سے وقف علی الاولاد کے لیے فرما رہے ہیں، لیکن جو ذات یک سر وقفِ خدمتِ ملت ہو اس کے کس کس احسان کا شکریہ ادا کیا جائے؟ وہ ہماری زبان، ہمارے لٹریچر اور ہمارے علوم و فنون کی ایسی گراں قدر اور عدیم النظیر خدمت انجام دے رہے ہیں جس کے احسان سے تمام عالم اسلامی سبک دوش نہیں ہو سکتا! پھر انھوں نے ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے ذمے لے لی ہے، جس کی نسبت مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ صرف انھیں کے دم سے قائم ہے۔ ان کے یہی احسانات کیا کم تھے، مگر ان کا دل ملت خواہ جو سرتا سر درد و محبت ہے، ہمارے دیگر ضروریات کو محسوس کرنے میں بھی اسبق و اقدم رہتا ہے اور جب محسوس کر لیتا ہے تو جوشِ ملت پرستی کو ضبط نہیں کر سکتا۔

دار العلوم کی سہ سالہ رپورٹ:

دوسرے دن کا پہلا اجلاس چند مفید رزولیوشنوں کی تحریک و منظوری سے شروع ہوا، جس میں باغیانہ افعال و جرائم سے اظہار نفرت کا رزولیوشن خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے دار العلوم ندوۃ کی سہ سالہ رپورٹ پیش کی جو ایک مطبوعہ رسالے کی صورت میں پیشتر سے چھپوائی گئی تھی۔ رپورٹ کے پیش کرنے سے پہلے دار العلوم کی ضرورت اور خصوصیات پر ان کا لیکچر اس درجے مدلل اور موثر تھا کہ اگر مدارس عربیہ کے قدامت پرست اور

سخت سے سخت آرتھوڈکس علما بھی موجود ہوتے تو ہم کو یقین ہے کہ ان کا جمود اپنے ضعف کو ضرور محسوس کرتا، آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے اس کا ذمے دار صرف نصاب تعلیم اور طرز تعلیم ہے۔ آٹھ سو برس پیشتر علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ لکھتے ہوئے جس نقص کو محسوس کیا تھا، وہ اب ہمارے زمانے میں اس قدر طاقت ور اور عالم گیر ہو گیا ہے کہ دس دس برس کی جاں کاہ اور دماغ پاش تعلیم کے بعد جس کی تحصیل میں سیکڑوں دماغ اپنے قوا کو بیکار کر رہے ہیں، ایک واقف فن اور صاحب فہم سلیم دماغ پیدا نہیں ہو سکا۔ تعلیم کا اصلی منشا یہ ہے کہ ذہن میں قوت اجتہادی پیدا ہو اور قوائے ادراک و تعقل اپنے فعل میں تیز اور ذکی ہوں، لیکن یہ خصوصیت صرف ہمارے نصاب تعلیم ہی میں پائی جاتی ہے کہ اجتہاد کی جگہ تقلید جامد اور ادراک و تعقل کی جگہ تعطیل دماغ اس کے نتائج ممتاز ہیں۔ ہمارے نصاب تعلیم کا مرکز قرآن کو ہونا چاہیے۔ فہم قرآن اصل مقصود اور تمام علوم بمنزلہ آلات اور وسایط کے ہیں لیکن ہمارے پورے نصاب میں ان علوم سے زیادہ اور کوئی کس مپرس نہیں، جو براہ راست فہم قرآن میں مدد دے سکتے تھے۔ علوم اسلامیہ کے درس کے لیے بہترین کتابیں قدما کی ہو سکتی تھیں، لیکن ان کی جگہ چند ناکافی کتابیں متاخرین کی پڑھائی جاتی ہیں، جن کی تحصیل قرآن سے قریب کرنے کی جگہ اور زیادہ دور کر دیتی ہے۔ پھر تمام مدارس عربیہ کا سسٹم اور طلبا کا طریق بود و باش اس قدر مبتذل اور گدایانہ ہے جس میں زندگی کا اثر پذیر حصہ کاٹ دینے کے بعد ممکن نہیں کہ محاسن اخلاق اور عمدہ جذبات پیدا ہو سکیں۔ مولانا نے اوّل نہایت تفصیل سے نصاب قدیم کے ان تمام نقایص کو بہ تفصیل بیان کیا، پھر ان مقاصد کی تشریح کی، جن پر دار العلوم کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ آخر میں وہ خصوصیات دکھلائیں جن کے لحاظ سے دار العلوم تمام ممالک اسلامیہ کے مدارس عربیہ میں منفرد ہے۔ اس میں ایک خاص خصوصیت یہ بھی تھی کہ علوم جدیدہ اور انگریزی زبان دانی ہر طالب علم کے لیے لازمی ہے۔

یہ رپورٹ تمام تر اہم اور قابل غور بیانات کا مجموعہ ہے اور ہمارے عقیدے میں موجودہ زمانے کی کوئی تحریک قوم کے مستقبل کی نسبت ایسی روشن اور ہمت افزا امید پیدا نہیں کر سکتی، جیسی اس رپورٹ کے ہر عنوان اور ہر جملے سے دلوں میں موجزن ہوتی ہیں۔ اس کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ راہ ترقی کی اصلی رکاوٹ دور ہو گئی ہے اور ایک ایسی شاہراہ ہمارے سامنے ہے جو یقیناً منزل مقصود پر جا کر ختم ہوگی۔

ہمارے تنزل اور انحطاط کے تمام اسباب اس نقطے پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں کہ قوم کے پریشان اور متفرق گلے کا کوئی راعی نہیں لیکن دارالعلوم اپنی تعلیم و تربیت سے جو جماعت تیار کر رہا ہے وہ اس بھٹکے ہوئے بے راہ گلے کو جمع کر دے گا، وہ علم، مذہب اور اخلاق میں قوم کے لیے ایک روشن مثال ہوگا۔ اس کا نمونہ قوم میں حقیقی زندگی اور نشاط کی روح از سرِ نو پیدا کرے گا۔ اس کی بدولت علم کی برہم شدہ صحبتیں پھر رونق پر آ جائیں گی۔ اس سے توقعات قائم کرنے میں جس قدر اسراف کیا جائے، کم ہے۔

دارالاقامہ کے لیے چندہ:

اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے دارالعلوم کے لیے بورڈنگ ہاؤس کی ضرورت پر توجہ دلائی اور فرمایا کہ سردست سو کمروں کی تعمیر کا انتظام ناگزیر ہے جن میں سے ایک کمرہ سات سو روپیہ کی لاگت سے تیار ہوگا۔ اس پر حسب ذیل کمروں کے لیے چندے کی رقوم پیش کی گئیں:

اسمائے گرامی	تعداد کمرہ
مولوی سید حسن صاحب وکیل مرادآباد	ایک کمرہ (نقد)
حضرت بہاول پور کی طرف سے	ایک کمرہ (نقد)
اہل کشمیر کی طرف سے	ایک کمرہ
نواب رستم علی خان صاحب رئیس کرتال	ایک کمرہ
حافظ حاجی عبدالکریم صاحب سوداگر صدر دہلی	ایک کمرہ
حاجی شیخ محمد صاحب کمسریٹ اسٹور کیپر جالندھر	ایک کمرہ (پانسو آ چکے ہیں)
صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب ٹونک	ایک کمرہ
شیخ جان محمد صاحب رئیس ہوشیارپور	ایک کمرہ (پانسو آ چکے ہیں)
مسٹر محمد اسحاق صاحب وکیل الہ آباد	ایک کمرہ (دوسو آ چکے ہیں)
شیخ غلام صادق صاحب رئیس امرتسر	ایک کمرہ
مولوی عبدالاحد صاحب مالک مجتبائی پریس دہلی	ایک کمرہ
مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی	تین کمرے
نواب سید علی حسن خان صاحب رئیس لکھنؤ	ایک ہزار روپے

یہ چندہ اگرچہ اپنی تعداد میں غیر معمولی نہیں لیکن جتنا کچھ ہوا بغیر کسی پُرزور تحریک و جوش انگیزی کے ہوا، عام طور پر ہمارے جلسوں میں طرح طرح کی تدبیروں سے چندہ وصول کیا جاتا ہے، لیکن یہ تمام رقمیں وہ ہیں جو ارباب ہمم نے خود بخود اپنے جوش اور خلوص سے پیش کیں۔

ایک شاندار اور پُراثر منظر:

لیکن جلسے کا سب سے زیادہ پُر شان اور پُر اثر منظر دارالعلوم ندوۃ العلما کی تعلیم کا نمونہ تھا جو دوسرے دن کے اجلاس میں قوم کے آگے پیش کیا گیا۔ دارالعلوم کی تعلیم کو مدارس عربیہ کے مقابلے میں مختلف قسم اور حیثیت کے خصوصیات حاصل ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن کا نمونہ یا ایک کسی جلسے میں نہیں دکھایا جا سکتا۔ مثلاً نصاب قدیم فن تعلیم کے لحاظ سے یکسر ناقص تھا۔ ادب، تاریخ اور تفسیر جیسے علوم ضروریہ کالعدم تھے۔ علوم سے طلبا کو صحیح مناسبت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ تعلیم سے بڑا مقصد تہذیب دماغ ہے، مگر اس کی جگہ طبیعت میں عموماً کج فہمی، کج رائی اور جدال پسندی پیدا ہو جاتی تھی۔ طلبا کی بسر اوقات کا یہ حال تھا کہ دریوزہ گری کی روٹیوں وسیلۂ حیات تھیں اس لیے اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ کیریکٹر کی جگہ ابتدا سے گدایانہ زندگی کے عادی ہو جاتے تھے۔ اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا، اس لیے مذہبی تقشف اور تعصب تو طبیعت ثانیہ ہو جاتا تھا مگر مذہبی زندگی، اصلی خصائل معدوم تھے۔

ندوہ ان تمام نقائص کو دور کرنے کا مدعی ہے، لیکن یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں جن کا نمونہ کسی جلسے کے اسٹیج پر دکھلا دیا جائے۔ ان کا اندازہ اس وقت کیا جا سکے گا جب دارالعلوم ندوۃ العلما کے طلبا بہ کثرت ملک میں پھیلیں گے۔ ان کی زندگی پبلک ہوگی اور ملک کو موقع ملے گا کہ علمی قابلیت، دماغی قوت اور اخلاق و مذہب کو قدرتی امتحانوں میں ڈال کر دیکھے۔ البتہ چند خصوصیت ایسے ضرور ہیں جن کا نمونہ ہر موقع پر دکھلایا جا سکتا ہے۔ مثلاً طلبا کی قوت تحریر و تقریر، فن ادب سے مناسبت، عربی میں برجستہ تحریر و تقریر کی قابلیت!

ندوہ اس وقت اپنے آپ کو سخت مشکل میں پاتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے مخاطب عموماً نئے تعلیم یافتہ اصحاب ہیں، کیوں کہ ایک ایسا گروہ جس کے سامنے انگریزی مدارس کا طریق تعلیم ہو، کسی طرح نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارا قدیم نصاب تعلیم کیسے عجیب اور درد انگیز نقائص کا مجموعہ ہے؟

تمام دنیا میں ہر زبان کی تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں تقریر و تحریر اور بول چال کی قابلیت پیدا ہو، لیکن اس عجیب خصوصیت کا حق دعویٰ صرف اس نصاب ہی کو حاصل ہے کہ برسوں کی تعلیم اور عمر بھر کے درس و تدریس و مطالعے کے بعد بھی ہمارے علما اس سے عاجز ہوتے ہیں کہ فصیح عربی میں قلم برداشتہ چار سطریں لکھ سکیں یا چند منٹ گفتگو کر سکیں۔ ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ علما کے لیے نو وارد عرب اور ایرانی سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ اور پریشان کن چیز نہیں!

ندوے نے فن ادب کی تعلیم کا خاص انتظام کیا ہے۔ اس لحاظ سے تمام ہندوستان میں صرف اسی کی درس گاہ کو یہ فخر آمیز حق حاصل ہے کہ اپنے امتیاز خاص پر داد چاہے! اس کے طلبا کو فصیح عربی میں یہ قدرت حاصل ہے کہ قلم برداشتہ ہر قسم کے موضوع پر مضامین لکھ سکتے ہیں اور جن مطالب پر چاہیں بے ساختہ اور برجستہ لیکچر دے سکتے ہیں۔ ان کے درس میں متاخرین کی جگہ قدما کی اعلیٰ قسم کی تصنیفات رکھی گئی ہیں، اس لیے ان کی مناسبت اور مذاق کا رجحان قدرتی طور پر علو و رفعت کی طرف ہے۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی جب رپورٹ پیش کر چکے تو حاضرین کو متوجہ کیا کہ وہ جس طرح چاہیں طلبا کی ادبی قابلیت کا امتحان لے سکتے ہیں! اکثر صاحبوں نے خواہش کی کہ ندوے کے اجلاس دہلی کے حالات عربی میں قلم بند کریں! چناں چہ اسی وقت چند طلبا پنسل اور کاغذ لے کر بیٹھ گئے اور لکھنا شروع کر دیا۔

ندوے کا اجلاس تھوڑی دیر کے لیے دار الامتحان بن گیا تھا۔ آٹھ نو سو سے زیادہ نظریں مع ان قلوب کے جو طرح طرح کے شکوک اور شبہات کا آشیانہ بن رہے تھے، وقف انتظار تھیں اور ان چند نو عمر انسانوں کی طرف لگی ہوئی تھیں، جو نہایت بے پروائی سے مشغول تحریر تھے۔ بالآخر یہ عام انتظار اور اشتیاق حیرت اور تعجب کو اپنی جگہ چھوڑ گیا، جب طلبا نے اپنی اپنی عربی تحریریں پیش کیں۔ ان میں سے ہر تحریر صحت و فصاحت کے ساتھ وہ ادیبانہ اوصاف بھی رکھتی تھی، جس کو نصاب جدید کی تعلیم کا ایک نمایاں امتیاز سمجھنا چاہیے۔ خود حضرات علما حیرت اور تعجب کے ساتھ داد دے رہے تھے کہ طلبا نے چند منٹوں میں قلم برداشتہ ایسی عبارت لکھی، جس کا عرصے کی مشق اور محنت کے بعد بھی لکھنا آسان نہیں۔

تمام ہال جب کہ تحسین و تعریف کی صداؤں سے گونج رہا تھا، مولانا شبلی نے فرمایا کہ یہ تحریر کا

نمونہ تھا، بہتر ہے کہ طلبا کی قوت تقریر کا بھی اندازہ کر لیا جائے۔ اس پر عبدالواجد نامی ایک طالب علم نے عربی میں برجستہ تقریر شروع کر دی۔ جن لوگوں نے مدارس عربیہ کے طلبہ کو اردو زبان میں بھی کبھی صاف تقریر کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو ان کے لیے یہ کیسا تعجب سے بے خود کر دینے والا منظر تھا؟ وہ جب تقریر کر رہا تھا تو اس وقت سننے والوں کا ذہن راضی نہیں ہوتا تھا کہ اسے دارالعلوم کا ایک طالب علم تسلیم کریں۔ اس کی تقریر ادب اور انشا پردازی سے اس درجہ معمور تھی کہ خود علما کے گروہ سے ہر ہر لفظ اور ہر ہر ترکیب پر تحسین و توصیف کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ تقریر نہیں ہے، بلکہ کسی ادیب کی فصیح و بلیغ تحریر ہے جسے پُر شوکت جملوں اور ادیبانہ ترکیبوں میں ارباب دہلی کی مہمان نوازی اور ندوے کے تازہ ترین حالات کو بیان کیا ہے۔

مدح و تحسین کے غلغلے میں جب تقریر ختم ہوئی تو حاضرین میں سے ہر شخص دارالعلوم کے اس نتیجہ تعلیم کی عظمت سے متاثر تھا، متعدد اشخاص نے اس تقریر سے خوش ہو کر چند رقمیں بطور صلے کے پیش کیں کہ طلبا کو دی جائیں۔

اس کے بعد سید محمد صاحب اور عبدالمجید صاحب نے انگریزی میں تقریریں کیں، جس سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ ندوے میں انگریزی زبان دانی کی جو تعلیم دی جاتی ہے، اس نے دو سال کے اندر کیا نتیجہ پیدا کیا ہے؟ آگے چل کر شیخ عبدالقادر صاحب ان تقریروں پر ریمارک کریں گے۔

اس وقت تک صرف دو تین طالب علموں کو تقریر کے لیے وقت ملا تھا اور کئی طلبا منتظر اور مستعد تھے کہ انھیں بھی تحریر و تقریر کا موقع دیا جائے! لیکن شدت حرارت اور ضیق وقت کی وجہ سے مولانا شبلی نے یہ سلسلہ بند کر دینا چاہا کہ جس قدر نمونے پیش ہو چکے ہیں کافی ہیں۔ اتفاق سے طلبا میں پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کا ایک طالب علم سید امداد حسین بھی موجود تھا جس نے دارالعلوم میں زبان دانی انگریزی کی جگہ "بھاکا" اختیار کی ہے۔ یہ طالب علم اسٹیج کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مولانا شبلی نے روک دیا، لیکن اسٹیج پر پنجاب اور بہاول پور کے جو حضرات تشریف رکھتے تھے وہ مصر ہوئے کہ ہمیں اپنے ایک ہم وطن طالب علم کی قابلیتوں کا بھی اندازہ کر لینے دیجیے!

آریا سماج نے چند سالوں سے پھیل کر ہماری مذہبی ضرورتوں کے دائرے کو بھی وسیع کر دیا ہے۔ ہم میں سے ایک خاص گروہ کے لیے اب سنسکرت اور بھاکا کی تحصیل ناگزیر ہے کیوں کہ جب تک وید اور وید کی اس تفسیر کو جو آریا سماج کی اصلی بنیاد ہے، بغیر کسی واسطے کے سمجھ نہ سکیں، ہم

میں اور ان آریا واعظوں میں کچھ فرق نہیں ہو سکتا جو عربی کا ایک حرف سمجھے بغیر قرآن مجید اور سیرۃ نبوی پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ دار العلوم نے اس ضرورت شدید کو محسوس کر کے کچھ عرصے سے بھاکا زبان کی تعلیم کا انتظام کر دیا ہے اور یہ طالب علم اسی تعلیم کے چند مہینوں کا نمونہ تھا۔

سید امداد حسین نے اوّل اُردو آمیز بھاکا میں تقریر کی، جس طرح آج کل آریا سماج کے مشنری عموماً اُردو میں وعظ کہتے ہیں۔ لیکن لوگوں نے خواہش کی کہ وہ خالص بھاکا زبان کی تقریر کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ اسلام کے عقاید و تعلیم پر اس نے نری بھاکا میں تقریر شروع کر دی۔

اُس جوشِ مسرت و انبساط، حیرت و تعجب اور مسلسل نعرہاے تحسین کی کسی طرح لفظوں میں تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، جس سے اس وقت تمام جلسہ معمور تھا۔ اس کی روانی و فصاحت، بے ساختگی اور بے تکلفی، پھر مذہبی و علمی اصطلاحات کا بہ کثرت صحیح استعمال اور سب سے زیادہ لب و لہجے اور مخارج و تلفظ کی ہر جگہ صحت، یہ تمام باتیں ایسی تھیں جنھوں نے جمع ہو کر اس تقریر کو نہایت دل کش اور پُر اثر بنا دیا تھا۔ وہ جب تقریر کر کے بیٹھ گیا تو جلسے کے وسط سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ بعض لوگ اسی طالب علم کی زبانی قرآن مجید کا ایک آدھ رکوع بھی سننا چاہتے ہیں! شاید اس خواہش کا محرک یہ خیال تھا کہ جو شخص بھاکا زبان اور سنسکرت کے الفاظ کو ایسی طبعی مناسبت کے ساتھ ادا کرتا ہو، اس کو قرآن مجید سے کیا مناسبت؟ کچھ عجب نہیں کہ اس کے حسنِ تقریر نے بہت سے لوگوں کے دل میں اس کی قومیت کا سوال بھی پیدا کر دیا ہو؟ کیوں کہ سچ یہ ہے کہ جب وہ تقریر کر رہا تھا تو یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ ندوہ کا ایک مسلمان طالب علم ہے یا آریا سماج کا کوئی واعظ! بہرکیف اس خواہش کا محرک کوئی خیال اور کیسا ہی شبہ کیوں نہ ہو، مگر ہم اس خواہش کے نہایت منت گذار ہیں۔ کیوں کہ اسی کی بدولت سید امداد حسین کو قرآن مجید کی تلاوت کا موقع ملا اور ایک ایسی ناممکن التعبیر روحانی حظ سے ہمارا قلب و دماغ لذت یاب ہوا، جس کو بھلانا چاہیں بھی تو نہیں بھلا سکتے!

اجلاس کی چند یادگار گھڑیاں:

سید امداد حسین سورہ الرحمٰن کا پہلا رکوع اپنی موثر آواز اور جگر دوز لہجے میں تلاوت کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ کیا یہ صاعقہ اثر آواز جو ہمارے دلوں کو دو نیم

اور آنکھوں کو دجلہ ریز کر رہی ہے، وہی صدائے جاں نواز ہے جو کبھی ریگستانِ عرب کے ٹیلوں اور تودہ ہائے ریگ پر بجلی بن کر چمکی، کبھی غارِ حرا کی تاریکی میں تجلی حق بن کر نور افشاں ہوئی، کبھی فاران کے قمہ ہائے بلند پر ابرِ رحمت بن کر برسی، کبھی مشرق و مغرب کے ظلمت کدے پر آفتاب بن کر طلوع ہوئی اور اب ایک لٹے ہوئے کارروان اور برباد شدہ قافلے کے لیے رہنمائی کا سہارا اور امید کی روشنی ہے!

تمام جلسہ اثر اور کیفیت کا مرقع تھا۔ سیکڑوں انسانوں کے مجمع میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کو اس خود فروشانہ محویت نے مبہوت اور بے خود نہ کر دیا ہو۔ بالخصوص جو دل کہ لذت آشنائے درد تھے، ان پر ایک خاص طرح کا عالمِ وجد طاری تھا۔ ان کے دلوں سے سوز و گداز کا دھواں اٹھ رہا تھا اور آنکھیں اشک فشاں اور خوں بار تھیں۔ اس کیفیت کی لذت کو بے درد کیا جانیں۔ ع

خندیدان آشنا نبود ہر گریستن!

سید امداد حسین کا بیٹھنا تھا کہ ہر طرف سے اشرفیوں اور روپیوں کا نچھاور شروع ہو گیا۔ لیکن ان تمام عطیات میں سب سے زیادہ قیمتی عطیہ مولانا شبلی نعمانی کی عبا تھی جو جوشِ مسرت سے بے اختیار ہو کر مولانا نے مرحمت فرمائی اور اس کے جسم پر بھی اس طرح راست آئی کہ ع

جامۂ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

خواجہ عبد الصمد صاحب گل رو رئیس کشمیر نے بھی اپنی طرف سے ایک تمغہ پیش کیا۔ ہم کہیں لکھ آئے ہیں کہ طلبا کی اخلاقی تربیت ایسی شے نہیں ہے جس کا یکایک نمونہ دکھلایا جا سکے۔ مگر اسی جلسے میں ایک قدرتی موقع ایسا پیدا ہو گیا جو دار العلوم کی روحِ اخلاقی کا ترجمان ہے اور جس پر ندوے کا چہرہ اگر فخر آمیز نظر آئے تو کچھ بے جا نہیں۔ طلبا کی عربی تقریر و تحریر اور سید امداد حسین کی حسنِ بیانی پر مختلف حضرات نے بطورِ صلے کے قریب چار سو روپے کی رقمیں عطا فرمائی تھیں۔ مگر تمام طلبا نے لینے سے صاف انکار کر دیا اور خود بخود خواہش کی کہ یہ تمام رقم دار العلوم کی تعمیرات کے فنڈ میں داخل کر دی جائے۔

بظاہر یہ ایثار ایک معمولی واقعہ معلوم ہوتا ہے لیکن جن لوگوں کو مدارسِ عربیہ کے طلبا کی پست ہمتی اور دنایت روشی کے اندازہ کرنے کا موقع ملا ہے، ان کے لیے ایک عربی مدرسے کے طلبا میں ایثارِ نفس کے نمونے کم از خرقِ عادت نہیں!

طلبا کی انگریزی تقریروں کی نسبت شیخ عبدالقادر صاحب بی اے کھڑے ہوئے کہ اپنی رائے ظاہر کریں۔ انھوں نے کہا: ممکن ہے بعض صاحبوں کو ان کے لب و لہجے اور ادائے مخارج میں کچھ سقم نظر آئے ہوں مگر یہ کہنا بالکل سچ ہوگا کہ دو تین برس کی تعلیم نے جو صلاحیت اور قابلیت پیدا کی ہے وہ توقع سے بہت زیادہ اور اپنی خوبیوں کے لحاظ سے حیرت انگیز ہے۔

اسی طرح طلبا کی عربی تحریر و تقریر کی نسبت شیخ عبدالحق صاحب بغدادی ازہری اسسٹنٹ پروفیسر عربی علی گڑھ کالج سے خواہش کی گئی کہ وہ ایک اہلِ زبان اور معلمِ ادب ہونے کی حیثیت سے اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔ انھوں نے عربی کی ایک فصیح و بلیغ تقریر میں دارالعلوم کی تعلیم اور طلبا کی ادبی قابلیت کی بے انتہا تعریف کی، اور کہا کہ طلبا کی عربی تحریر و تقریر نے جاہلیت عرب کے سوق عکاظ کا سماں پیدا کر دیا تھا، جس کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔

انسانی غلطیوں میں سب سے زیادہ نقصان رساں اور عالمگیر غلطی یہ ہے کہ وہ عموماً آلات و وسایط کو مقصود بالذات سمجھ لیتا ہے اور دوربین کے بنانے میں اس طرح محو ہو جاتا ہے کہ آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ آج قوم کی قوم اسی غلطی میں مبتلا ہے۔ رزولیوشن دراصل ان کاموں کا آلہ اور ذریعہ تھے، جن کی طرف تجویز و انتخاب کے بعد قدم بڑھانا تھا مگر اب خود ان کا وجود مقصود بالذات ہو گیا ہے اور اینٹ اور چونے کے جمع کرنے میں اتنی دوڑ دھوپ کی جاتی ہے، گویا عمارت کی بنیاد رکھ دی گئی اور رات بھر کے اندر دیواروں کو آسمان سے باتیں کرنی ہیں۔ اسی غلط روی کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ قوائے عمل عموماً افسردہ ہو گئے ہیں اور کاموں کے انتخاب کرنے میں صحتِ نظری بالکلیہ ناپید ہے۔ جب کبھی ہم کوئی تجویز پیش کرتے ہیں تو اس کے ایک ایک لفظ پر مجادلہ نما مباحثہ کے لیے تو تیار ہو جاتے ہیں لیکن اس پر بھولے سے بھی نظر نہیں ڈالتے کہ ملک کی ضرورتوں کا کیا حال ہے؟ مقدمہ امور کیا کیا ہیں اور عمل کا سامان کس درجے ہے اور کہاں تک مستعد ہے؟ بلاشبہ بعض رزولیوشن ہماری مجلسوں میں ایسے بھی منظور کیے جاتے ہیں جن کی نسبت رپورٹوں میں عمل کا خانہ بالکل سادہ نہیں ہوتا، مگر اس کے لیے کارفرما طبقے کی ستایش نہیں کرنی چاہیے بلکہ خود رزولیوشنوں کی آسان عملی کی داد دینی چاہیے، کیوں کہ ان میں زیادہ تر اس قسم کی تجویزیں ہوتی ہیں کہ فلاں شخص کو تار دے دیا جائے، فلاں محکمے سے خط و کتابت کی جائے یا فلاں افسر کو دو چار چٹھیاں بھیج دی جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی تجویزوں پر عمل کرنے کے لیے دست و پا اور ذہن و دماغ کو زحمت

دینے کی ضرورت نہیں قلم و مداد اور چند صفحات کاغذ کا صرفہ گوارا کر لینا کافی ہے۔

ندوے کا گذشتہ اجلاس اس لحاظ سے فی الحقیقت قوم کے لیے ایک یادگار مثال تھی۔ اس جلسے میں جس قدر رزولیوشن پیش ہو کر منظور ہوئے ان کی اہمیت اور عظمت کو چند سطروں میں نہیں لکھا جا سکتا۔ ان میں سے ہر تجویز ایسی تھی جس سے بڑھ کر موجودہ زمانے کی کوئی تحریک احیائے ملت اور بقائے قومیت سے براہ راست تعلق نہیں رکھتی۔ ہماری ضرورتوں کا یہ حال ہے کہ ع

تن ہمہ داغدار شد پنبہ کجا کجا نہم؟

اس لیے کارکن گروہ کے لیے تجاویز پیش کرتے ہوئے سب سے پہلے الاقدم فالاقدم کے اصول پر نظر رکھنی چاہیے اور صرف ان امور کو انتخاب کرنا چاہیے جو ضرورت شدید اور ممکن التعمیل ہونے کے لحاظ سے مقدم ہوں۔ ندوے کا ہر رزولیوشن اسی نکتے پر مبنی ہے۔

مذہبی ضروریات اور اعمال کا ایک مرکز:

چناں چہ دوسرے دن کے اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی نے تجویز پیش کی کہ ندوۃ العلماء کو مسلمانان ہند کی تمام مذہبی ضروریات کے لیے مرکز قرار دیا جائے اور چند جزئی اختلافات کے بعد بالاتفاق منظور ہوئی۔

چالیس برس کے متصل شور و ہنگامے نے ملک میں عام بیداری کے آثار پیدا کر دیے ہیں، مگر نتائج مفقود ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہماری ہر قسم کی کوششوں اور کاموں کا کوئی مرکز نہیں۔ ابتدا سے ہم اس غلطی میں مبتلا ہوئے اور نہیں معلوم کتنی مستحکم اور وسیع تحریکیں جو تمام ملک پر چھا جاتیں، صرف اس لیے بے اثر رہیں کہ وہ کسی مرکز سے وابستہ نہ تھیں۔ تمام ہندوستان میں سیکڑوں مذہبی انجمنیں اور سوسائٹیں قائم ہیں۔ مختلف گوشوں سے مذہبی خدمات کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، بیسیوں اخبار اور رسالے اسی غرض سے نکلتے ہیں، سیکڑوں اشخاص ہیں، جو مذہبی ضروریات کو محسوس کرتے ہیں اور کام کرنے کے لیے مستعد ہیں لیکن چوں کہ ان سب میں کوئی باہمی رشتہ نہیں، اس لیے باہمی اعانت اور مبادلۂ خیال و مشورہ ایک طرف، ایک کو دوسرے کے حالات تک معلوم نہیں ہوتے۔ اس جنگل کی طرح جس میں چار پایوں کے مختلف غول الگ الگ حلقے قائم کر کے چر رہے ہوں، قوم کی تمام تحریکیں پراگندہ اور منتشر ہیں اور وہ سیکڑوں نالے جو جمع

ہو کر سمندر کا مقابلہ کرتے۔ الگ الگ رہنے کی وجہ سے قریب ہے کہ خشک ہو جائیں۔ زنجیر کے حلقے اگر بکھرے ہوئے پڑے ہوں تو بے فایدہ بوجھ ہے، لیکن اگر انھیں کسی سلسلے میں منسلک کر دیجیے تو ایسی کارآمد شے ہے، جس سے ہاتھی جیسے دشمن کو بھی آپ اپنے قابو میں لا سکتے ہیں۔

بلاشبہ ملک میں اب بھی ایسے وسیع مدارس موجود ہیں جہاں سے سیکڑوں طلبا، مذہبی علوم کی سندیں لے کر نکلتے ہیں، لیکن وہ جن حالات میں مبتلا ہیں، ان کے لحاظ سے یہی غنیمت ہے کہ موجودہ زمانے کے سخت مقابلے میں اپنی جگہ پر قایم رہ سکیں۔ موجودہ زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے نہ تو وہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ہے اور نہ ان ضروریات کا احساس ہے۔ وہ اب تک اس عالم میں ہیں جہاں تغیر اور ترقی سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں۔ ایسی حالت میں ندوے کے سوا مسلمانانِ ہند کی مذہبی ضروریات کا اور کون مرکز ہو سکتا ہے؟

ندوہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں اپنی خصوصیات کے لحاظ سے تنہا مذہبی تحریک ہے۔ اس نے مذہب کے تحفظ اور قومیت کے بقا کے لیے جو راستہ اختیار کیا ہے، اب مصر و ایران اور روس و قفقاز کے مسلمان بھی اسی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے مذہبی تعلیم پر زندگی کا نیا دور طاری کرنا چاہا ہے اور وہ اپنے ارادوں اور ظاہر شدہ اعمال کے لحاظ سے موجودہ زمانے کی سب سے زیادہ عظیم الشان تحریک قرار دی جا سکتی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر اسی کو مذہبی ضروریات کے وسیع مستقبل کے لیے مرکز ہونا چاہیے تھا۔

ہم اس کو قوم کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ یہ رزولیوشن پیش ہوا اور بغیر زیادہ اختلاف کے اتفاقِ عام کے ساتھ منظور ہو گیا۔ جلسے میں پچاس ساٹھ سے زیادہ حضرات علما تشریف فرما تھے، تعلیم یافتہ طبقہ بہ تعداد کثیر موجود تھا، امرا و روسا اور عام ذی علم طبقے کی تعداد بھی سیکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ ان سب کا دلی جوش کے ساتھ اتفاق ظاہر کرنا اس ہر دل عزیزی کو پورے وثوق کے ساتھ ظاہر کرتا ہے جو ندوے نے قوم کے ہر طبقے میں حاصل کر لی ہے۔

یہ رزولیوشن اہمیت اور اثرات کے لحاظ سے ایک مستقل مضمون کا محتاج ہے۔ ندوے کو قدرتی طور پر ایک دن ہندوستان کا ایک مذہبی مرکز بننا تھا لیکن دایرہ بنانے میں پہلی چیز مرکز کا نقطہ ہے۔ اس لیے مرکز کے فیصلے نے کام کرنے کا راستہ بالکل صاف کر دیا۔

اشاعت وصیانت اسلام:

اہمیت کے لحاظ سے دوسرے درجے پر اشاعت اسلام کا رزولیوشن تھا، جس کے لیے ندوے کو مرکزی مقام قرار دیا گیا اور طے پا گیا کہ مستقل صورت میں کام شروع کر دیا جائے۔

اشاعت اسلام ندوے کے مقاصد میں ابتدا سے شامل ہے، لیکن ندوے نے اس وقت تک اس راہ میں آنے کے لیے قدم نہیں اٹھایا۔ اس پر بعض کو حیرت ہوئی، بعضوں نے طعنہ دیا کہ جو کام سب سے زیادہ مقدم تھا اس کے لیے ندوہ مستعد نہ ہو سکا، لیکن ان ظاہر بینوں کو اصل حقیقت کی خبر نہ تھی۔ ندوے نے تقریباً اسی زمانے میں، جب وہ عالم وجود میں آیا، یہ ضرورت محسوس کی لیکن اس نے دیکھا کہ جن آلات کے بغیر یہ مشین تیار نہیں ہو سکتی، وہ یکسر مفقود ہیں۔ اس وقت تک اسلام کی جمعیت کو صدمہ پہنچانے والا دو قسم کا گروہ ہے۔ بڑی جماعت تو ان مسلم اور دیہاتی قوموں کی ہے جس کی تبدیل مذہب میں مذہبی اور علمی سطوت کو کوئی دخل نہیں۔ اس کو اسلام پر قائم رکھنے کے لیے مذہب کے فلسفیانہ اسرار اور علمی استدلال کے فضائل بیکار ہیں۔ چند خاص اسباب ہیں جو ان کو اسلام سے برداشتہ خاطر کر دیتے ہیں اور چالاک حریف وقت پر پہنچ کر فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ان کے لیے صرف ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہے جو محاسن اخلاق سے معمور ہو، جس کے دل میں مذہب کا سچا درد اور اسلامی محبت کی ٹیس ہو، اپنے ابنائے ملت کو جو صدیوں سے ہمارے گھر کی رونق تھے، اپنے سے ٹوٹتا ہوا دیکھ کر سراپا کرب اور بے چینی ہو جائے، مذہب کے نام سے تجارت کرنا نہ چاہے، بلکہ اپنی آرام و راحت اور دنیوی امیدوں کو مذہب کی تجارت گاہ میں فروخت پر آمادہ ہو؟ ایثار اور انسانی ہمدردی کا مرثیہ خواں ہی نہ ہو بلکہ ان اعلیٰ ترین اوصاف کا بہترین نمونہ ہو جن سے اسلام کی تصویر متشکل ہوتی ہے۔ ان محاسن کے اشخاص قریہ بقریہ شہر بشہر دورہ کریں، جس جگہ ضرورت دیکھیں وہاں اپنی سیدھی سادی تعلیم اور اپنے اخلاق کے نمونے کے ساتھ عرصے تک مقیم رہ کر سیلاب ارتداد کا سدباب کریں۔ لیکن ندوے کو صاف نظر آیا کہ برسوں سے ہمارے بازار میں اس متاع سے بڑھ کر اور کوئی شے نایاب نہیں!

یہ تو وہ گروہ تھا جس کی اصلاح کے لیے علم سے زیادہ کیریکٹر کی ضرورت ہے، مگر دوسرا خطرناک گروہ وہ ہے جو علم اور عقل کے اسلحے سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوتا ہے اور جدید تعلیم یافتہ

متکلمین، آریا سماج، مسیحی مشنری اور جامع لفظوں میں یہ کہ جدید مادیت سے ہر متاثر تحریک اور فرقہ اس میں داخل ہے۔ یہی جماعت موجودہ زمانے میں مذہب اسلام کی اصلی حریف ہے اور اسی کی شورش انگیزیاں ہیں جس نے تمام مذہبوں میں بے چینی اور اضطراب پیدا کر دیا ہے۔

ان جماعتوں کے لیے ہم کو علما کی ضرورت ہے۔ مگر ندوے نے جب تمام ملک پر تلاش کی نظر ڈالی تو ہر طرف سناٹا تھا۔ ان کے لیے ایسے علما مطلوب تھے جو مذہبی علوم میں مجتہدانہ رسوخ رکھتے ہوں، وسیع النظر اور دقیقہ سنج ہوں، علوم جدیدہ سے پورے طور پر واقف ہوں، معترضین اور متکلمین کی زبان میں بول سکتے ہوں، اسلام کے عقیدہ اور احکام کی صحیح تعبیر کر سکتے ہوں، مخالفین کے کتب اور اصولوں پر انھیں پورا عبور حاصل ہو، لیکن زمانہ جانتا ہے کہ آج یہی اوصاف ہیں جن سے بڑھ کر اور کسی چیز کا قحط نہیں۔

ندوہ اگر اس قوم کو صرف خوش کرنا چاہتا، جس کی خوشی سے زیادہ کوئی شے ارزاں نہیں، تو بہت آسان تھا کہ چند واعظوں اور مولود خوانوں کو سفر میں رکھ کے تمام ملک کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا، مگر اس کے ایمان نے گوارا نہیں کیا کہ ضمیر کو ذبح کر کے اس کے خون کے چھاپوں سے دیوار کو خوشنما بنائے۔ اس کو صاف نظر آیا کہ قوم کی ترقی اور اصلاح کے ہر کام میں اصلی رکاوٹ یہ ہے کہ ہم میں علما نہیں۔ اس لیے تمام کوششوں کو ایک دار العلوم کے لیے صرف کرنا چاہیے، جس سے ضروریاتِ حالیہ کے مطابق علما پیدا ہو سکیں۔ پس گو ندوے نے ان مجبوریوں میں گھر کر اشاعت اسلام کے لیے براہ راست سعی نہیں کی، لیکن در اصل وہ جو کچھ کر رہا تھا وہ اسلام کی اشاعت اور حفاظت کا اصلی اور حقیقی سامان تھا۔

لیکن حالت نازک تھی اور اب نازک تر ہو رہی ہے۔ دار العلوم کے نتائج کا کب تک خاموشی کے ساتھ انتظار کیا جاتا؟ قوم کا یہ حال ہے کہ وہ کام کی جگہ صرف صدائے کار کی مشتاق ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں جو بے اثر انجمنیں اس غرض سے قائم ہوئی ہیں، ان پر قانع ہو جانے کے لیے تیار ہے۔ اس لیے اب ناگزیر تھا کہ ندوہ نہایت وسیع پیمانے پر اس کام کو شروع کر دے اور ایک مرکز قائم کر کے تمام ملک کی مستعدی اور آمادگی سے باقاعدہ اور نتیجہ آور صورت میں فائدہ اُٹھائے۔ دار العلوم کی گذشتہ دہ سالہ تعلیم نے جو معدودے چند اشخاص پیدا کر دیے ہیں اور جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جائے گا، ان سے بھی سر دست ایک حد تک مدد ملنے کی پوری امید

ہے۔ بھاکا کی تعلیم اسی غرض سے جاری کی گئی ہے کہ مناظرے کے مشکلات کچھ نہ کچھ دور ہوں۔

ندوہ اس بارے میں جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کو زمانہ خود دیکھ لے گا، لیکن یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس کی آمادگی اس بارے میں عام ارادوں سے بالکل مختلف ہے۔ کسی بڑے شہر میں ایک انجمن کا قایم کر دینا اور چند واعظوں کو نوکر رکھ لینا اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کافی ہوتا تو ہماری ذمہ داری واقعی بہت ہلکی تھی، مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مخالفین جس پیمانے اور وسعت پر کام کر رہے ہیں، اُس کے نمونے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پس جب تک ایک مرکزی تحریک ملک کے تمام حصوں میں باقاعدہ کام نہ کرے گی، اُس وقت تک یہ مشکل حل نہیں ہو سکتی۔

انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ:

اشاعت اسلام کے سلسلے میں آج برسوں سے ایک اہم سوال قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کا ہے۔ جو قوم ایک عالمگیر مذہب کے داعی ہونے کی مدعی ہو اور تبلیغ ہدایت کا اپنے آپ کو ذمے دار سمجھتی ہو، اس کی کم ہمتیوں پر دنیا کو ہنسنے کا حق حاصل ہے۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ چھ کروڑ مسلمانوں کی تعداد جو کبھی امریکہ پر حملہ آور ہونا چاہے اور کبھی میکاڈو کے مسلمان ہونے کا خواب دیکھے، آج تک اُس زبان میں اپنی کتاب کا ترجمہ بھی نہ کر سکی، جس کے کئی کروڑ بولنے والے برسوں سے صدائے حق کے منتظر ہوں۔

برسوں سے اس ضرورت کو کون محسوس نہیں کرتا، لیکن آج تک کسی کو قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ چوں کہ راہ پُر خطر اور مشکلات سے پُر تھی، لیکن گذشتہ اجلاس کے کارہائے عظیمہ میں یہ تجویز بھی داخل ہے کہ ندوے نے اپنی نگرانی میں اس خدمت کو انجام دینے کا ارادہ کر لیا اور پہلی رکاوٹ جو مانع کار تھی وہ ایک دردمند اور فیاض طبع کی ہمت سے دور ہو گئی۔ دوسرے دن کے آخری اجلاس میں جب شیخ عبدالقادر صاحب نے یہ تحریک پیش کی تو کرنیل اسماعیل خان صاحب سابق سفیر دولت افغانستان نے اعلان کیا کہ اس ترجمہ کی ترتیب اور اشاعت کے لیے جتنی رقم مطلوب ہو میں اپنی جیب خاص سے پیش کروں گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کام انتہاے درجہ کی مشکلات سے کسی طرح الگ نہیں کیا جا سکتا، لیکن مشکلات سے مرعوب ہونے کی جگہ اُن پر غالب آنے کی کوشش کرنی چاہیے اور امید ہے کہ

ندوہ کی ہمت مشکلات راہ پر غالب رہے گی۔

تین اور اہم تجویزیں:

اس کے علاوہ تین تجویزیں اور منظور ہوئیں جن کی اہمیت کسی طرح نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔

۱۔ انگریزی مدارس اور عام انگریزی لٹریچر کی تصنیفات میں عموماً تاریخ اسلام کی نسبت بے اصل اور بے سروپا واقعات درج کیے گئے ہیں، ان کی تصحیح اور حسب ضرورت تغلیط کے لیے ندوے کو ایک خاص صیغہ قائم کرنا چاہیے۔

۲۔ مشرقی علوم اور علی الخصوص علوم اسلامیہ کا ایک عظیم الشان پبلک کتب خانہ قائم کرنا چاہیے۔

۳۔ انگریزی مدارس کے طلبا کے لیے ندوے کو ایک مذہبی کورس بنانا چاہیے، جس سے طلبا میں اسلامی اخلاق و آداب اور مذہبی رسوخ و استحکام پیدا ہو۔

ان میں سے ہر تجویز بجائے خود اہم اور وقیع ہے۔ یورپین مصنفین کا قلم جب کبھی ہماری تاریخ اور ہمارے اخلاق و تمدن کی تصویر کھینچنا چاہتا ہے تو قدرتی طور پر غلط بیانی، پُر فریب تدلیس اور تعصب کی پیدا کی ہوئی غلطیوں کے مختلف رنگ اس کے سامنے ہوتے ہیں اور انھیں سے اس تصویر میں رنگ و روغن بھرا جاتا ہے۔ ہم اپنے گھر میں پرائیویٹ تعلیم حاصل کر رہے ہوں، اسکول اور کالج میں درس لے رہے ہوں، کسی پبلک دارالمطالعے میں کتب بینی کر رہے ہوں، مقصد یہ ہے کہ خواہ کہیں ہوں ہمارے سامنے ایسی ہی تصویریں رکھی جاتی ہیں اور ہمارا تصور ہمیشہ کے لیے ان کا عکس محفوظ کر لیتا ہے۔ آج ملکی اور قومی ترقی کی سیکڑوں مشکلات ہیں جن کی تحلیل کیجیے تو آخر میں وہی اثر رہ جائے گا جو ان تصویروں کے مطالعے سے پیدا کیا گیا ہے۔ قومی تاریخ سے بڑھ کر قومی زندگی کا کوئی ذریعہ نہیں، لیکن ہندوستان میں تاریخ کی تعلیم ہی ایک ایسی شے ہے جو قومی تاریخ سے نفرت، حقارت اور باہمی بغض و عداوت کے جذبات منتقل کرتی ہے۔ بعض یونیورسٹیوں کے کورس کی نسبت کبھی کبھی کانفرنسوں اور اخباروں نے شکایت کی۔ لیکن اب تک اس کا کوئی باقاعدہ صیغہ نہ تھا۔ ندوے نے اب ایک مستقل دفتر اس کے لیے الگ کر دیا ہے اور اگر باقاعدہ کام ہوتا رہا

تو آیندہ تعلیم یافتہ نسلوں کی نسبت ہر طرح کی خوش آیند امیدیں پیدا کی جا سکیں گی۔

کتب خانے کا مسئلہ عرصے سے ندوے کے سامنے ہے لیکن اس کی اہمیت متقاضی ہے کہ تمام قوم کے سامنے ہو۔ مولانا سیّد سلیمان صاحب تعلیم یافتۂ ندوہ نے اس پر ایک مبسوط لیکچر دیا تھا۔ اس کے مطالعے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ندوے کا اس بارے میں مقصد اصلی کیا ہے؟

آخری جلسے میں مولوی محمد دین صاحب ڈایریکٹر تعلیمات بہاول پور نے تیسرا رزولیوشن پیش کیا۔ برسوں سے اس مسئلے کے مختلف عنوانوں پر بحث کی جا رہی ہے، مگر اب تک ضرورتوں کا کوئی علاج نہیں ہوا۔ اس ناکامی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ جو لوگ اس قسم کے کاموں کو اپنے دایرے میں لینا چاہتے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی حیثیت اور اہلیت کیا ہے؟

تجویزوں کے لحاظ سے ایک بڑی خصوصیت:

ہم شاید کہیں لکھ آئے ہیں کہ تجویزیں تمہید عمل تھیں، لیکن آج کل کے کارفرما طبقے نے انھیں کو اصل عمل سمجھ لیا ہے۔ اس لیے یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ تجویزوں کے لحاظ سے گذشتہ اجلاس کی نمایاں خصوصیات کیا کیا تھیں؟

۱۔ مقدم ترین کام یہ ہے کہ قوم کی تمام ضروریات پر اس حیثیت سے نظر ڈالی جائے کہ مقدم اور اشد ضرورتیں کیا کیا ہیں؟ ندوے میں جتنی تجویزیں پیش کی گئیں، ان میں سے ہر ایک تجویز ان ضروریات پر مبنی ہے جن کے بغیر قومیت برباد ہو رہی ہے اور مذہب کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔

۲۔ ہر مجلس کو اپنے مقاصد اور اعمال کے لیے ایک دایرہ کھینچ دینا چاہیے، جس میں محدود رہ کر معروف کارگذاری ہو، تاکہ تقسیم عمل کے اصول کے مطابق ہر جماعت مخصوص کاموں کو اپنے ذمے لے لے۔ ہمہ گیری کی خواہش ہو جائے گی تو ایک کام بھی خوش اسلوبی سے نہ ہوگا۔ یہ کہنا ہمارے لیے نہایت دل شکن ہے کہ آج کل کی بعض مجالس اپنے لیے دایرے بنا بنا کر توڑتی رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ تمام دنیا کو اپنے اندر لے لیں۔ ندوے کا ابتدا سے مقصد ایک ہی ہے، یعنی مذہبی و علمی تعلیم اور مذہبی و علمی ضروریات کا انتظام۔ اس بنا پر گذشتہ اجلاس میں جس قدر تجویزیں پیش ہوئیں وہ اس کے قرار دادہ دایرے سے باہر نہ تھیں۔

۳۔ تجویزوں میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ پائے عمل کے لیے حلقۂ زنجیر ہو جاتی ہیں

اور رہبرانِ قوم جب تجویزیں پاس کرا کے مصروفِ خوابِ نوشیں ہوتے ہیں تو دوسرے سال تک کروٹ نہیں لیتے، لیکن گذشتہ اجلاس میں ہر تجویز اس وقت پیش کی گئی جب غور و فکر کے بعد اطمینان کر لیا گیا کہ ان پر عمل کرنے کے لیے ندوہ پورے طور پر تیار اور آمادہ ہے اور جلسے کے اختتام کے ساتھ ہی عملی کارروائی شروع کر دی جا سکے گی۔

عام اجمالی نظر:

غرض کہ جو کچھ ہوا امید سے زیادہ اور توقع سے بڑھ کر تھا۔ جلسے کی کامیابی کا اندازہ عموماً ملک کی توجہ، تعلیم یافتہ جماعت کی ہم دردی اور شرکا کی کثرتِ تعداد سے کیا جاتا ہے۔ ان تمام امور کے لحاظ سے بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ جلسہ بہتر سے بہتر کامیابی کی مثال تھا۔ تعلیم یافتہ جماعت ہر طرف سے بکثرت آئی۔ علی الخصوص پنجاب جو قومی جدوجہد کی ہر دوڑ میں اوروں سے پیش رو ہے، ندوے سے اظہارِ شغف میں بھی پیش رو رہا۔ ہز ہائنس نواب صاحب رام پور اور ہز ہائنس سر آغا خان گو شریک نہ تھے مگر ان کی ہمدردی کے تار اور خطوط شرکت سے زیادہ موثر تھے۔ پھر کارروائی جتنی کچھ ہوئی ہماری مدت کی الجھی ہوئی مشکلوں کا حل تھی۔ دراصل قوم کی شاہراہِ مقصود اب پورے طور پر درست ہو گئی ہے اور لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔ (الطلاق:۱)

حاذق الملک:

لیکن یہ تحریر بالکل ناقص رہ جائے گی اگر ارباب دہلی کا مکرر شکریہ ادا نہ کریں، جن حضرات سے لوکل کمیٹی عبارت ہے، ہم کو یقین ہے کہ ان میں سے ہر شخص اس کامیابی کے لیے مستحق شکریہ ہے۔ ندوے کی رپورٹ سے ان کے اسمائے گرامی معلوم ہوں گے، لیکن ہم یہاں چند خاص بزرگوں کا ذکر کیے بغیر قلم روک نہیں سکتے۔ ندوے کو اس مرتبہ جو یادگار کامیابی حاصل ہوئی، اس کے اولین باعث حاذق الملک حکیم اجمل خان صاحب ہیں۔ ان کے اوصاف و محامد کی نسبت ہم بغیر کسی تفصیل کے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کیوں کہ بہت کچھ کہنے کے بعد بھی یہی کہہ کر خاموش ہونا ہے کہ:

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے!

ہم میں آج اوصاف سے بڑھ کر اور کوئی شے عنقا نہیں، لیکن حکیم صاحب کی ایک ذات بیسیوں اوصاف کا مجموعہ ہے اور ان اوصاف گراں مایہ نے ان کو اثر اور اقتدار کے ساتھ بجا طور پر تمام ملک میں سربلند کر دیا ہے۔ پس اگر ہم ایسا یقین کریں تو اس یقین کے لیے مجبور ہیں کہ ملک و قوم کی خدمت کے لیے ان سے بڑھ کر کوئی شخص مفید اور تیار نہیں۔ ان کی تھوڑی سی توجہ وہ اہم نتائج پیدا کر سکتی ہے، جن کی شکل برسوں کی جد و جہد اور نالہ و فریاد کے بعد بھی ہمیں نظر نہیں آ سکتی، لیکن افسوس ہے کہ وہ جس مسند پر بیٹھے ہیں اس کی ضرورتیں دامن گیر ہیں۔ وہ باوجود اس مسند کے فرائض کے جس قدر قومی خدمتیں انجام دے رہے ہیں وہ بھی من جملہ ان اعجوبہ زا واقعات کے ہے، جن کے نمونے صرف انھیں کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ تاہم قوم کی حالت قابل رحم ہے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ ایسے اشخاص موجودہ دور تنزل میں موجود ہوں اور اس کو اپنا زیادہ وقت نہ دے سکیں۔ ہم تو یہاں تک تیار ہیں کہ اگر قوم کے سو دو سو مریض ان کی مسیحائی سے محروم رہ کر رہگرائے عالم عدم ہوں تو ہمیں شکایت نہیں، بشرطے کہ پوری قوم جو امراض گوناگوں میں مبتلا ہے، ان کے دست شفا بخش کو اپنی طرف متوجہ پائے۔

قوم حکیم صاحب سے کچھ کہنا چاہتی ہے، بشرطے کہ وہ اس کی طرف پورے طور پر متوجہ ہوں:

تو بدیں خوبی و من عاشق و تنہا ز تو دور
خود تو انصاف بدہ زیستن امکان دارد؟

مولوی عبدالاحد صاحب مالک مجتبائی پریس، نواب فیض احمد صاحب خان بہادر، مولوی عبدالحامد صاحب، مولوی عبدالسلام صاحب اور حافظ عبدالغفار صاحب اسی طرح تمام قوم کی شکر گزاری کے مستحق ہیں کہ جب تک جلسہ رہا یہ تمام حضرات محنت و جاں فشانی کی مجسم تصویر تھے۔ علی الخصوص اول الذکر بزرگ جن کی کوششوں کو عربک اسکول جیسی خوش نما اور عالی الشان عمارت کے ملنے میں بہت بڑا دخل ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی (۱)

۱۔ الندوہ۔ لکھنؤ بابت ماہ اپریل ۱۹۱۰ء، ص ۳۱۔۲۹

بیسویں صدی کے اُردو ادبی منظر نامے پر جن لوگوں کی طلائی حرفوں میں کندہ سحر کاریاں جگمگا رہی ہیں اور ہمیشہ ضیا بار رہیں گی، ان میں ایک ناقابلِ فراموش اور حافظہ گیر نام مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء - ۱۹۵۸ء) کا ہے۔ آزاد ایسی بے مثل شخصیت تھے جن پر بہ سہولت ''نابغۂ روزگار'' کی ترکیب کا اطلاق ہوتا ہے۔ اُردو میں کم شخصیتیں ہوں گی جن پر جامعیت کا حرف صادق آتا ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام، تاریخ، جدید و قدیم فلسفہ، علوم عمرانی، موسیقی، شعر و ادب سب پر ایسی عالمانہ اور مجتہدانہ نظر تھی کہ اس باب میں برعظیم کے گنے چنے لوگ ہی ان کے حریف ہو سکتے ہیں۔

پیشِ نظر کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے ان مضامین و مقالات اور شذرات پر مشتمل ہے جو اپنے زمانے کے نہایت پُرارزش علمی مجلّہ ''الندوہ'' میں شائع ہوتے رہے۔ آزاد نے شبلی سے اپنی غیر معمولی عقیدت اور مؤخر الذکر کے اصرار کے پیشِ نظر اکتوبر ۱۹۰۵ء میں الندوہ کے معاون مدیر کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی اور قریباً چھ سات ماہ تک اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ادارت سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کے بعض مقالے الندوہ کی زینت بنتے رہے۔

ڈاکٹر شاہ جہان پوری کی اس تدوین کردہ کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف آزاد کے مقالات کی جمع آوری نہیں، ان میں موجود مباحث اور توضیح طلب مقامات کا ایک عمدہ اور ناقدانہ اشاریہ بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آزاد و ابوسلمان کے مضامین کا یہ ملا جلا مجموعہ کئی حوالوں سے شبلیات و آزادیات کے باب میں بعض نئی معلومات کا نقیب کہلانے کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری لائقِ تبریک ہیں کہ ان کی مساعی سے آزاد کے افادات کم و بیش سو برس بعد کتاب کی صورت میں ظہور کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی

Rs. 275/-

ISBN-13: 978-969-8917-42-5
ISBN-10: 969-8917-42-X

www.poorab.com.pk